



المنهاج الواضح

يعني

راہ سنت

تأليف

محدث اعظم وامام اہل سنت و حامل علوم نبویہ

حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر

مکتبہ صفدریہ

نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گجرانوالہ

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (قرآن حکیم)
 اور جو چیز تم کو رسول دے اُس کو لو اور جس چیز سے منع کرے اُس سے باز آ جاؤ!
 مَنْ أَحَدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (متفق علیہ)
 جس نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی چیز گھڑی، تو وہ مردود ہوگی!
 (لَكِن لَّيْسَ بِشَرِّهِمْ شَرُّهُ وَمِنْهُمَا جَاءَ (قرآن حکیم)

لَا مَنَاجَا لَإِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ

راہِ سُنَّتِ

جس میں بڑی تحقیق اور عرق ریزی سے اہل السُنَّتِ والجماعت کے دلائل کا معیار اور بدعت لغوی اور شرعی کا مضموم اور حکم،
 قرآن کریم، صحیح احادیث اور صد احادیث سے واضح کیا گیا ہے اور تمام مشہور بدعات (مثلاً میلاد، عرس، بقبول پر چراغاں کرنا،
 قبروں کو کچھ بنانا، قبر پر اذان کہنا، نماز جنازہ کے بعد ٹھکانا، تہجد، ساتواں، دسواں، پالیسواں، چھتیسواں، دوسواں، قرآن وغیرہ)
 پر فردا فردا مفصل بحث کی گئی ہے، اور فرق مخالف کو مستطاد اور سکت جوابات دیئے گئے ہیں اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اکابر
 علماء دیوبند بکے معنی اور سستی مسلمان ہیں، ان کو دینی وغیرہ کہنا سراسر بہتان، خاص افتراء اور منہ مجھوت ہے!

مؤلفاً

ابوالزہد محمد سرفراز خان صفدر (فاضل دیوبند)

خطیب جامع مسجد گھر نیش احمدیٹ صدر مدرس مدرسۃ العلوم، گوجرانوالہ

ناشر: مکتبہ صفدریہ نزد مدرسۃ العلوم نزد گنڈہ گھر گوجرانوالہ

﴿جملہ حقوق بحق مکتبہ صفدریہ نزدکھنہ گمر گوجرانوالہ محفوظ ہیں﴾

طبع ۵۸ مارچ ۲۰۱۱ء

۳۹

نام کتاب المنہاج الواضح (یعنی راہ سنت)
مصنف امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدری
مطبع مکی مدنی پرنٹرز لاہور
تعداد بارہ سو پچاس (۱۲۵۰)
قیمت ۲۲۰/- (دو سو بیس روپے)
ناشر مکتبہ صفدریہ نزدکھنہ گمر گوجرانوالہ

﴿ملنے کے پتے﴾

☆ کتب خانہ صفدریہ، حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

☆ ادارہ الانور بخوری ٹاؤن کراچی	☆ کتب خانہ مظہری گلشن اقبال کراچی
☆ مکتبہ امدادیہ بی بی ہسپتال روڈ ملتان	☆ مکتبہ حقانیہ ملتان
☆ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور	☆ مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
☆ مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور	☆ مکتبہ الحسن اردو بازار لاہور
☆ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی	☆ کتب خانہ مجیدیہ یو ہڑیٹ ملتان
☆ مکتبہ صفدریہ چو ہڑچوک راولپنڈی	☆ مکتبہ حلیمیہ درہ پیزو کی مروت
☆ مکتبہ سلطان عالمگیر اردو بازار لاہور	☆ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور
☆ اسلامی کتب خانہ اڈا گامی ایبٹ آباد	☆ مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
☆ مکتبہ عثمانیہ میانوالی روڈ تلہ گنگ	☆ مکتبہ الاظمہ یا نو بازار رحیم یار خان
☆ اقبال بک سنٹرز دھواں مسجد صدر کراچی	☆ مکتبہ فاروقیہ ہزارہ روڈ حسن ابدال
☆ مکتبہ علمیہ جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک	☆ مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک
☆ مکتبہ رحمانیہ قصہ خوانی پشاور	☆ مکتبہ العارفی فیصل آباد
☆ مکتبہ فاروقیہ خفیہ اردو بازار گوجرانوالہ	☆ والی کتاب گمر اردو بازار گوجرانوالہ
☆ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ	☆ ظفر اسلامی کتب خانہ جی ٹی روڈ لکھنؤ

تصدیقات اکابرین علماء دارالعلوم دیوبند

ضلع سہارن پور - ہند

① فخر الامثال حضرت لانا الحاج القاری محمد طیب صاحب امت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى آتَاكَدُ : اسلام جامع اور کامل دین ہے
نہ اس میں زیادتی کی گنجائش ہے نہ کمی کی۔ اس کے کامل ہونے کی شہادت تو قرآن کریم نے اَلْيَوْمَ اكْمَلْتُ
لَكُمْ دِينَكُمْ سے دی ہے اور جامع ہونے کا ثبوت تَبَيَّنَا لَكُمْ شَيْءٌ سے پیش فرمایا ہے، جس سے
اس دین کا جامع و کامل ہونا شہادتِ خداوندی سے ثابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دین مجموعہ علم و عمل
کا نام ہے تو دین کے جامع و کامل ہونے کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہو سکتے کہ اس کا علم بھی جامع و
کامل ہے اور عمل بھی جامع و کامل ہے۔ اس کمال اور جامعیت کی تخصیص علم محض یا عمل محض سے نہیں کی
جاسکتی۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ قانون تو کامل ہو اور اس سے پیدا شدہ عمل ناقص اور نامکمل یا برعکس۔ پس
ایک تکمیل دوسرے کی تکمیل کو طبعاً متقاضی ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ دین کے علم کا اساسی سرچشمہ قرآن مجسم
ہے جس کا بیان حدیث ہے : فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ (الحديث)۔ اور
عمل کا سرچشمہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی حامل ذاتِ باریکات نبوی ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (القرآن) بلاشبہ تمہارے لئے رسول اللہ میں نمونہ عمل موجود ہے۔

اور یہ دونوں باہم مطابق اور ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق بھی ہیں چنانچہ حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہا سے جب حضور کے اخلاق کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ :

وَكَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ - اور آپ کا اخلاق قرآن ہے۔

اور ظاہر ہے کہ خُلُقِ عمل ہی کی قوت کا نام ہے۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ کتاب و سنت میں اس دین کے تمام علمی پہلو جمع ہیں اور ذاتِ نبوی میں اس کے تمام عملی پہلو مجتمع ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے پر پورے پورے منطبق۔ پس جو چیزیں قرآن میں علمی شکل میں ہیں وہی چیزیں ذاتِ نبوی میں عمل کی صورت میں ہیں اور جن باتوں کو قرآن اصول و اقوال کی شکل میں پیش کرتا ہے انہی باتوں کو ذاتِ باریکاتِ نبوی احوال و اعمال کی شکل میں نمایاں کرتی ہے۔ پس قرآن کا کہا ہوا آپ کا کیا ہوا ہے، اور آپ کا کیا ہوا قرآن کا کہا ہوا ہے۔ اور یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے پر اس شان سے منطبق ہیں کہ نہ عملِ نبوی قرآن سے سرِ مو مخرف ہے اور نہ علمِ قرآنی عملِ نبوی سے ذرہ برابر متجاوز ہے۔ ورنہ خُلُقُ الْقُرْآن کے کوئی معنی باقی نہیں رہ سکتے۔ اس کمالِ مطابقت کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر قرآن کا علم اور قانون جامع اور کامل ہے جس سے کوئی ہدایت چھوٹی ہوئی نہیں ہے تو نبوت کا عملی اسوہ حسنہ بھی یقیناً جامع اور کامل ہے جس سے دین کا کوئی عملی نمونہ رہا ہوا نہیں ہے۔ نیز اگر قرآن اور اس کے لئے ہوئے قانون میں کسی ادنیٰ کی زیادتی کی گنجائش نہیں ہے تو عملی اسوہِ نبوی میں بھی کسی اضافہ و بیشی کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ورنہ وہ تطبیق و مطابقت باقی نہیں رہ سکتی جس کا دعویٰ قرآن پاک اور حرمِ پاکِ نبوی صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جس طرح قرآن کے بعد نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے کسی جدید نمونہ علم کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی نئی کتاب یا نوشتہ کی صورت میں نازل ہو، ایسے ہی نبوت کے اسوہ حسنہ کے بعد کسی نئے نمونہ عمل کی ضرورت نہیں ہو سکتی کہ اُسے لے کر کوئی مبعوث ہو یا اختراع کر کے عمل کا کوئی نیا ڈھنگ اور نیا روپ خود سے دین میں نکالے کیونکہ اگر اس دین کے علم یا عمل میں کمی بیشی کی گنجائش ہو تو یہ دین، دینِ کامل و جامع نہیں کہلایا جاسکتا، حالانکہ قرآن و حدیث اس کے کامل اور جامع ہونے کے پٹھی ہیں۔ اندر میں صورتِ اس دینِ کامل کو ماننے کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس کے علم اور عقیدہ کو بھی بلا کمی بیشی اور بغیر ادھر ادھر جھکے ہوئے یک رخی کے ساتھ مانا جائے کہ اسی کا نام اخلاص و توحید ہے۔ اور اس کے نمونہ عمل یعنی اسوہ حسنہ نبوی کو بھی بغیر رسم و رواج کی آمیزش اور ایجاد و اختراع کے یکسوئی

کے ساتھ عمل قبول کیا جائے کہ اسی کا نام اتباع سنت ہے۔ اس لئے اس دین کے کامل و جامع ہونے کی وجہ سے اس کے دو تقاضے نکلے۔ ایک اخلاص اور ایک اتباع۔ اخلاص اللہ سے عقیدہ و عمل خالص ہوتا ہے اور بعینہ وہی رہتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اتارا ہے۔ اور اتباع سے عقیدہ و عمل باصواب ہوتا ہے اور ٹھیک اُس نمونہ کے مطابق رہتا ہے جو اُس کے رسول نے کر کے دکھلایا ہے ظاہر ہے کہ یہی دو اصلیں دین کی بقا و حفاظت اور انسان کی صلاح و فلاح کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ اگر انہیں کمزوری راہ پا جائے گی تو اسی حد تک ان کی ضدیں ابھر کر دین کو فاسد بنا دیں گی۔ اگر اخلاص و توحید میں کمی آئے گی تو دین ایمان میں اُسی حد تک اُس کی ضد، شرک کی آمیزش ہو جائے گی :

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهْمٌ
مُشْرِكُونَ۔ (القرآن حکیم)۔
اور بہت سے ان میں مومن نہیں ہوتے کہ ساتھ ہی مشرک بھی بن جاتے ہیں۔

اور اگر اتباع سنت میں کمی آجائے گی تو اُسی حد تک بدعت کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔
مَا أَحْدَثَ قَوْمٌ بَدْعَةً إِلَّا رَفَعَ
مَثَلَهَا مِنَ السَّنَةِ فَمَتَسَكَ بِسَنَةٍ
خَيْرٌ مِنْ أَحْدَاثِ بَدْعَةٍ۔
کسی بھی قوم نے کوئی بدعت (دین میں) ایجاد نہیں کی کہ اُس کی مثل سنت اس قوم سے اُٹھا دی گئی ہو پس سنت کو حقارے پہنے ہی میں خیر ہے۔
(مسند احمد) نسبت نئی نئی بدعات نکالنے کے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جیسے دین کی صلاح و فلاح کی دو اصلیں ہیں، اخلاص اور اتباع، ایسے ہی دین کے فساد کی بھی دو ہی اصلیں ہیں جو ان دو کی ضدیں ہیں فساد اور بدعت پس جیسے اخلاص و اتباع کے ہوتے ہوئے دین کبھی ضائع نہیں ہو سکتا، ایسے ہی اشراک و ابتداء کے ہوتے ہوئے دین کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے علماء اہل السنۃ و الجماعت نے ہمیشہ سنت و بدعت میں امتیاز نمایاں رکھنے اور سنت کو نکھار کر بدعت سے الگ کر دکھانے میں سرگرمی دکھلائی، اور کبھی تساہل اور ہلچلکاری سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اصول سے لے کر فروع تک سنت و بدعت کو جدا جدا کر کے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ کر کے رکھ دیا ہے تاکہ دین اخلاص و اتباع کی روشنی میں اپنے اصلی روپ کے ساتھ محفوظ رہے

اور شرک و بدعت کی آمیزشوں سے اُس کا نورانی چہرہ داغ دار نہ ہونے پائے۔

ہندوستان کی ان اُنخر کی صدیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ اور ان کی نسبی اور حبشی اولاد کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اس سنت و بدعت کی تفریق اور سنت کے دائرہ سے من گھڑت رسوم و رواج کے اخراج کو آخری حد تک پہنچایا، اور ان سارے اختراعات کو جنہیں دعویدارانِ اَنَا وَجَدْنَا اَبَاءَنَا دین کے پردہ میں پیش کر رہے تھے، دین کے مستحکم دلائل سے دفع کرنے کی عظیم مہم انجام دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں یہ سچی عارفانہ رنگ سے نمایاں ہوئی، اُن کے فرزندِ جلیل حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے دور میں فلسفیانہ انداز سے سامنے آئی، اُن کے پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے دور میں مجاہدانہ روش سے کھلی، اور اُن کے بعد جب دلی کی علمی مرکزیت ختم ہو کر دیوبند کی طرف منتقل ہوئی تو بانیانِ دارالعلوم دیوبند کے ہاتھوں علم و جہاد کے روپ میں آگے بڑھی، اور آخر کار دیوبند کے فیض یافتہ فضلار کے ہاتھوں اُس نے جماعتی اور اجتماعی صورت اختیار کر کے ہندو بیرون ہند میں پورے جمادیئے۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلار متفقہ میں ملے ہوں یا متاخرین میں سے، اور پھر اُن سے مستفیدین اگلے ہوں یا پچھلے، جو ہندوستان و پاکستان، افغانستان و ترکستان، برما و انڈونیشیا، حجاز و عراق میں لکھ لکھ کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اُن کے کام کا مرکز ہی نقطہ یہی سنت و بدعت کی تفریق اور یہی دین اور غیر دین کا امتیاز واضح کرنا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند قدس سرہ (المتوفی ۱۲۹۶ھ) نے اسی سنت و بدعت کے فرق کو عقائد اور کلیاتِ دین میں نمایاں کیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۱۳ھ) نے اسی فرق کو فقہی جوہریات میں کھولا۔ حضرت تھانوی قدس سرہ (المتوفی ۱۳۱۳ھ) نے اسی فرق کو معاشر و معاملات میں نمایاں کیا۔ ابنِ شیر خدا حضرت مولانا ترمذی حسن صاحب رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۱۴ھ) نے اسی فرق کو مروجہ رسوم میں واضح کیا، اور آج اُنہی اسلافِ صالحین کے ایک خَلَفِ رشید مولانا محمد سرفراز خان صاحب صدر نے اسی فرق کو اس دور کے ان عام مختراعات و محدثات میں مثبت و منفی پہلو سے متفقانہ دلائل کی روشنی میں نہایت ہی واضح اور پاکیزہ انداز میں واشگاف کیا ہے جس کی

شاہد عدل ان کی حالیہ تصنیف "راہِ سنت" ہے۔

اس کتاب میں ممدوح نے محققانہ انداز میں سنن نبوی اور رسوم مروجہ میں ملل اور موجہ فرق دکھلاتے ہوئے بہت سے ایسے گوشے سلف کی عبارات، نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روایات اور قرآن حکیم کی آیات سے کمول دیئے ہیں جو اب تک پس پردہ تھے، جن سے اخلاص و اتباع کی روحانیت مضبوط سے مضبوط تر ہو کر سامنے آگئی ہیں اور شرک و بدعت کا حجت و برہان کی رو سے قطع ہو گیا ہے۔ مولانا نے ممدوح کا مطمح نظر کتاب زیر نظر میں ان مسائل نحو مبتدعین کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں، ان کے اصلی روپ میں پیش کرنا اور ان پر بدعات کا جو سیاہ لبادہ ڈال دیا گیا ہے، اُسے اُتار پھینکا ہے، جس میں وہ بھرا اللہ تعالیٰ کا میاب ہیں اور ان کے پیچھے حجت و برہان کی زبردست کمک موجود ہے۔ مصنف کی اور دوسری لطیف تصانیف بھی جہاں تک نظر سے گزریں، محققانہ ہنر و فن اور متین اندازِ بیان کی حامل ہیں جو سنت و بدعت اور دین و غیر دین کی تفریق کے سلسلہ میں مجادلہ و جدال کی دعوت نہیں دیتیں بلکہ شرح صدر، قوتِ یقین اور عمل میں طہانیت و قناعت کی طرف لے آتی ہیں۔ یہ اکم باشمی کتاب "راہِ سنت" بھی حقیقتاً راہِ سنت کی داعی ہے جس سے جدل کا ذوق پیدا نہیں ہوتا کہ جدل بدعت اور گمراہی کا خاصہ ہے نہ کہ سنت اور ہدایت کا۔ ارشادِ نبوی ہے :

ما ضل قوم بعد ہدیٰ کا نوا علیہ کوئی قوم بھی ہدایت کے بعد جس پر وہ تھی،
الہ او تو الجدل - (ترمذی) گمراہی پر نہیں آتی کہ اس میں جدال و نزاع کے

جائیم پیدا نہ ہو جاتے ہوں۔

چنانچہ حضورؐ کی یہ پیش گوئی اہل بدعات کے حق میں سر کی آنکھوں سے مشاہدہ میں آرہی ہے کہ وہ ات دن بدگوئی، درشت کلامی، تحریقِ مینِ المسلمین، گالمِ گلوچ، قتل و غارت گری، فساد و خون ریزی اور اشتعال انگیزی کے دبلے ہوئے پنہانی غیظ و غضب کے ساتھ ہر وقت آمادۂ فساد نظر آتے ہیں۔ گویا ان کی حجت و برہان ہی زبان کی گالی اور ہاتھوں کی دراڑ دستی ہے۔

دراز دستی اِس کوتہ استیناں میں

تلاف اہل سنت کے کہ ان کی زبانیں متین، کلام مہذب، لب و لہجہ صادق اور اندازِ حلم و انانہ کا ہے۔
 تہ انیف و تقاریر میں کسی غیظ و غضب کا اظہار نہیں کسی بھی موقع پر وہ جذباتی رنگ میں اشتعال انگیزی
 کر کے تفریقیں ڈالتے نہیں پھرتے، کیونکہ ان کی حجت و بُرائی کتاب و سنت ہے جس کی روشنی میں وہ
 مدعا کا اثبات کرتے ہیں اور مدعا بھی خود اپنا نہیں رکھتے، وہ مدعا بھی اللہ و رسول کا ہوتا ہے جسے وہ
 نقل کر کے اُس کے دلائل سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اس عمل میں ظاہر ہے کہ بد تہذیبی اور ناشائستگی کی قدرتا
 گنجائش ہی نہیں ہو سکتی اور نہ ہی ان خرافات کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ کیونکہ یہ امور از قسم جہالت
 ہیں اور دعوائے حق اور دلائلِ صادقہ از قسم علم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ علم جہالتوں کی مدد سے آگے نہیں بڑھ سکتا
 اور نہ ان کا دستِ نگر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ رسالہ زیرِ نظر راہِ سنت کا اندازِ بیان، لب و لہجہ اور طریقِ استدلال
 بھی انہی متفقانہ اوصاف کا حامل ہے کیونکہ وہ سنتوں کی دعوت دے رہا ہے جن کے لئے علم و تہذیب کفایت
 کرتے ہیں نہ کہ بدعات و خرافات کی جن کے لئے جہالت اور جاہلانہ اندازِ ناگزیر ہے۔ اس متین اندازِ اعلیٰ
 رنگ کی تحقیقات سے کوئی شبہ نہیں کہ مصنفِ ممدوح نے نہ صرف مسائل کا اثبات ہی کر دیا ہے بلکہ خصوم پر
 حجت بھی قائم کر دی ہے۔ لِيَهْلِكَ مَوْءَهُ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ
 رہا تعصب و عناد، سواس کا معا لہ کسی کے پاس نہیں۔ اُس کا تیر بہدف علاج یا آخرت کی قیامت
 ہے۔ يَا دُنْيَا كِي قِيَامَتٍ - وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ -
 حق تعالیٰ مصنفِ ممدوح کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کی اس سعی
 جمیل کو قبول فرمائیں اور طالبینِ حق کو ان کی مساعی سے مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِي
 مَنْ اٰهَبَتْ وَلٰكِنْ اللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ -

و بِاللّٰهِ التَّوْفِیْق

محمد طیب غفرلہ - مدیر دارالعلوم دیوبند

۲۹ رجب ۱۴۳۷ھ یوم الاربعاء

② حضرت مولانا السید مہدی حسن صاحب دامت فیوہم

صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ۔ میں نے "المنہاج الواضح" یعنی "راہِ سُنّت" مولفہ محترم مولانا ابوالزادہ محمد سرفراز خان صاحب مفسر احوال اللہ بقادر کو پڑھا۔ زبان شستہ و صاف، ہمدل آویز، بحال و نگاہ منظرانہ سے دُور اور مضامین کی جامع کتاب ہے۔ بدعات کے سلسلہ کی اپنے رنگ کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں بدعات کا ردّیہ اسلوب سے کیا گیا ہے اور اعتبارِ سُنّت کو بطریق احسن ثابت کیا گیا ہے۔ یہ دوسری کتاب مولانا سے موصوف کی میری نظرت گزری ہے جس میں آیات و احادیث اور محقق علماء کے اقوال مذکور ہیں، اور ہر امر مدلل ہے۔ ہر ایک عامی و خاص کیلئے مفید ہے۔ اس کے مطالعہ سے بدعتِ سُنّت کی عینیت نمایاں طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اہل اہوا کے لئے بھی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس تالیف کو مقبول خاص عام بنائے اور مولف مذکور کو جزائے خیر عطا کرے اور اس سے زیادہ بہت و توفیق بخشے کہ گرم کردہ راہوں کی راہبری کئے رہیں اور مخلوق اُن کے فیض سے مستفید ہوتی رہے۔ آمین !

سید مہدی حسن، صدر مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۱۲/۱۳۸۷ھ

③ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست پنجاب، بلوچستان، شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

راہِ سُنّت کو میں نے مطالعہ کیا جو مولانا ابوالزادہ محمد سرفراز خان صاحب نے ردّ بدعات میں لکھی ہے اور محض فہر کی اکثر بدعات کی متفقانہ تردید اس میں موجود ہے۔ مہتممین کے اعتراضات اور دلائل کے جوابات نہایت عالمانہ اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں۔ بدعتِ شرعیہ کے حدود کو اس طرح متعین کرنا کہ اُمورِ استظامیہ تعلیمیہ (مثلاً قیامِ مدارس و منیہ امتحانِ نصابِ تعلیم، تدوینِ قواعدِ عربیہ، طباعت و اشاعتِ علومِ اسلامیہ) اشغالِ صوفیہ اور مذاہباتِ متبذوہ ان سے خارج ہوں۔ اور عقائد و اسرارِ محمدیہ اور قربات و اعمالِ مختلفہ متعلقہ بالاموات وغیرہ ان میں داخل ہوں، ایک علمی اور دقیق بحث ہے جس میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف موصوف نے اس اہم موضوع کو ایک نئی جہت سے سر کر لیا ہے اور اس عظیم بحث کو نہایت فحشی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر دیا ہے۔ میرے خیال میں مصنف دامت فضلہ کی تمام تصانیف اگرچہ بجائے خود بہت مفید ہیں، لیکن یہ کتاب دیگر تصانیف کی نسبت عوام و خواص دونوں کے لئے بے حد نافع ہے۔

احقر اپنے حلقہ کے علماء کرام و طلبہ کو مشورہ دیتا ہے کہ اس کتاب کی طرف توجہ فرمائیں۔ فقط والسلام

شمس الحق عفا اللہ عنہ۔ ترنگ زئی پشاور

نمبر شمار	مضمون	نمبر شمار	مضمون	نمبر شمار
۱	عرض حال	۵	۱۷	اس پر پہلا اعتراض اور اس کا جواب
۲	باب اول شرعی دلائل کے بیان میں	۱۱	۱۸	" " " "
۳	قرآن کریم امیری قانون کامل ضابطہ حیات اور مکمل دستور العمل ہے۔	۱۱	۱۹	" " " "
۴	قانون سازی کا منصب کس کو حاصل ہے اور اس کے لوازمات۔	۱۱	۲۰	" " " "
۵	قانون خداوندی کا بالذات نافذ کرنے والا انسان ہے۔	۱۱	۲۱	فائدہ
۶	کتاب اللہ کی ہر گیر صداقت اور اسلام کا مکمل جزا اہل اسلام کی نگاہ میں۔	۱۲	۲۲	اسلامی فقہ اور قیاس بھی شرعی حجت ہے۔
۷	قرآن کی حیثیت اور دین اسلام کی عظمت و نفوذ کی نگاہ میں۔	۱۲	۲۳	عباد اور زباد کے قیاس کا مقام۔
۸	وحی غیر متلو اور حدیث شریف۔	۱۳	۲۴	قیاس برعت نہیں ہے۔
۹	سنت کا مقام۔	۱۳	۲۵	قیاس کے متعلق ایک مفیس بحث۔
۱۰	حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پاک تعلیم کی تفسیریں کی نگاہ میں۔	۱۵	۲۶	باب دوم برعت کی لغوی اور شرعی تعریف (اقسام اور احکام)۔
۱۱	اجماع و اتفاق شرعی حجت ہے۔	۱۵	۲۷	برعت کی تردید احادیث سے۔
۱۲	نفساء راشدین کی خلافت اور ان کی سنت۔	۱۸	۲۸	فی امرنا هذا کی تشریح۔
۱۳	ایک غلطی اور اس کا ازالہ۔	۲۲	۲۹	علامہ دیوبند کے نزدیک برعت کی تفسیر۔
۱۴	صحابہ کرامؓ بھی صحیح ہیں اور اجماع حجت ہے۔	۲۲	۳۰	علامہ بریلوی اور برعت کی تعریف۔
۱۵	اجماع امت۔	۲۶	۳۱	ائمہ نفلت کے نزدیک برعت کی تعریف۔
۱۶	خیر القرون کا تعامل بھی حجت ہے۔	۲۸	۳۲	برعت کا شرعی معنی۔
		۲۸	۳۳	منفی احمدیاری خان صاحب کی اختراع۔
		۳۲	۳۴	ایک وہم اور اس کا ازالہ
		۳۶	۳۵	منفی احمدیاری خان صاحب کی ایک اور غلطی۔
		۴۰	۳۶	اہل برعت حضرات کا ایک اصولی مغالطہ
		۴۲	۳۷	برعت حسنہ اور سنیہ کی تحقیق۔

نمبر شمار	مضمون	نمبر شمار	نمبر شمار	مضمون	نمبر شمار
۱۸	شی احمد یار خان صاحب کی تعلی	۱۰۱	۵۹	باب ششم شریعت احمد بن حنبل میں اشتباہ ہو کر کیا کرنا چاہیے؟	۱۵۴
۱۹	باب سوم	۱۰۲	۶۰	باب ہفتم - فردا فردا مبعثات پر تنقید -	۱۶۰
۲۰	مبعثات کے جواز کے دلائل پر ایک نظر	۱۰۳	۶۱	محفل میلاد	۱۶۰
۲۱	کیا اصل اشیاء میں اباحت ہے؟	۱۰۳	۶۲	اس کی تاریخ	۱۶۲
۲۲	میں سن سنہ حسنہ کی تصریح	۱۱۱	۶۳	محققین علماء کا فیصلہ	۱۶۳
۲۳	مفتی احمد یار خان صاحب دنیو کی فطلی	۱۱۳	۶۴	مفتی احمد یار خان صاحب کی انوکھی دلیل -	۱۶۶
۲۴	باب چہارم - عبادات میں اپنی طرف	۱۱۸	۶۵	میلاد میں قیام کرنا -	۱۶۷
۲۵	سے اوقات اور کیفیات کا تعین کرنا بدعت ہے -	۱۱۸	۶۶	ایصال ثواب کیلئے بریج الاول کی تعین بدعت ہے -	۱۶۹
۲۶	صحابہ کرام کا ایسی کیفیات کے متعلق فیصلہ	۱۲۲	۶۷	عرس کرنا -	۱۷۰
۲۷	حضرت ابن مسعود	۱۲۳	۶۸	ذکر بالجہر -	۱۷۴
۲۸	حضرت ابن مسعود کا بلند آواز سے مسجد میں ورود		۶۹	مزادات کو پختہ کرنا اور ان پر گنبد بنانا -	۱۷۹
۲۹	پڑھنے کے متعلق فیصلہ -	۱۲۷	۷۰	قبور کو گولے کا حکم -	۱۸۵
۳۰	ان کا مقام جناب رسول اللہ کی بانگاہ میں -	۱۳۰	۷۱	فرق مخالف کا اعتراف (مع جواب)	۱۸۸
۳۱	حضرت عمرؓ نے چاشت کی نماز کے اہتمام کو بدعت فرمایا -	۱۳۱	۷۲	قبروں پر چراغاں کرنا -	۱۹۲
۳۲	جمعہ کی نماز اور عام نمازوں کے بعد صاف کرنا بدعت ہے -	۱۳۳	۷۳	مفتی احمد یار خان صاحب کی مجلسٹ -	۱۹۶
۳۳	قیاس بطل کی تردید -	۱۳۴	۷۴	قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول چڑھانا -	۱۹۷
۳۴	صاحب انوار ساطعہ کا ایک مغالطہ -	۱۳۵	۷۵	مفتیانہ استدلال -	۲۰۱
۳۵	حضرت ابن عمرؓ نے تزیین کو بدعت کہا -	۱۳۸	۷۶	نیا انکشاف -	۲۰۲
۳۶	حضرت علیؓ نے عید کی نماز سے قبل نماز پڑھنے سے منع کیا -	۱۳۹	۷۷	پختہ قبریں بنانے کا مرسوم فائدہ -	۲۰۲
۳۷	حضرت ابن عباسؓ نے عید کے بعد نماز کو ترک کرنا بدعت قرار دیا -	۱۴۱	۷۸	قبروں پر چادر بنانا -	۲۰۴
۳۸	حضرت سعید بن المسیبؓ نے بھی ایسا ہی کہا -	۱۴۱	۷۹	نماز جنازہ کے بعد دُعا -	۲۰۵
۳۹	حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے دعوتِ حق نہ دیکر کسی تہی	۱۴۲	۸۰	مخالفین کے اعتراضات مع جوابات -	۲۱۰
۴۰	بدعت کی تردید کے بعض عقلی دلائل -	۱۴۳	۸۱	مفتی احمد یار خان صاحب کی بدحواسی -	۲۱۳
۴۱	باب پنجم - کیا بمقام میں کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے؟	۱۴۶	۸۲	دعا بعد الجنازہ کے اہتمام کے دلائل اور ان کے جوابات -	۲۱۳

عرض حال

خدا تعالیٰ کا وہ پسندیدہ اور پیارا دین جو سب ادیان و مذاہب کا ناسخ اور قیامت تک اقامت
عالم کے لئے رہنما ہے، جس کو امام الانبیاء خاتم النبیین اور سید المرسل حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے بدن مبارک کا خون بہا کر اور طرح طرح کی اذیتیں اور صعوبتیں برداشت
کر کے خدا تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچایا تھا اور جس کو افضل البشر بعد الانبیاء حضرت ابو بکرؓ نے لے کر ایک
چھوٹے صحابی نے اپنی جانی اور مالی قربانی کے ذریعہ روئے زمین پر پھیلانے کی انتھک اور کامیاب کوشش
کی اور جس کو تابعین اور اتباع تابعین اور محدثین اور فقہائے کرام نے اپنی زندگیاں وقف کر کے بعد کے
آنے والوں تک پہنچایا اور جس کی سادہ اور فطرتی تعلیم اور ٹھوس و لائل نے اقوام عالم کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا
کہ موافق و مخالف اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات گرامی
اور آپ کی پیش کی ہوئی شریعت اور قانون کی اہل یورپ نے بھی وہ تعریف کی جس سے بڑھ کر شاید
ممکن نہ ہو چنانچہ مگر مگر صاحب لکھتے ہیں کہ ”محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا یہ حکم کہ وہ عورتیں جو
لڑائی میں قید کی جائیں اپنے بچوں سے قطعاً جدا نہ کی جائیں، ایک ایسا حکم ہے جس پر دنیا کے تمام مورخین
کی نکتہ چینیوں جو انہوں نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر کی ہیں، قربان کی جاسکتی ہیں۔“

○ باسورۃ اسمتہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ”محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی زندگی تمام دنیا درمزن سے
عظیم الشان اور بلند پایہ ہے۔“

○ میرو صاحب معترف ہیں کہ تمام نبیوں اور پیغمبروں کے کاموں سے مشکل ترین کام محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا تھا۔

○ کارلائل صاحب اس اقرار پر مجبور ہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) مجسم رحم اور عفو تھا۔ اس کی
تمام زندگی قیمیوں، بیواؤں اور کمزوروں کی حمایت میں گزری۔ یہ اُس شخص کی زندگی تھی

اور خدا کے لئے انتقال کر گیا۔ اگر کسی آدمی نے اپنی زندگی خدا اور خدا کی راہ میں وقف کی، تو وہ یقیناً محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔

○ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لفظ قرآن کے تحت لکھا ہے کہ "محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تمام نبیوں اور دینی کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ کامیاب تھا۔"

○ لیونارڈو صاحب کہتے ہیں کہ "اگر کسی نے زمین پر خدا پایا لیا، اگر کسی نے خدا کی راہ میں اپنی زندگی وقف کر دی، اگر کسی شخص کی زندگی کا نصب العین محض نیکی کا پرچار تھا۔ تو وہ یقیناً عرب کا پیغمبر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تھا۔"

دیکھا آپ نے کہ اہل یورپ بھی حق بات لکھنے اور کہنے پر مجبور ہیں عداوت والفضل ما شهدت به الاعداء حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیش کردہ وہی صحیح اور سچا دین و مذہب تمام ممالک میں پھیلا اور ہندوستان میں بھی پہنچا۔ گیارھویں صدی ہجری میں وہی خالص اسلام جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ و تبع تابعینؓ، اور محدثین و فقہاء نے احتیاط کی چھانی میں چھان کر محفوظ رکھا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان میں جاگزین ہوا، اور قرآن کریم، حدیث اور فقہ و تصوف وغیرہ کی جو خدمت انہوں نے کی وہ اور کسی کی قیمت میں نہ تھی۔ سچ ہے کہ سہ

ایں سعادت بدور بازو نیست تانہ بخشد خدا لئے بخشنده!

اور اسی مبارک خاندان کے علمی چشموں اور ناپید اکنار سمندر سے اکابرینِ علماء دیوبند شکر اللہ تعالیٰ علیہم فیض یاب ہوئے۔ جو اصلی مسلمان حقیقی سُنی اور صحیح معنی میں حنفی ہیں اور ہندوپاک میں اہل السنّت والجماعت صرف اور صرف علماء دیوبند ہیں یا جو ان کے ساتھ عقائد میں متفق ہیں اور بس! انہی اکابر نے جہاد ۱۸۵۷ء میں انگریز مردود کے خلاف دہلی، پانی پت اور سونی پت وغیرہ کے میدانوں میں اپنی جانیں پیش کیں اور تیرہ ہزار کے قریب علماء کرام کو انگریزوں نے تختہ دار پر رکھا، اور انگریز کیلئے کم و بیش نو سال تک اکابرینِ علماء دیوبند کیا ہندستان اور کیا بیرون از ہند ایک ناگہانی مصیبت بنے رہے۔ ان اکابر نے تقریر و تحریر اور اپنے عمل سے برطانیہ کی حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنا شروع کر دیں۔ مگر برطانیہ تو ابلیس سیاست تھا، اُس نے ان اکابر کو مسلمانوں

کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے کہ الامان و الحفیظ، اور ان کی تکفیر کیلئے بڑے بڑے مولوی اور مفتی خریدے گئے اور ان اکابر پر جس طرح اقتراء اور بہتان مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی نے باندھے ہیں اور کسی سے یہ خدمت ادا نہیں ہو سکی۔ انہوں نے ان اکابر کو کافر اور مرتد قرار دینے کے لئے اور وہابی و دہابی کہہ کر عام مسلمانوں کو ان سے نفرت دلانے کے لئے وہ کوشش کی کہ خدا کی پناہ۔ اور اس زمانہ میں جب کہ ظالم انگریز نے ممالک اسلامیہ پر جاں گداز مظالم ڈھائے اور ہندوستان میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی پوری مہم شروع کی اور دین اسلام کو مٹانے کی ناپاک کوشش جاری رکھی، خان صاحب بریلوی نے اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام نامی ایک کتاب لکھ کر ظالم انگریز کی حکومت میں ہندوستان کو دارالاسلام کا خطاب دیا۔ اور خان صاحب خود دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ”ہندوستان بفضلہ دارالاسلام ہے“ (ملفوظات حصہ دوم ص ۱۸۱)۔ اور صراحت سے دعوہ کیا کہ ہمارے امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ بلکہ علمائے ثلاثہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مذہب پر ہندوستان دارالاسلام ہے، ہرگز دارالحرب نہیں۔ اور خدا تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وفادار مسلمانوں کو کافر اور مرتد قرار دیا۔ چند عبارتیں خان صاحب کی ملاحظہ ہوں :

”ایسے ہی وہابی، قادیانی، دیوبندی، نیچری، چکڑاوی جملہ مرتدین ہیں کہ ان کے مرویہ عورت کا تمام جہان میں جس سے نکاح ہوگا، مسلم ہو یا کافر، اصلی یا مرتد، انسان ہو یا حیوان، محض باطل اور زنا، خالص ہوگا اور اولاد و لذت نامہ۔ (ملفوظات حصہ دوم ص ۱۸۱)۔ آج کل کے وہابی، رافضی، قادیانی، نیچری، چکڑاوی، مجھوٹے صوفی کہ شریعت پر بیٹھتے ہیں مگر دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اس سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا۔ اُس کا نکاح کسی مسلم، کافر، مرتد، اُس کے ہم مذہب یا مخالف مذہب، غرض انسان حیوان کسی سے نہیں ہو سکتا جس سے ہوگا محض زنا ہوگا، مرتد مرد ہو خواہ عورت، مرتدوں میں سب سے بدتر منافق ہے۔ یہی ہے وہ کہ اس کی صحبت بزار کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے کہ مسلمان بن کر کفر سکھاتا ہے۔ خصوصاً وہابیہ دیوبندیہ کہ اپنے آپ کو خاص اہل سنت و جماعت کہتے، حنفی بننے، چشتی نقشبندی بننے، نماز روزہ ہمارا سا کرتے ہماری کتابیں پڑھتے پڑھاتے اور اللہ و رسول کو گالیاں دیتے ہیں (لعنة الله على الكاذبین - صفحہ ۱۲)۔“

یہ سب سے بدتر زہر قاتل ہیں۔ (احکام شریعت حصہ اول ص ۱۷۱) ————— "رافضی، تبرائی، وہابی، دیوبندی

وہابی غیر مقلد، قادیانی، چکڑالوی، نیچری، ان سب کے ذہن محض نجس و مردار حرام قطعی ہیں۔ اگرچہ لاکھ بار نام الہی لیں اور کئی شتی پر ہیز گار بننے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔ ولا ذبیحة للموتدہ (احکام شریعت حصہ

اول ص ۱۷۱) ————— "احکام دنیا میں سب سے بدتر مرتد ہے اور مرتدوں میں سب سے خبیث تر مرتد منافق

رافضی، وہابی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی کہ کلمہ پڑھتے، اپنے آپ کو مسلمان کہتے، نماز وغیرہ افعال اسلام بظاہر

بجالاتے، بلکہ وہابی وغیرہ قرآن و حدیث کا درس دیتے لیتے، اور دیوبندی کتب فقہ کے ماننے میں بھی شریک

ہوتے، بلکہ حشمتی نقشبندی وغیرہ بن کہ پیری مریدی کرتے اور علماء و مشائخ کی نقل اُتارتے اور بایں ہمہ محمد

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین کرتے (لعنة الله على الكذابين) یا ضروریات دین سے کسی

شے کا انکار رکھتے ہیں۔ ان کی کلمہ گوئی و اذکار اسلام اور افعال و اقوال میں مسلمانوں کی نقل اُتارنے ہی نے ان

کو اخبث و اضر اور ہر کافر اصلی یہودی نصرانی، بُت پرست مجوسی سب سے بدتر کر دیا (احکام شریعت حصہ

اول ص ۱۷۱) ————— "یہی مثال روافض و یابری کی ہے کہ روافض مثل نصاریٰ کے محبت میں کافر ہوتے،

اور وہابیہ مثل یہود کے عداوت میں۔" (احکام شریعت حصہ دوم ص ۱۷۱) ————— خان صاحب پنا تائید کردہ ایک طویل

استفتاء نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "غلام احمد قادیانی، اور رشید احمد اور جو اس کے پیرو ہوں جیسے خلیل احمد بطحی

اور اشرف علی وغیرہ، ان کے کفر میں کوئی شبہ نہیں نہ شک کی مجال بلکہ جو ان کے کفر میں شک کرے بلکہ کسی طرح

کسی میں انہیں کافر کہنے میں توقف کرے اسکے کفر میں بھی شبہ نہیں" (احکام شریعت حصہ دوم ص ۱۷۱، فتاویٰ افریقیہ ص ۱۷۱) ————— امیر حسن

امیر احمد سوانی، نذیر حسین دہلوی، قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، خلیل احمد انبلیہوی، اشرف علی

تخاوی وغیرہم اور بعض دیگر فرقوں کے نام لے کر آخر میں لکھتے ہیں: ومن جملة هؤلاء الطوائف

السیبک کلہم کفار مرتدون وخارجون عن الاسلام باجماع المسلمين خلاصہ کلام یہ ہے کہ باجماع المسلمین

یہ سات فرقے اور ان کے بانی کافر مرتد اور اسلام کے دائرہ سے خارج ہیں۔ (المتنہ العمدہ بتاویۃ الابۃ حفظہ مکتبہ علمہ لاہور)

دیوبندیوں کے بارے میں مسلمانوں سے آخری اپیل، جو انہیں کافر نہ کہے، جو ان کا پاس لحاظ رکھے، جو ان کے

استادی یا رشتے یا دوستی کا خیال کرے وہ بھی انہیں میں سے ہے۔ انہیں کی طرح کافر ہے، قیامت میں ان

کے ساتھ ایک رشتی میں باندا جائے گا۔ (فتاویٰ افریقیہ ص ۱۷۱)

یہ تمام عبارتیں خان صاحب کی ہیں اور اپنی جگہ پر واضح ہیں، مزید تشریح کی حاجت نہیں ہے۔ اب آپ فرق مخالف کی مشہور و معروف کتاب بجانب اہل سنت کی چند عبارتیں بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ اس کتاب پر شیر بشیر مولوی حشمت علی صاحب وغیرہ کی تصدیقات موجود ہیں۔

○ ”مکمل شریعت مسٹر جینا (قائد اعظم مسٹر محمد علی صاحب جناح) اپنے عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے۔“ (مثلاً ۱)

○ ”ان صلح نگل لیڈر میں اعظم گڑھ کے مولوی شبلی اور الطاف حسین حالی اور زمانہ حال کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال بہت نمایاں ہوتے تھے، انکی صلح کلیتہً اپنی حد سے گزر کر شدید نیکریت اور دہریت مکسیمی ہوئی ہے۔“ (مثلاً ۲)

○ ”دوبابہ دیوبندیہ و قادیانیہ و روافض و نیاچہ و خاکساریہ و چکڑالویہ و احواریہ و جٹا و حاریر (حسن نظامی دہلوی کے مرید) و آغا خانہ و دوبابہ غیر مقلدین و دوبابہ نجدیہ و یگیہ خالیہ و صلح کلیہ خالیہ اپنے عقائد کفریہ قطعیہ یقینیہ کی بناء پر مکمل شریعت قطعاً یقیناً اسلام سے خارج اور کفار و مرتدین ہیں۔ جو مئی اسلام ان میں سے کسی کی قطعی یقینی اطلاع دے سکتے ہوتے ہیں اس کو مسلمان کہے یا اس کے کافر مرتد ہونے میں شک رکھے یا ان کو کافر مرتد کہنے میں توقف کرے وہ بھی یقیناً کافر مرتد ہے اور بے توبہ مرا، تو مستحق ناراہۃ۔“ (مثلاً ۳)

○ ”فرقہ احرار اشرار بھی فرقہ نیکرہ کی ایک شاخ ہے۔ اس ناپاک فرقے کے بڑے بڑے مکملین (کٹے) یہ ہیں ملک شیخ جی امام احرار مبلغ دوبابہ ایڈیٹر انجم عبدالشکور کاکودی، صدر مدرس دیوبند حبیب احمد اجدویہ باباشی، شبیر احمد دیوبندی (پاکستان کے سابق شیخ الاسلام)، عطاء اللہ بخاری، حبیب الرحمن لدھیانوی، احمد سعید دہلوی نانی حسن الاسلام (منشی) کفایت اللہ شاہ جہان پوری، عبد الغفار سرحدی گاندھی۔ اس فرقہ کا سرغنہ مسٹر ابراہیم آزاد ہے جو امام احرار کہلاتا ہے۔“ (مثلاً ۴)

غرضیکہ ہندوستان کا کوئی فرقہ اور مسلمانوں کا کوئی بھی مشہور عالم اور لیڈر ایسا نہیں ہے جو اس خالی فرقہ کے نزدیک کافر، مرتد اور خارج از اسلام نہ ہو۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ان کے کفر میں شک اور توقف بھی کرے تو وہ بھی کافر مرتد اور مستحق ناراہۃ ہے۔ یہیں معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ ”اور بیشک امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایسے ہی فرقوں کے حق میں فرمایا ہے کہ حاکم کمان میں سے ایک کا قتل ہزار

کافروں کے قتل سے بہتر ہے کہ دین میں ان کی مضرت زیادہ سخت تر ہے (حسام الحرمین ص ۱۸۱)۔ اور اب تو اس خالی فرقہ نے مظلوم دیوبندیوں کو شہید کرنا اور ان پر قاتلانہ حملے کرنے بھی شروع کر دیئے ہیں چنانچہ ہفت روزہ پاکستانی لائل پور میں لکھا ہے کہ موضع دارنی تھاد کوٹ سہابہ بہادر پور میں رضا خانی بریلویوں نے دو دیوبندی اہل السنّت والجماعت کو گھبراڑیوں سے شہید کر دیا اور دو کو شدید زخمی کیا۔ احمد پور شتر قریہ کے قریب موضع ترہو محمد پناہ میں رضا خانیوں نے وہاں کے دیوبندی اہل السنّت والجماعت نمبر دار حاجی سردار جٹو اخلاق صاحب کو نماز کی حالت میں شہید کر دیا۔ لورالائی کوٹہ کی مسجد کے دیوبندی اہل السنّت والجماعت امام (مولانا محمود الحسن صاحب) کو علم غیب کے مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے سکھ کر تمام شہادت چاڑھ گیا سہیوال کے نزدیک ایک گاؤں میں رضا خانیوں نے ایک دیوبندی سنی کو شہید کر دیا (اور ایسے ہی کئی واقعات علماء دیوبند سے پیش آتے رہتے ہیں کہ ان کو بریلوی حضرات نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، اور ان کے ناحق خون سے زمین رنگین کی)۔ اور اسی پرچہ کے صفحہ اکالم امیں ہے چند دنوں کا واقعہ ہے کہ (لائل پور میں) مسجد فیکری ایریا کے دیوبندی امام پر بریلویوں نے مولوی محمد عمر (صاحب) اچھروی کی قیادت میں قاتلانہ حملہ کر دیا حملہ آوروں کو موقع پر گرفتار کر لیا گیا جس سے دیوبندی امام کی جان بچ گئی۔ یہ ہیں وہ حالات و واقعات اور اسباب محرمات جن کے تحت ہم اپنی پوزیشن کو واضح کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ہمارا کوئی ایک مسئلہ بھی قرآن کریم اور حدیث شریف اور فقہ حنفی کے خلاف نہیں ہے اور ہم بکے سنی اور حنفی مسلمان ہیں اور بدعات کے جملہ مشہور مسائل پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے مسئلہ حاضر و ناظر پر راقم کی کتاب تبرید النواظر کہتی سالوں سے اور شرک کی حقیقت اور پکار وغیرہ پر گلدستہ توحید موصیٰ طبع ہو چکی ہیں۔ مختار نگل کے مسئلہ پر دل کا سرو کی طباعت ہو چکی ہے مسئلہ علم غیب اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بشریت پر کتابیں زیر ترتیب ہیں اور اکابرین علماء دیوبند کی عبارات پر جو قطع و برید کے اعتراضات کئے گئے ہیں ان کے پورے اور مفصل جوابات زیر تجویز ہیں۔ وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقُّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ۔

احقر

ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر

۲۱ محرم ۱۴۱۵ھ - ۱۸ اگست ۱۹۹۵ء

لے اب ازالۃ التّیّب، تنقید متین اور عبارات اکابر کا پہلا حصہ طبع ہو چکا ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بابِ اوّل

شرعی دلائل اور براہین کے بیان میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ النَّبِیِّنَ اَصْطَفٰی۔ اَمَّا بَعْدُ فَاِنْ اَمَدَقَ الْحَدِیْثُ کِتَابَ اللّٰہِ وَ خَیْرَ الْهَدٰی هَدٰی مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ (وَعَلٰی اٰلِہٖ وَ اَحْبَابِہٖ وَ اَزْوَاجِہٖ وَ جَمِیْعِ اُمَّتِہٖ) وَ سَلَّمَ وَ شَرَّ الْاُمُوْر مَحْدَثَاتُہَا وَ کُلُّ مَحْدَثَةٍ بَدْعٌ وَ کُلُّ بَدْعٍ ضَلٰلَۃٌ وَ کُلُّ ضَلٰلَۃٍ فِی النَّارِ۔ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ بار شکر ہے کہ اُس نے ہمیں انسان بنایا۔ پھر انسان بنانے کے بعد ہمیں مسلمان بننے کی توفیق عنایت فرمائی اور پھر مسلمان ہونے کے ساتھ ہمیں امام الانبیاء سید المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہونے کا لازوال شرف مرحمت فرمایا۔ اگر ہم اسکی اُن گنت اور لاتعداد نعمتوں کا شکر بجالانا چاہیں تو یہ ایک ناممکن امر ہے اور ہمارے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ بلکہ ہم اس کی نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتے۔ وَ اِنْ تُعَدُّوا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصَوْہَا، چہ جائیکہ ہم اس کے انعامات و احسانات کا حق ادا کر سکیں۔

قرآن کریم اہدی قانون، کامل ضابطہ حیات اور مکمل دستور العمل ہے | گو حسب تصریح علی اصول دلائل اور براہین کی چار قسمیں ہیں۔ کتاب اللہ۔ سنت رسول اللہ۔ اجماع اور قیاس۔ مگر اجماع اور قیاس درحقیقت کتاب اور سنت ہی کی طرف راجع اور اسی کا ثمر ہے۔ لہذا کائنات کی رہبری کے لئے اصولی طور پر

ہدایت و حصول اور درجوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو جمیع اصول، تمام پختہ و غیر متغیر اور لازمی احکام اور اعمال پر مشتمل اور انسانی تصرف سے بالاتر اور اپنے الفاظ میں محفوظ و منضبط اور ہمیشہ کیلئے مکلف مخلوق کی ہدایت کا نصاب ہے اور اس ہدایت کے سرچشمہ کا نام وحی متلو اور قرآن مجید ہے۔

مذہب اور قانونِ فطرت اس معیار اور مقیاس کا نام ہے جو مقرر و معین ضابطہ اور قانونِ کلی کی حیثیت رکھتا ہو۔ سچا اور صحیح مذہب اور آئین صرف وہی ہوتا ہے جس کی بنیاد حقیقی سچائی اور عالمگیر حقیقت پر ہو، اور جس کے ذریعہ عقائد و اعمال اور اخلاق کو اچھا یا بُرا کہا جاسکے اور جس کے رُوسے باطنی اور ظاہری اصلاح ہو کہ عذاب سے بچا جاسکے اور جس کے اصول قطعی اور اُٹل ہونے کے ساتھ ایسے جامع ہوں جو کائنات کی دینی اور دنیوی حاجت روائی کے لئے کافی ہوں۔ فطرت چونکہ حقیقی صداقت ہے اس لئے مذہب اسلام کی بنیاد خالقِ فطرت نے فطرت پر رکھی ہے اور جس کی بابت یوں ارشاد فرمایا ہے :

فُطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ
 يَٰ اَللّٰهُ تَعَالٰی کا وہ قانون، فطرت ہے جس پر اُن نے انسان
 لَخَلِقُ اللّٰهُ ط (پ ۲۱، الروم، رکوع ۴)۔
 کو پیدا کیا ہے (یعنی انسانی فطرت اسی دین کے موافق
 ہے) اور اس قانون میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

سچا مذہب وہ ہوتا ہے جو من جانب اللہ قطعی اور محکم طریقہ سے منکشف ہوتا ہے اور ہر صحیح الفطرت اس کے سامنے تسلیمِ خم کر دیتا ہے۔ وہ بنایا نہیں جاتا اور نہ اس میں مخلوق کی ایجاد و احداث کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ غلط اور نادرست مذہب کی شناخت یہ ہوتی ہے کہ اس کی بنیاد اُن خیالات اور اوہام پر قائم کی جاتی ہے جو دل کی دنیا میں پیدا ہوتے اور خواہشات کے دریا اور طوفان میں بہ جاتے ہیں، اور نفس الامر سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ فطرت سے بے گانہ اور حقیقت اور صداقت سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ گوان کی ظاہری چمک دمک سادہ لوح اور سطحی قسم کے لوگوں کی نارسا آنکھوں کو خیر کر دیتی ہے، اور وہ اس سے متاثر ہو کر اس دامِ ہمرنگِ زمین کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قانون سازی کا منصب کس کو حاصل ہے اور اس کے لوازمات کیا ہیں؟ [جستہ مستقبل سے متعلق
 کسی کو زیادہ علم ہوگا، اُسی قدر وہ زیادہ صحیح قانون اور آئین بنا سکے گا۔ مخلوق کے پاس مستقبل سے متعلق علم

حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل، تجربہ، قیاس اور حواس وغیرہ سب کے سب محدود، نامتناہی اور ناقص ہیں، اس لئے مخلوق کے مجوزہ قوانین کبھی ناقابلِ ترمیم نہیں ہو سکتے۔ ملک اور ملت کے چیدہ چیدہ اور منتخب قانون ساز بڑی کوشش اور کاوش سے بسیار بحث و تحقیق کے بعد ایک قانون تجویز کرتے ہیں مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس میں ترمیم کیلئے لگانا پڑتا ہے اور ہمیشہ اس امر کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور تا قیامت ہوتا رہے گا۔ ہر قانون اور آئین کے بنانے کا ایک مدعا اور مقصد ہوتا ہے۔ قانون ساز کو اگر قانون پر عمل کرنے والوں کے ساتھ شفقت اور ہمدردی ہے اور وہ ان کا حقیقی خیر خواہ اور خود غرضی سے بالاتر ہے تو وہ ایسا قانون بنائے گا جس سے قانون پر چلنے والوں کو نفع اور فائدہ پہنچے گا، اور اس بات کے تسلیم اور یقین کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ مفید اور ناقابلِ تیسخ قانون صرف وہی بنا سکتا ہے جو ہر لحاظ سے کامل علم رکھتا اور بہرہ و جوہرِ عظیم و خیر ہو، حقیقی ہمدرد اور مہربان ہو، خود غرضی سے بے نیاز اور مطلب پرستی سے بے احتیاج اور بے پروا ہو، ظاہر ہے کہ مخلوق سے متعلق خالق کے سوا علم تام اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ غرضی نہیں کہ الرحمن سے زیادہ مہربان کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اور پوشیدہ نہیں کہ القصد سے بڑھ کر بے نیاز اور کوئی نہیں۔ لہذا خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں ہو سکتی جو مخلوق کے لئے کامل و مکمل اور ناقابلِ ترمیم قانون اور آئین بنا سکے۔ اَلَا لَهٗ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط۔ اور بھلا اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کو قانون بنانے اور حکم کرنے کا حق بھی کیا ہے؟ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰہِ۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس قادر و مقتدر خدا کا بنایا ہوا قانونِ فطرت تمام موجودات میں جاری اور ساری ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سب اُس کے قانون میں (جس کو سنتِ الہیہ یا قانونِ قدرت کہا جاتا ہے) جکڑے ہوئے ہیں اور کسی میں اس کی خلاف ورزی کی تاب نہیں وَلٰكِي تَجِدَ لِسُنَّةِ الْاٰلِهٖ تَبْدِيْلًا ط اور اگر ہم خدا تعالیٰ کے اس قانون میں (جس کو لاف نیچر کہتے ہیں) ترمیم و تیسخ کا اختیار رکھتے تو سرو کے درخت میں آم اور بادام پیدا کر دیتے۔ بیروں اور مجروروں میں گٹھیاں پیدا کر دیتے۔ گدھے کے سر پر سینگ پیدا کر دیتے، یا گدھے کے سر کی طرح گائے بیل اور بھینس کے سر سے سینگ الگ کر دیتے اور اپنی اس حماقت اور جہالت کو عقل و دانائی قرار دے کر اُس مصلحت اندیش حقیقی کے قانون میں

اصلاح و ترمیم کرنے والے بن جاتے۔ لیکن اس کا قانون ہماری دسترس سے باہر، ہر عیب و سقم سے پاک، ہر اعتبار سے ناقابل ترمیم اور تمام موجوداتِ عالم میں پوری طاقت اور شوکت کے ساتھ نافذ ہے اور تمام مخلوقاتِ عالم ایک ذرہ بے مقدار سے لے کر آفتابِ عالم تا یک، مٹی سے لے کر ثیاب تک اور فرش سے لے کر عرش تک اس کی تعمیل اور فرمانبرداری میں ہمہ تن مصروف اور بے اختیار ہے۔

قانونِ خداوندی کا نافذ کرنے والا بالذات انسان ہی ہے | مخلوقاتِ عالم میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کو خدا تعالیٰ نے خاص قسم کی صلاحیت اور استعداد عطا فرما کر ایک محدود دائرہ میں آزاد ارادہ اور اختیار دے دیا ہے، اور اس آزاد ارادہ اور اختیار کے لئے اس کو قانون دے کر اس کی تعمیل چاہی ہے۔ اسی قانون کا نام دین اور مذہب ہے اور اسی کی تعلیم اور یاد دہانی کے لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے اور اسی سلسلہٴ تعلیم کو امام الانبیاء سید الوسل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مبعوث ہو کر پائے تکمیل تک پہنچایا اور اسی کا آپ کی وفاتِ حسرتِ آیات سے اکیاسی روز قبل ہزاروں کی تعداد میں اُن قدسی صفات اور پاک نفوس کے بحرِ معنی میں میدانِ عرفات کے اندر نویں ذوالحجہ کو جمعہ کے دن اور عصر کے وقت یہ اعلان کروایا گیا کہ :

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ
عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ
آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور
تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے
دینِ اسلام کو پسند کیا۔ (پ ۶ - المائدہ - رکوع ۱) -

اس اعلانِ خداوندی کا یہی منشا ہے کہ قیامت تک اب دین میں کسی ترمیم و تہتیک اور حذف و اضافہ کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ ہر ایک کے لئے جن احکام کی ضرورت تھی وہ اصولاً سب نازل کر دیئے گئے ہیں۔ اب جو شخص دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے جس کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُمت کو نہیں دی تو گویا وہ درپردہ یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ دین نامکمل اور میری ترمیم کا محتاج ہے، یا وہ اس کا مدعی ہے کہ معاذ اللہ تعالیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود رُف و اورِ جہم ہونے کے اپنی اُمت کو بہتر، اعلیٰ اور مکمل طریقہ نہیں بتایا۔ الغرض جس طرح اس کا

قانون قدرت، ترسیم و تفسیر اور مخلوق کے دست برد سے بالاتر ہے، اسی طرح اس کا قانون شرع بھی ترسیم و تفسیر اور تفسیر و اضافہ سے بالاتر ہے۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ اس میں ترسیم کر سکے، اور کسی دانش فروش کا کیا حوصلہ ہے کہ وہ اس کو ناقص اور ناقابل قرار دے کر اس میں اضافہ اور اصلاح کا تدبیر ہو سکے۔ کوئی حکمت اور دانائی کی ایسی بات نہیں جو قانون خداوندی میں موجود ہو۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی کھلا اور چھپا ہوا شعبہ ایسا نہیں جس کے شائستہ بنانے کا نہایت مکمل اور ناقابل ترسیم و ستورہ عمل اس میں پیش کیا گیا ہو۔

جميع العلف في القرآن لكن تقاصر عنه افهام الرجال
 كتاب اللہ کی ہمہ گیر صداقت اور دین اسلام کا مکمل ہونا اپنوں کی نگاہوں میں | ① ایلموین
 خلیفہ راشد حضرت عمرؓ (المتوفی ۳۷ھ) نے ایک خاص موقع پر ارشاد فرمایا :

اذا كنا اذل قوم فاحترنا الله بالاسلام
 فمهما نطلب العز بغیر ما احترنا
 الله به اذلنا الله - (مسند کج ۱ ص ۱۷۱)
 وج ۲ ص ۱۷۱ - وقال الحاکم والذهبی صحیح -
 ہم ایک ذلیل و عمار قوم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین اسلام
 کی وجہ سے عزت دی۔ جب بھی ہم کسی ایسے طریقے سے عزت
 حاصل کرنا چاہیں گے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت
 نہیں دی (یعنی وہ اسلام کے خلاف ہو) تو یقیناً اللہ تعالیٰ
 ہمیں ذلیل اور رسوا کر کے چھوڑے گا۔

② خلیفہ راشد اور پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ (المتوفی ۱۰۱ھ) نے اپنی ایک تقریر
 میں فرمایا : "اتما بعد ! تمہارے بھی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے
 اور خدا تعالیٰ نے جو مکمل کتاب آپ پر نازل کی ہے، اس کے بعد کوئی دوسری کتاب آنے والی نہیں ہے۔
 خدا تعالیٰ نے جو چیز حلال کر دی ہے وہ قیامت تک حلال رہے گی، اور جو چیز حرام کر دی وہ قیامت تک
 کے لئے حرام رہے گی۔ میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں، میں تو صرف احکام الہی کو نافذ کرنے
 والا ہوں۔" (سیرت ابن جوزیؒ ص ۱۷۱)۔ اسی کے آگے یوں ارشاد فرمایا :

آلَا وَاِنِّي لَسْتُ بِمَبْتَدِعٍ وَلَكِنِّي خَبَرُور ! میں پہنچتی نہیں، بلکہ میں تو متنبیج

سنت ہوں۔

متبع۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۱۸۱)۔

۳) امام دار، ہجرت حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) بدعات کی تردید کرتے ہوئے ارشاد

فرماتے ہیں :

من ابتدع في الاسلام بدعة يراها
حسنة فقد زعم ان محمدا صلى الله
عليه وسلم خان الرسالة لان الله تعالى
يقول الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ الْيَوْمَ
فَمَا لَكُمْ يَوْمَئِذٍ دِينًا فَمَا يَكُونُ
الْيَوْمَ دِينًا۔

جس نے اسلام میں کوئی بدعت نکالی جس کو وہ اچھا سمجھتا
ہے تو گویا اُس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم نے ادا کی گئی رسالت میں خیانت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین
مکمل کر دیا ہے۔ (الایہ)۔ پس جو چیز اس وقت دین نہ
تھی، آج بھی ہرگز دین نہیں ہو سکتی۔

(کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۱۸۱ و ج ۲ ص ۱۵۱ للشاطبی)

۴) علامہ حسام الدین علی متقی الحنفی (المتوفی ۹۱۱ھ) بدعات اور اہل بدعات کی تردید کرتے

ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

ان هذا الاجتماع في اليوم الثالث خصوصاً
ليس فيه فرضية ولا فيه وجوب ولا فيه
سنة ولا فيه استحباب ولا فيه منفعة
ولا فيه مصلحة في الدين۔ بل فيه طعن
ومذمة وملامة على السلف حيث لم
يبيّنوا بل على النبي صلى الله عليه وسلم
حيث ترك حقوق الميت بل على الله
سبحانه وتعالى حيث لم يكمل الشريعة
وقد قال الله تعالى الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ

یعنی خصوصیت کے ساتھ سمیعہ دلی کا اجتماع نہ تو فرض
ہے اور نہ واجب، نہ سنت ہے اور نہ مستحب، نہ تو اس
میں کوئی دینی فائدہ ہے اور نہ اس میں کوئی دینی مصلحت
ہے بلکہ اس میں طعن و مذمت اور ملامت ہے سلف
پر، کہ انہوں نے اس کو بیان نہیں کیا بلکہ نبی کریم صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر کہ آپ نے میت کے حق بیان
نہیں فرمائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی پر کہ اُس نے
شریعت کو مکمل نہیں کیا (اور ہماری بدعات کی وہ
محتاج ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں نے

دِينَكُمْ الْاِيَةِ (بحوالہ تفہیم المسائل ملکہ)۔ آج کے دن تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے۔

⑤ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ (المتوفی ۹۷۴ھ) بدعت اور اہل بدعت کی تردید میں

فرماتے ہیں :

روشن سنت کے نور پر بدعات کی تاریکیاں چھا گئی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ملت کی رونق کو نئے نئے اُمور کی کدورت نے ضائع کر دیا ہے۔ حیرت تو ان لوگوں پر ہے جو ان بدعات اور محدثات کو اچھے امور تصور کرتے اور ان بدعات کو نیکیاں یقین کہتے ہیں اور دین کی تکمیل اور ملت کی تسیم ان بدعات سے تلاش کرتے ہیں اور ان امور کی ادائیگی میں ترغیب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صراطِ مستقیم پر چلائے، مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ دین ان محدثات سے پہلے ہی کامل ہو چکا ہے اور نعمت تمام ہو چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اسی سے وابستہ ہو چکی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج کے دین میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے (الایہ) سو دین کا کمال ان بدعات سے تلاش کرنا درحقیقت اس آیت کریمہ کے مضمون سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔

کہ دل آزرہ شوی و در سخن بسیار است

(مکتوبات حصہ چہارم ص ۹۷۱ مکتوب ۲۶)

⑥ ملا علی قاری الحنفیؒ (بقول بعض حضرات گیارہویں صدی کے مجدد المتوفی ۱۰۱۴ھ) ارشاد

فرماتے ہیں :

نورِ سنتِ سنہ را ظلماتِ بدعتہا مستور نشدہ اند و رونقِ ملتِ مصطفویہ را کدورتِ امورِ محدثہ ضائع گردانیدہ عجب تر آنکہ جمع آں محدثات را امورِ مستحسنہ میدانند و آں بدعتہا را احسانات مے انگازند و تکمیلِ دین و تسیمِ ملت ازاں محدثات مے جویند و در اتیان آں امور ترغیبات مے نمایند براہم اللہ صراطِ مستقیم، مگر نئے دانند کہ دین پیش ازین محدثات کامل شدہ بود و نعمت تمام گشتہ و رضائے حق تعالیٰ بحصولِ پیوستہ کما قال اللہ الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ الْاِيَةِ پس کمالِ دین ازین محدثات جستن فی الحقیقت انکار نمودن است۔ مقتضائے

ایں آیت کریمہ ۷۷ اندکے پیش تو گفتم غم دل و ترسیدم

قال الله تعالى الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ
 الایۃ۔ فلا نحتاج فی تکمیلہ الی امر
 اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آج کے دن میں نے تمہارے لئے
 تمہارا دین مکمل کر دیا ہے (الایۃ) سوہیں دین کی تکمیل میں
 خارج عن الکتاب و السنۃ۔ کسی ایسے امر کی حاجت اور ضرورت نہیں ہے جو کتاب و

(شرح فقہ اکبر منہ کان پوری) اور سنت سے خارج ہو۔

غرضیکہ دین اسلام ایسا مکمل نظام عمل ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی
 کرنا یقیناً محال ہے اور اس کا مل اور مکمل ضابطہ حیات کی موجودگی میں کسی اور ضابطہ کی طرف نگاہ
 اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کریم کی حقانیت اور دین اسلام کی عظمت غیروں کی نگاہ میں | جن اہل یورپ کی تقلید کو آج
 بدستی سے مسلمان مایہ افتخار سمجھتے ہیں اور مردوں سے لے کر عورتوں تک، بچوں سے لے کر بوڑھوں تک،
 ہر برادری میں ان کی نقل اتارتے اور ان کے فیشن اور رسم میں رنگے ہوئے اور سیرت و صورت میں انہی
 تعالیٰ کے دلدادہ ہیں، ان کی عینک سے اس کامل اور مکمل کتاب کو ملاحظہ کیجئے :

① بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک عیسائی نامہ نگار لکھتا ہے :

”پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ کیونکہ
 مسلمان جب قرآن وحدیث میں غور کریں گے، تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج
 اس میں پائیں گے۔“

② جی۔ ایم۔ راڈویل کہتا ہے کہ :

”قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو ان نفلوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود
 مختصر ہونے کے قوی اور صحیح راہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں۔“

③ جرمن مستشرق عمانویل ڈوش لکھتا ہے کہ :

”اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے
 داخل ہوئے جہاں اہل فینیشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت

میں پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوح انسان کو روشنی دکھلائی جبکہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ، طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں انہوں نے حصہ لیا۔ ہم ہمیشہ اُس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

④ ڈاکٹر سمویل جاسن لکھتا ہے کہ :

”قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزون ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اُس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ مملوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔

⑤ لدولف کرپل لکھتا ہے :

”قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ عدالت خربی انتظامات مائیا اور نہایت محتاط قانون خرابہ وغیرہ کی بنیادیں خدا سے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔“

(ماخوذ از مقدمہ تاریخ ہند ج ۲ ص ۳۱۹ تا ۳۲۱ از اکبر شاہ خان)

⑥ سر ولیم میور اپنی کتاب ”لائف آف محمد“ میں لکھتا ہے کہ :

”جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک ایسی کتاب نہیں جو اس قرآن مجید کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔“

⑦ مشہور مصنف ڈاکٹر مورس فرانسسی لکھتا ہے کہ :

”قرآن دینی تعلیم کو غیبی کے لحاظ سے تمام دنیا کی مذہبی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے جو کتابیں دیں اُن سب میں قرآن بہترین کتاب ہے۔

⑧ ڈاکٹر مورس کہتا ہے کہ :

”قرآن نے دنیا پر وہ اثر ڈالا جس سے بہتر ممکن نہ تھا۔“

⑨ ڈاکٹر اسٹین گاس اپنی ڈکشنری میں لکھتا ہے کہ :

”قرآن کی خاص خوبی اس کی ہمہ گیر صداقت میں مضمر ہے۔“

⑩ مشہور مترجم قرآن جارج سیل لکھتا ہے کہ :

”قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا۔ مستقل معجزہ ہے جو مردوں کو زندہ کرنے کے معجزہ سے بلند تر ہے۔“

⑪ پادری وال ریسن بی۔ ڈی لکھتا ہے کہ :

”مسلمانوں کا مذہب جو قرآن کا مذہب ہے، ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔“

⑫ گاڈ فری ہیگنس لکھتا ہے کہ :

”قرآن کمزوروں اور غریبوں کا غم خوار ہے اور نا انصافی کی جا بجا مذمت کرتا ہے۔“

⑬ ڈاکٹر کینن آئرک ٹیلو لکھتا ہے کہ :

”اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جو تہذیب و تمدن کا علمبردار ہے۔“

⑭ مسٹر جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب ”اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن“ میں لکھتا ہے کہ :

”فی الحقیقت قرآن عیوب سے ایسا مبتلا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت

نہیں۔ اول سے آخر تک اسے پڑھ جائیے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پائیے گا جو پڑھنے والے کے چہرہ

پر شرم و حیا کے آثار پیدا کر دے“ (کیونکہ اس میں کوئی ایسا فحش لفظ ہی نہیں ہے)۔ (بحوالہ خطبہ صدارت

۱۳۱۲ء حضرت شیخ العرب داعم مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، المتوفی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۴ھ

اجلاس پنجاب سالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نئی گورڈ)۔

⑮ رومی مورخ ایڈورڈ گوبن صاحب لکھتے ہیں کہ :

”قرآن کی بہت سی نقلوں سے وہی اعجاز کا سا خاصہ یگانگت و عدم قابلیت تحریر کا متن

ثابت ہوتا ہے۔“

⑯ پادری عماد الدین صاحب باوجود اسلام اور مسلمانوں کے اشد ترین دشمن ہونے کے یوں لکھتا ہے کہ :

”قرآن آج تک وہی قرآن ہے جو محمد صاحب کے عہد میں تھا۔“

۱۷) گئین صاحب کہتے ہیں کہ :

”اوقیانوس سے لگاتار ایک قرآن شریف مجموعہ قوانین مانا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں صرف فقہی مسئلے ہوں بلکہ قوانین دیوانی، فوجداری اور دیگر مضامین بھی اس میں درج ہیں۔ اور وہ قاعدے جو آدمیوں کے اعمال اور مال کی نسبت مقرر کئے گئے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کی بے زوال رضا سے بنائے گئے ہیں یا بہ تبدیل الفاظ ہم اس مطلب کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن شریف مسلمانوں کا مجموعہ قوانین عامہ ہے۔ اس میں قوانین مذہبی اور ملوک باہمی اور فوجداری اور دیوانی اور تجارتی اور فوجی اور ملکی اور شراہی سب موجود ہیں، اور مذہبی رسوم سے لے کر معاملات دنیوی تک ہر ایک چیز کا مفصل بیان ہے۔ قرآن نجات روح اور صحت جسمانی اور حقوق عامہ اور حقوق شخصی اور نفع رسانی و خلافت اور نیکی اور بدی اور سزا و دینی و دنیوی سب چیز پر حاوی ہے۔“ (بحوالہ نوید جاوید ص ۵۲ تا ۵۳)

۱۸) مشہور جرمنی فاضل گوسٹے لکھتے ہیں کہ :

”اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہاں سے بڑا جہاں اور روم الکبریٰ کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی، اور جس قدر زمانہ سلطنت روم کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا، اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا۔“ (بحوالہ رسالہ مجلہ قوانین اسلامیہ نظامی پریس، بایلوں) اسی جامع و مکمل، بے نظیر انقلاب انجیر کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے خائف اور بدعاس ہو کر برطانیہ کے مشہور ذمہ دار وزیر اعظم گلیڈ اسٹون نے بھرے مجمع میں قرآن کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ :

”جیتک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہو سکتی۔“ (بحوالہ خطبہ مذکورہ ص ۱۵)۔ اور ہنری ہرینگٹن طامس نے کہا کہ :

”مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتے سوائے کہ احکام قرآنی

کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔“ (بحوالہ حکومت خود اختیاری ص ۵۵)۔

اور گورنر جنرل ہند لارڈ ایلن برائن ۱۸۶۳ء میں ٹیوک آف ولنگٹن کو لکھا کہ :

”میں اس عقیدہ سے چٹم پرشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اُصولاً بھلا ہے، دشمن ہے اس لئے ہماری قیمتی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔“ (آن بیسی انڈیا ص ۳۹۹)

قرآن کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے صحیح جذبات کو دنیا سے ناپید کرنے کے لئے ایسے ایسے حربے استعمال کئے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو گیا۔ اور لارڈ میکالے نے صاف لفظوں میں کہا کہ :

”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تو دل اور دماغ کے اعتبار سے فرنگی۔“ (مدینہ - بخور ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء)

انگریز کا تو بہر حال یہ پروگرام تھا کہ وہ مسلمانوں کی متدعِ ایمان کو کاجوں، بنیماؤں اور کجوں کے ذریعہ ٹوٹا۔ مگر افسوس صد افسوس تو مسلمانوں پر ہے جنہوں نے اس منگل کتاب کی قدر نہ کی اور اس سے ہدایت اخذ کر کے نجاتِ نوح اور صحتِ جسمانی حاصل نہ کی۔

وجہ غیر متلو اور حدیث | ہدایت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کو وحیِ مخفی یا وحی غیر متلو اور حدیث کہا جاتا ہے، اور جس کی رہبری میں اور جس کے سانچے میں ڈھل کر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبوں کی جامع ہے، ہر ایک کی رہبری کے لئے بہترین نمونہ اور عمدہ سامانِ ہدایت بنی گئی ہے، اور اسی کو سنتِ رسول اللہ کہا جاتا ہے اور اسی وحیِ مخفی کے ذریعہ وحی ہوئی تعلیم کا نام قرآن مجید میں حکمت لیا گیا ہے۔ **وَ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ**۔ جس میں قرآن مجید کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں اور اعمال کی خدا تعالیٰ نے اپنی مصلحت کے موافق تعلیم فرمائی ہے جس طرح احکام خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی اسی طرح اسوۂ رسول اور سنتِ رسول اللہ سے بھی بے پڑائی اختیار نہیں کی جا سکتی۔ سنتِ رسول اللہ کی اطاعت بھی ایسی ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی۔ اس لئے کہ دونوں کی پیروی حکمِ الہی کی پیروی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ تو جس طرح قرآن مجید کی اطاعت خود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت بھی خود خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ
اور جو رسول اللہ کی اطاعت کرے، اُس نے

ادلہ۔ (پ ۵۔ النساء۔ رکوع ۱۱) اللہ کی اطاعت کی۔

یہ معلوم اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ثواب اور عذاب، نیکی اور بدی کا تعین اور اس کا صحیح امتیاز جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر کوئی نہیں بنا سکتا۔ جس چیز کو آپ نے گناہ اور مجرم قرار دیا ہو، دنیا میں کوئی شخص اس کی خوبی ثابت نہیں کر سکتا، اور جس چیز کو آپ نے نیکی قرار دیا ہو، دنیا کی کوئی طاقت اُس کی بُرائی ثابت نہیں کر سکتی۔ تمام وہ اخلاق حسنہ جو اقوام عالم اور نسل انسانی میں متحسن اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں، وہ سب الہامات الہیہ اور تعلیمات انبیاء اور خصوصاً جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ کیا خوب کہا گیا ہے۔

چمکتی ہے جو ریگ اکثر، نشاں ہے مر جبینوں کا
جسے ہم روز دتے پھرتے ہیں یہ سب خاکِ انسان ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پہچانی ہوتی اور بتائی ہوتی ہر ایک تعلیم خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوتی ہدایت ہوتی ہے، رسول کا کام صرف دین حق کی تبلیغ کرنا ہے، دین کا بنانا نہیں، اور اسی لئے وہ مطلع ہوتا ہے، اور اس کی اطاعت ہر شخص پر فرض ہوتی ہے اور اس کی پیش کردہ تعلیم کا انکار کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ رسول کے سوا کسی دوسرے شخص کو اور اس کی پیش کردہ تعلیم کو سرگز بہرگز یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم عین فطرت انسانی کے موافق اور متوازی ہے۔ اور انسانی فطرت کے ذیلے اور چھپے ہوئے جملہ تقاضوں کی ترجمانی ہے، اور اس کی خلاف ورزی فطرت سے بغاوت ہے۔ ہادی برحق راہبرِ کامل خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور آئین جس توجہ کا مستحق ہے، اگر ویسی ہی توجہ اس کی طرف کی جائے تو آج بھی مسلمان وہی جو شمس ایبانی اور وہی مہبوت کُن کارنامے دنیا کو پھر دکھا سکتے ہیں جو حضرات صحابہ کرام نے دکھائے تھے۔ مذہب اسلام اور سنت رسول اللہ ہی کے ذریعہ دنیا میں کامل اتحاد صحیح عدل اور مکمل امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ نہ تو آپ جیسا رہبرِ کامل دنیا میں پیدا ہوا، اور نہ تاقیامت پیدا ہوگا،

اور نہ کوئی نظام اور آئین ہی ایسا موجود ہے۔

شراب خوشگوارم ہست و یارِ مہرباں ساقی

ندارد، سچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

ولادت سے لے کر وفات تک، خوشی سے لے کر غمی تک، زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں اُس

کی اصلاح کے لئے ہم کو صرف سنتِ رسول اللہ اور شریعتِ اسلامی کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا، جو

ہر طرح سے محفوظ و موجود ہے۔ کسی دوسری شریعت، کسی دوسرے ہادی، کسی اور آئین اور کسی رسم و

رواج کی طرف نہ تو ہمیں نگاہ اٹھانے کی ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ بھلا جس کے گھر میں شمع کا فوری

روشن ہو، اُس کو فقیر کی جھونپڑی سے اس کا ٹٹا تا ہوا پیرا خچر لانے کی کیا ضرورت اور حاجت ہے؟

ہاں مگر کوئی خوش نصیب اس کی طرف ہاتھ بھی تو بڑھائے۔ کوتاہ دست اور بد قسمت کو سنتِ رسول اللہ

کے آپ حیات سے کیا فائدہ؟

یہ بزمِ مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

سنت کا مقام، صاحبِ سنت کی نگاہوں میں | جنابِ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے سنت پر عمل پیرا ہونے اور اُس کو مضبوطی سے پکڑنے کی اشد تاکید فرمائی ہے اور اس کی پیروی نہ کرنے

پر انتہائی ناراضگی فرمائی ہے۔

① حضرت عرابض بن ساریہ (المتوفی ۳۵ھ) کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فعلیکم بسنتی و سنتِ الخلفاء الراشدين

المہدیین عضوا علیہا بالنواجذ و ایاکم

و محدثات الامور فان کل محدثة بدعة

(مسند رک ج ۱ ص ۹۷) قال الحاکم و الذہبی صحیح۔

تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم میری سنت کو اور ہدایت یافتہ

خلفاء راشدین کی سنت کو معمول بناؤ اور اپنی ڈالروں کے

ساتھ مضبوطی سے اس کو پکڑو، تم نئی نئی باتوں سے پرہیز

کو، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔

یہ صحیح روایت صراحت سے اس امر کو بیان کرتی ہے کہ ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اور حضرات خلفائے راشدین کی سنت کو خوب مضبوطی سے پکڑے، اور اس کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، اور جملہ محدثات اور بدعات سے کنارہ کشی کرے کیونکہ ہر ایک بدعت مگر اہی اور ضلالت ہے۔

② حضرت عبداللہ بن عباس (المتوفی ۳۷ھ) سے روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا:

یا قیہا الناس انی قد ترکت فیکرہا ان اے لوگو! میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ دی ہیں اگر اعصمتم بہ فلن تضلوا ابداً کتاب تم نے ان کو مضبوطی سے پکڑا تو ہرگز تم گمراہ نہ ہو گے ان میں سے اللہ و سنتہ نبیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ، (مستدرک ج ۱ ص ۱۷۰) (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔

③ حضرت عائشہ صدیقہ (المتوفی ۴۰ھ) روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: سچے قسم کے لوگ ہیں جن پر میں بھی لعنت بھیجتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت نازل کرے۔ ان میں سے ایک والقارک لسنٹی (مستدرک ج ۱ ص ۱۷۱)، قال الحاکم والذہبی صحیح) وہ شخص ہے، جو میری سنت کو چھوڑ دے۔

④ حضرت انس بن مالک (المتوفی ۹۱ھ) روایت کرتے ہیں کہ ایک خاص موقع پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (بخاری ج ۲ ص ۲۷۷) میرا نہیں ہے۔ جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا تو وہ

اس سے بڑھ کر تارک سنت کی بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ میرا (امتی) نہیں ہے، گو وہ اپنے مقام پر آپ کا محبت بننا ہے۔ مگر اس کی رائے کا کیا اعتبار ہے؟

⑤ حضرت حذیفہ بن الیمان (المتوفی ۳۷ھ) جناب رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے

روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

تكون بعدی ائمة لا يمتدون بعدی
ولا يستنون بسنتی وسيقوم فيهم رجال
قلوبهم الشياطين في جثمان انس-
کرمیے بعد کچھ رہبر امد پیشوا ایسے ہوں گے جو میری سنت
پر نہیں چلیں گے اور میری سنت پر عمل نہیں کریں گے، ان
میں کچھ ایسے لوگ کھڑے ہوں گے جن کے دل شیطانوں کے
دل ہوں گے مگر شکل اور صورت انسانی ہوگی۔ (مسلم ج ۲ ص ۱۲۷)

اتباع سنت کے بارے میں کتب احوال میں اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ آسانی کے ساتھ اس کا
شمار نہیں ہو سکتا، مگر بطور نمونہ کے ایک عاقل کے لئے یہ پیش کردہ روایات کافی ہیں۔ لیکن جو عموماً
غافل رہنا چاہتا ہے، اس کے لئے دنیا میں کوئی علاج موجود نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے فیصلہ
یہی ہے۔ تَوَلَّ مَا تَوَلَّى۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (المتوفی ۱۱۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

اقول انتظام الدین يتوقف على اتباع سنن النبي - (حجۃ اللہ ص ۱۷۱)۔
میں کہتا ہوں کہ دین کا انتظام اس بات پر متوقف ہے، کہ
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع کیا جائے۔

آپ کی پاک تعلیم کی قدر و عظمت غیروں کی نگاہوں میں | یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی آمد سے ہر طرح دین کی تکمیل ہو گئی، ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہو گیا، دنیا میں
خدا کا آخری پیغام پہنچ گیا۔ معمارِ قدرت اپنی عمارت میں آخری پتھر کو اپنی جگہ رکھ کر اپنی تعمیر پوری کر چکا۔
درجہ بدرجہ چاند اور ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشیدِ انور طالعِ ہوا جس کے لئے غروب نہیں۔
طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد کائنات میں وہ سدا بہار موسم آگیا جس کے بعد پھر خزاں نہیں۔ سنتِ نبوی کی
فیروز میزیاں رحمتِ ایزدی کا ابر بہار بن کر کہ وہ دشت پر پھول برسانے لگیں۔ باغبانِ فطرت کی مکوالی اور باغبانِ
رحمت کی پرورش نے ایک ایسا اہلبہاتہ ہوا چمن تیار کیا جس کی بہار کا تابناک اور روشن مظاہر آنکھوں
نے دیکھ لیا۔ اپنے تو اپنے غیر بھی اُس آفتابِ نبوت کو محسنِ اعظم کہنے پر مجبور ہیں اور کیوں نہ کہیں سے

’سرخ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ

ہم ہماری بزمِ خیال میں، نہ دوکانِ آئینہ ساز میں

① مسٹر ایڈورڈ مونٹ پر و فیصلہ شدہ شرقیہ جنیوا یونیورسٹی لکھتے ہیں کہ :

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاحِ اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی، اس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسنِ اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔“ (بحوالہ مقدمہ تاریخ ہند ج ۳ ص ۲۸۱)۔

② مسٹر طامس کادل لائل اپنی کتاب ’ہیروز ایڈ ہیرو و دیشپ‘ میں لکھتے ہیں کہ :

”صاف و شفاف قلب اور پاکیزہ روح رکھنے والے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) دنیوی مواد ہوس سے بالکل بے لوث تھے۔ ان کے خیالات نہایت متبرک اور ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ تھے۔ وہ ایک سرگرم اور پرجوش ریفارمر تھے، جن کو خدا نے گمراہوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایسے شخص کا کلام خود خدائی آواز ہے۔ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے انتہک کوشش کے ساتھ حقانیت کی اشاعت کی زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے متقدس مشن کی تبلیغ جاری رکھی۔ دنیا کے ہر حصہ میں ان کے متبعین بکثرت موجود ہیں اور اس میں شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی صداقت کامیاب ہوئی۔“ (بحوالہ عصر جدید، ۱۸ اگست ۱۹۲۹)۔

③ لندن کا مشہور اخبار ’نیو ایسٹ‘ لکھتا ہے کہ :

محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی تعلیم و ارشاد کی قدر و قیمت اور عظمت و فضیلت کو اگر کم تسلیم نہ کریں تو ہم فی الحقیقت عقل و دانش سے بیگانہ ہیں۔ (بحوالہ خطبہ مذکورہ ص ۱۸۱)۔

احسان فراموشی کی اس سے بدترین مثال بھی کیا دنیا میں کوئی ہو سکتی ہے کہ بیگانے تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم و ارشاد اور سنت کی قدر و قیمت کا اعلان کریں اور ہم غیروں کی صورت و سیرت، گفتار و کردار اور رسم و فیشن پر مغتول ہوں۔ حیف اور صد حیف ہے اس برائے نام عشق و محبت کے جھوٹے دعووں پر۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ کتاب و سنت کی کسوٹی پر کئے بغیر خود ساختہ بدعات اور خود تاشیدہ رسوم کو تسلیم کرنے میں ہر مسلمان کو عین غور اور فکر کر لینا اور ہر مسئلہ کی اسلامی حیثیت سے کماحقہ واقف اور آگاہ ہونا

از بس لازم اور ضروری ہے اور بغیر اتباعِ کتاب اور سنت کے، محبتِ خدا اور رسول کا دعویٰ بالکل بے بنیاد اور سراسر بے کار ہے۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے والد ماجد مولوی نقی علی خان صاحب ارشاد فرماتے ہیں: ”دعویٰ محبتِ خدا اور رسول بدون اتباعِ سنت سراسر لاف و گداز ہے۔“ (سورۃ القلوب ۱۳) الغرض کتاب و سنت ہمارے دستور کی اساس، ہمارے آئین کی بنیاد، ہمارے نظامِ اجتماعی کا شیرازہ، ہماری سیاست کا ماخذ، ہماری معیشت کا حل، ہماری معاشرت کی نیو اور ہماری زندگی کے سارے مسائل کا مرکز اور محور ہے، اور ہماری زندگی کا کوئی پہلو اور گوشہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو اصولی طور پر اس کے دائرہ عمل سے باہر ہو۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں۔

اجماع و اتفاق شرعی حجت ہے | کتاب و سنت کے بعد دلائل کی مد میں اجماع کا مرتبہ اور درجہ ہے یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ آسانی کے لئے اجماع کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے۔ حضراتِ خلفاء راشدین کا اجماع، عام صحابہ کرام کا اجماع اور اُمتِ محمدیہ (علیہ صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم) کا اجماع۔ ان میں ہر ایک اجماع اپنے مقام پر صحیح اور حجت ہے۔ چنانچہ اسی ترتیب سے ہم اختصاراً کچھ دلائل عرض کرتے ہیں۔ ان کا بغور مطالعہ کیجئے تاکہ صحیح بات ذہن نشین ہو جائے۔

شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

لیکن اس سے قبل حضراتِ خلفاء راشدین کی خلافت کے حق ہونے اور ان کی سنت کے واجب الاتباع ہونے کے متعلق مختصر عرض ہے :

حضراتِ خلفاء راشدین کی خلافت اور ان کی سنت | جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فیض یافتہ حضرات ہر ایک اپنے مقام پر آفتابِ ہدایت کا درخشاں ستارہ اور سمارِ علم کا روشن کوکب ہے۔ مگر یہ بات کسی طرح نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ جیسا فیض آپ سے حضراتِ خلفاء اربعہ کو نصیب ہوا، مجموعی لحاظ سے وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا، اور انہی کے وجودِ مسعود سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا :

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے۔

الضَّلَاحَتِ لَيْسَتْخَفَنَهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخَفَّ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمْ
الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ
خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ
بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْفَاسِقُونَ ○ (پ ۱۸ - التور - رکوع ۷)

ہیں اور کئے ہیں انہوں نے نیک کام۔ البتہ (آپ کے بعد)
حاکم کر دے گا ان کو ملک میں جیسا حاکم کیا تھا ان کے ملک
کو، اور جہاد سے گا ان کے لئے دین ان کا جو پسند کر دیا ان کے
واسطے اور دے گا ان کو ان کے دے کے بدلے امن، میری
بندگی کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو کوئی
ناشکری کرے گا اس کے بعد، سو وہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس آیت استخلاف سے حضرت خلفاء اربعہ کی بہت بڑی فضیلت اور منقبت ثابت ہوئی۔
حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی (المتوفی ۷۱۰ھ) لکھتے ہیں :

"خطاب فرمایا حضرت کے وقت کے لوگوں کو جو ان میں نیک ہیں پیچھے ان کو حکومت دے گا
اور جو دین پسند ہے ان کے ہاتھوں سے قائم کرے گا اور وہ بندگی کریں گے بغیر شرک یہ چاروں
خلیفوں سے ہوا پہلے خلیفوں سے اور زیادہ، پھر جو کوئی اس نعمت کی ناشکری کرے ان کو بے رحم
فرمایا جو کوئی ان کی خلافت سے منکر ہوا، اس کا سال سبھا گیا انتہی (موضع القرآن ص ۵۱۲)۔

نقد استخلاف میں اشارہ ہے کہ وہ حضرات محض دنیوی سلاطین اور لوگوں کی طرح دتے بلکہ وہ پیغمبر خدا
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کرنے والے اور دین حق کی بُنیادیں
بجھانے والے تھے جنہوں نے خشکی اور تڑپ میں دین اسلام کا سبک بٹھایا، حتیٰ کہ اس وقت مسلمانوں کو گناہ مطلقاً
خوف و رعب باقی نہ رہا۔ وہ کامل اطمینان اور امن سے اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہے بعد ان کی
یروشتم رہی کہ ان کی بندگی میں شرک جلی تو کیا راہ پاتا، شرک خنی کی آمیزش بھی نہ تھی۔ یہ بات انصاف
اور قیاس سے بالکل بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ان کو اپنے دین حق کی ترویج و اشاعت کے لئے زمین کی خلافت
اور نیابت سپرد کر دے اور وہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے اعتماد و اعتبار سے محروم رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو معیار حق گردانتے ہوئے ہمیں ان کی
اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر باطنی بن سادیر سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا :

فَانَّهُ مِنْ يَعْشَى مِنْكُمْ بَعْدِي فَيُحِلُّى اَخْتِلَافًا
كثيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ
الْمُهَدِيْنَ تَمَسْكُوْا بِهَا وَعُضُّوْا عَلَيْهَا
بِالنَّوَاجِذِ وَاَيَّامِكُمْ وَمُحَدَّثَاتِ الْاُمُوْدِ فَاَنْ
كُنَّ مُحَدَّثَةٌ بِدْعَةٍ وَّكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ
(ترمذی ج ۲ ص ۹۷، ابن ماجہ ص ۵۷، الباقی ج ۲ ص ۹۷،
مسند دارمی ص ۱۷، مسند احمد ج ۴ ص ۱۷ اور مستدرک
ج ۱ ص ۹۷)۔ (قال الحاكم والذهبي صحيح)۔

یعنی جو شخص میرے بعد منہ رہا، وہ بہت ہی زیادہ اختلاف
دیکھے گا۔ سو تم پر لازم ہے کہ تم میری اور میرے خلفائے
راشدین کی سنت کو جو ہدایت یافتہ ہیں، مضبوط پکڑو اور
اپنی ڈاڑھوں اور کچلیوں سے محکم طور پر اس کو قابو میں رکھو۔
اور تم نئی نئی چیزوں سے بچو، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے۔
اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (امام حاکم اور علامہ ذہبی وغیرہ)
فرماتے ہیں کہ یہ رعایت صحیح ہے۔

حضرت علامہ علی بن نقاریؒ اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں :

فَانَّهُمْ لَمْ يَعْلَمُوا اِلَّا بِسُنَّتِي فَالْاَضَافَةُ
اِلَيْهِمْ اِمَّا بِعَمَلِهِمْ بِهَا اَوْ لَاسْتِنْبَاطِهِمْ
وَ اَخْتِيَارَهُمْ اَيَّاهَا۔ (مفتاح علی الشکوة ج ۱ ص ۱۷۷)۔

اس لئے کہ حضرات خلفائے راشدینؓ نے درحقیقت آپ ہی
کی سنت پر عمل کیا ہے، اور ان کی طرف سنت کی نسبت یا تو
اس لئے ہوئی کہ انہوں نے اس پر عمل کیا اور یا اس لئے کہ انہوں
نے خود قیاس اور استنباط کے اس کو اختیار کیا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ حضرات خلفاء راشدینؓ نے جو کام اپنے تقفہ و قیاس اور اجتہاد و استنباط سے سمجھ
کر اختیار کیا ہے، وہ بھی سنت ہے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے تحت اُمت کو اس
کے تسلیم کرنے سے بھی ہرگز چارہ نہیں اور وہ اس سنت کو تسلیم کرنے کی بھی پابند ہے۔ اور شاہ عبدالحق صاحب مدظلہ
وہوئی (المتوفی ۸۷۵ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

پس ہرچہ خلفاء راشدینؓ برائے حکم
کردہ باشند اگرچہ باجتہاد و قیاس ایشاں بود
موافق سنت اطلاق بدعت برائے نتوان کرد چنانکہ

جس چیز کے بارے میں حضرات خلفاء راشدینؓ نے حکم دیا ہے
اگرچہ وہ حکم اُن کے قیاس و اجتہاد سے صادر ہوتا ہو وہ
بھی سنت کے موافق ہے اور اس پر بدعت کا اطلاق ہرگز

فرقہ زائفہ کہ اشعۃ اللمعات ص ۱۳) صحیح نہیں جیسا کہ گمراہ فرقہ کہتا ہے۔

یہ عبادتِ حق کی نصِ مرتجع ہے کہ حضراتِ خلفاء۔ راشدین کے قیاس و اجتہاد سے ثابت شدہ احکام بھی سنت بھی ہوں گے، اور ضد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کے مطابق اُن پر عمل کرنا بھی لازم ہے۔ حافظ ابن رجب حنبلی (المتوفی ۷۴۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

والسنة هي الطريق المسلول فيشمل ذلك التمسك بما كان عليه هو وخلفاء الراشدون من الاعتقادات والاعمال والأقوال وهذه هي السنة الكاملة۔ (جامع العلوم والحکم ص ۱۹)

سنت اس راہ کا نام ہے جس راہ پر چلا جائے، اسی (راہ کا) تمسک ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین عامل تھے، عام اس سے کہ وہ اعتقادات ہوں یا اعمال و اقوال، اور یہی سنتِ کاملہ ہے۔

یعنی گوئی اجماعِ نفسِ سنت کا اطلاق تو عام حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے قول و عمل پر بھی ہوتا ہے، مگر سنتِ کاملہ صرف یہی ہے جس کا ذکر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی حنبلی (المتوفی ۷۴۰ھ) اہل سنت و الجماعت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

فعلی المؤمن اتباع السنة والجماعة فالسنة ما سن رسول الله صلى الله عليه وسلم والجماعة ما اتفق عليه الصحابة في الخلافة الأربعة۔ (غنیۃ الطالبین ص ۱۱۷ طبع لاہور)

مذہب پر لازم ہے کہ وہ اہل سنت و الجماعت کی پیروی کرے۔ سنت وہ چیز ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے (قولا وفعلا) منقول قرار دی اور جماعت وہ (احکام ہیں جن پر) کہ حضرات صحابہ کرام نے حضرت خلفاء اربعہ کی خلافت میں اتفاق کیا۔

اور یہی اہل سنت و الجماعت کا وہ گروہ اور جماعت ہے جو قبرِ کرم کی بدعت سے پاک و صاف ہے چنانچہ علامہ سید سند علی بن محمد البحر جانی الحنفی (المتوفی ۸۱۰ھ) لکھتے ہیں:

اهل السنة والجماعة ومذہبهم خال عن بدع هو لا بد (شرح مراقف مکتبہ طبع نکلہو)۔

یعنی اہل سنت و الجماعت کا گروہ ہی ایسا ہے جن کا مذہب بدعت سے خالی ہے۔

ایہی اصل حضرات خلفاء راشدین کی سنت حجت ہے اور اُمت کے لئے اس کی پیروی لازم اور اُن کے عہد خلافت میں جن چیزوں پر حضرات صحابہ کرام کا اجماع ہوا وہ بقول شیخ صاحبِ مکتبہ کا مفہوم ہے، اور بغیر اس کے تسلیم کے اہل سنت و الجماعت کا مفہوم ہرگز پورا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی اور اس کا ازالہ | بعض حضرات کو شبہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدین کی سنت صرف وہی ہو سکتی ہے جو بعینہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہو، اور جو چیز آپ سے (قولاً و فعلاً) مروی نہ ہو، اور حضرات خلفاء راشدین میں سے کسی نے اس پر عمل کیا ہو، یا اس کے متعلق حکم دیا ہو، تو وہ سنت نہ کہلائے گی۔ چنانچہ مشہور غیر مقلد عالم امیر مانی (محمد بن اسماعیل المتوفی ۱۱۴۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

و معلوم من قواعد الشریعة ان لیس الخلیفة راشد ان یشرع طریقة غیر ما کان علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عشر نفسه الخلیفة الراشد سنی ما رأه من تجميع صلاته لیالی ومضان بدعة ولم یقل انما سبقة۔ (سبل السلام ج ۲ مثلاً)۔

قواعد شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے، جس پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عامل نہ تھے۔ پھر حضرت عمرؓ خود خلیفہ راشد ہیں اور رمضان کی راتوں میں لوگوں کے ساتھ بل کر نماز پڑھنے کو سنت نہیں، بلکہ بدعت کہتے ہیں۔

لیکن یہ اُن کی غلطی ہے۔ اولاً اس لئے کہ حضرات خلفاء راشدین کی سنت ہونے کیسے یہ ضروری نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے مُوَبَّقُو موافق ہو اور اس سے ذرا بھی مخالفت نہ ہو۔ کیونکہ جو حکم انہوں نے اپنے قیاس و اجتہاد سے جاری کیا ہے، وہ بھی سنت ہے۔ حالانکہ یہ ایک بین حقیقت ہے کہ اُنکا اپنا ذاتی قیاس و استنباط آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے گو اصل مقیس علیہ منقول ہو۔ مثلاً دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے شرابی کو چالیس چالیس گھوڑے مزد دی، اس سے زیادہ ان سے ثابت نہیں۔ مگر حضرت عمرؓ نے اسی کٹے مزد دی ہے، یہ بھی سنت ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

جلد التبی علی اللہ علیہ وسلم اربعین و آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے شرابی کو
ابو بکرؓ اور عثمانؓ نے شہر ثمانین و کل سنتہ چالیس کوڑے بخلا دی اور حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا
(مسلم ج ۲ ص ۱۸۸) دی اور دونوں باتیں سنت ہیں۔

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔

واتعھا عثمانؓ ثمانین و کل سنتہ اور حضرت عثمانؓ نے بھی اسی کوڑے پرے کئے اور یہ سب
(معرفت علوم الحدیث ص ۱۸۸) سنت ہے۔

روایت صحیح مسلم کی ہے جس کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا اور کہنے والے حضرت
علیؓ خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں حضرت عمرؓ اور حضرت
عثمانؓ کے اس فعل کو بھی وہ سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف
ہے۔ چنانچہ حضرت امام نوویؒ (المتوفی ۷۶۸ھ) اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

هذا دليل ان علياؓ كان معظما لا آثار يروايت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ
عمرؓ و ان حکمہ و قوله سنة و کے آثار کو حکمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حکم اور فعل
امره حق و كذلك ابو بکرؓ خلاف ما کو سنت اور ان کے امر کو حق کہتے تھے۔ اسی طرح حضرت
يکذبه الشيعة عليه۔ ابو بکرؓ کے متعلق بھی وہ یہی ملے رکھتے تھے، جیسا شیعہ
(شرح مسلم ج ۲ ص ۱۸۸) شیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں۔

اگر خلیفہ راشد کے قول اور حکم کے سنت ہونے کے لئے یہ ضروری ہوتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے منقول ہو تو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا یہ حکم یقیناً بدعت ہوتا نہ کہ سنت۔

ثانیاً اگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نصاً ثابت ہونے کی بنا پر ہی حضرات خلفاء راشدینؓ
کا قول و فعل سنت ہو سکتا ہے تو اس میں حضرات خلفاء راشدینؓ ہی کی کیا تخصیص ہے۔ اس معنی
میں تو ہر ایک اذنی مسلمان کی پیروی کنا بھی ضروری ہے جب کہ وہ بتیح سنت ہو۔ اس لحاظ سے
عام مسلمانوں سے اور خصوصاً دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے علیحدہ کر کے حضرات خلفاء راشدینؓ کی سنت کی پیروی

کہنے اور حضراتِ شیعین کی اقدار کرنے کی احادیث کا کوئی نمایاں پہلو واضح نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ آپ نے اپنی سنت کو اور خلفاءِ راشدین کی سنت کو وارِعطف کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں بظاہر مغائرت ہوتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ حضراتِ خلفاءِ راشدین کو شریعت بنانے کا حق کیسے حاصل تھا؟ تو یہ ایک ایسا مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ شارعِ حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مبلغ ہیں نہ کہ شارع، اور اپنے مقام پر ذکر ہو گا، کہ قیاس و اجتہاد کو شریعت نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ ایسے اُمور میں حضراتِ خلفاءِ راشدین کا حکم اور قول و فعل ہمارے لئے نہ صرف حجت ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق سنت ہے اور حضراتِ خلفاءِ راشدین کی بات بھی محض اس لئے حجت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں اُن کی سنت کو چلیوں اور ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس صورت میں حقیقت اطاعت جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اطاعت دراصل خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ چنانچہ نواب صدیق حسن صاحب قزوینی (المتوفی ۱۲۸۱ھ) لکھتے ہیں :

ان ماستہ الخلفاء اللہ اشددون من
بعد فالاعتد بہ لیس الا لاہر لاصل اللہ
علیہ وسلو بالاعتد بہ۔
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جو چیزیں حضراتِ خلفاء
راشدین نے منہن شمرائی ہے، اس کو محض اس لئے اعتد
کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے

(الذین الخلفاء علیہ السلام) (۲۳۵) اخذ کرنے کا حکم دیا ہے۔

باؤ، حضرت عمرؓ نے جو رضوانِ مبارک میں ایک قاری پر مجتمع ہو کر نماز پڑھنے والوں کے عمل کو نعمتِ البدعت سے تعبیر کیا ہے تو اس سے مراد بدعتِ لغوی ہے جو مذہبِ موم نہیں ہے۔ اس سے بدعتِ شرعی ہرگز مراد نہیں جو مذہبِ موم اور تبع ہے (اس کی پوری بحث بسط کے ساتھ اپنے مقام پر بیان ہوگی، انشاء اللہ العزیز)۔ اور اگر حضراتِ صحابہ کرام اسی مذہبِ بدعت کے مرتکب ہوئے اور حضرت عمرؓ نے خلیفہ وقت ہوتے ہوئے بھی ان کو اس قبیح حرکت سے منع نہ کیا اور نہ ہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا تو خلیفہ راشد وہ کیسے رہے؟ اور وہ خود مہدیین

(ہدایت یافتہ) کی فہرست میں کس طرح شامل ہے؟ اور جب خود انہوں نے بدعتِ قبیحہ کی اجابت دے دی یا اس پر سکوت اختیار کر لیا تو سنت کی پاسبانی کس نے کی؟

چوں کفر از کبیرہ بر خیزد و کجا ماند مسلمان

ثالثاً خود امیرِ مانی علامہ برادوی کی ایک تحقیق کی (خلفاء اربعہ کا اتفاق تو حجت ہے مگر ان کی انفرادی

بات اور قول اس پوزیشن میں نہیں ہے) تردید کرتے ہیں :

قال النیر ماوی :- اذا اتفق الخلفاء الاربعة
علی قول کان حجۃ لا اذا انفرد واحد
منہم والحقیق ان الاقتدار لیس ہو
التقلید بل هو غیوۃ - (بل اسلام ص ۲۷۲ مثلاً)
کہ علامہ برادوی کہتے ہیں کہ جب خلفاء اربعہ کسی قول پر اتفاق
کر لیں تو وہ حجت ہو گا کہ ان کا انفرادی قول - حالانکہ تحقیق
یہ ہے کہ اقتدارِ تقلید نہیں ہے، بلکہ اقتدارِ آور ہے، اور
تقلید آور ہے۔

اس عبارت میں علامہ امیرِ مانی نے علامہ برادوی کی یوں تردید کی ہے کہ حضراتِ خلفاء اربعہ میں سے
ہر ایک کا قول قابلِ اقتدار ہے، یہ الگ بات ہے کہ اقتدارِ آور چیز ہے اور تقلید آور - کچھ بھی ہو ان کا منفرد قول
بھی حجت ہے۔ ہمارے نزدیک اقتدارِ اتباع اور تقلید ایک ہی شے ہے غیر مقلدین کے ہاں اقتدار و
اتباع اور چیز ہے اقتقلید آور ہے۔ چنانچہ غلاب صدیقی حسن خان صاحب لکھتے ہیں :

و تقلید عبارت است از قبول رائے
کسیکہ قائم نمیشود بیاں حجت بلا حجت و ازین
با معلوم شد کہ قبول قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم
و عمل بیاں تقلید نیست زیرا کہ قول و فعل او
تقلید کا معنی یہ ہے کہ جس کی رائے حجت ہو اس کی رائے
کو (محض حسن ظنی کی وجہ سے) بلا حجت تسلیم کیا جائے اس سے
معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کو تسلیم
کرنا اور اس پر عمل کرنا تقلید نہیں ہے، اس لیے کہ آپ کا
قول و فعل خود حجت ہے۔

اس لحاظ سے حضراتِ خلفاءِ راشدین میں سے ہر ایک کی بات کو تسلیم کرنا تو تقلید نہ ہو مگر اقتدارِ آور
اتباعِ خیر ہے۔ اس لئے کہ ان کا قول و فعل تسلیم کرنا حسب تصریح جنابِ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
ہمارے لئے لازم ہے، اور خصوصیت سے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اقتدار کے متعلق مستل حدیث

آئی ہے :-

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا ادري
ما بقائى فيكم فاقتدوا من بعدى ابى بكر وعمر
انحضرت صلى اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ میں کیسے
تم میں رہوں گا۔ سو میرے بعد ابوبکر اور عمرؓ کی اقتداء کرنا۔

(ترمذی ج ۲، مشکوٰۃ ج ۲، ابن ماجہ، مسند احمد ج ۵، مشکوٰۃ ج ۲، مسند دہل ج ۳، مشکوٰۃ ج ۲)

قال الحاكم والذہبی صحيح - امام حاکم اور علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

قول الشيخين حجة اذا اتفقا لا يجوز العدول
عنه وان اتفقا الخلفاء الاربعة ايضا
حضرات شیعین کا قول حجت ہے جب دونوں متفق ہو جائیں
تو اس سے عدول جائز نہیں۔ اسی طرح حضرات خلفاء اربعہ کا
حجۃ۔ (منہاج السنہ ج ۲، ص ۱۱۱)

حضرات صحابہ کرامؓ بھی معیارِ حق ہیں اور ان کا اجماع حجت ہے | حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ
والسلام کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر عابد و زاہد، شفیق و پرہیزگار اور کوئی نہیں گزرا۔ میری وجہ ہے کہ اللہ
تعالیٰ نے اپنی دائمی خوشنودی اور رضا کا پروانہ اور سند ان کو ان پاکیزہ الفاظ سے عنایت فرمائی ہے :

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ
وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
اور جو لوگ سب سے پہلے ہجرت کرنے والے، اور وہ
کرنے والے ہیں، اور جو ان کی پیروی کرنے والے ہیں،
نیکی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو چکا ہے۔
رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔

(پہ ۱۱- التوبہ - رکوع ۲) اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ ازل میں تمام سابقین و اولین کو خواہ وہ مہاجرین یا انصار، اور ان کے پوتے
پیرو کاروں کو اپنی ادبی رضا اور خوشنودی کی بشارت دی ہے۔ اسی ارشادِ الہی میں مہاجرین اور انصار کے
سابقین اور لاحقین دونوں گروہوں کو (بلکہ ایک تفسیر کے لحاظ سے تابعین کرام کو بھی وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ) صفات
الہی کی سند مل چکی ہے کہ خدا ان سے راضی ہے، وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے ان کو بھی ہمارے لئے معیارِ حق قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ (المثنویؒ) روایت

کرتے ہیں (اس روایت کے الفاظ میں اگرچہ جنوی اختلاف ہے مگر مفہوم سب کا ایک ہی ہے) کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان بنی اسرائیل تغرقت علی ثلثین و سبعین ملة و تغترق امتی علی ثلاث و سبعین ملة
کہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ چکے تھے اور میری امت
تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی، سب کے سب نکتے دوزخ
میں جائیں گے مگر صرف ایک فرقہ - لوگوں نے آپ سے پوچھا
کہ وہ کونسا فرقہ ہوگا - فرمایا وہ فرقہ ہے جس نے وہ کام کئے
جو میں نے اور میرے صحابہ نے کئے ہیں۔

اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: وہی الجماعة (ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۱۱۸، مستدرک
ج ۱۲۸، ابن ماجہ ج ۲۹۱، اور مشکوٰۃ شریف ج ۱ ص ۱۱۸) یعنی نجات حاصل کرنے والا صرف وہی فرقہ ہے جو
اس جماعت (صحابہ کرامؓ) کا ساتھ دینے والا ہو۔ اور اسلام کی اس جماعت سے کٹ کر الگ نہ ہونے والا
ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جیسے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدینؓ
کی سنت ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے، اسی طرح ما انا علیہ و اھلبائی کے ارشاد کے تحت حضرات
صحابہ کرامؓ کے اقوال و اعمال بھی ہمارے لئے حق کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ما انا علیہ و اھلبائی کا ارشاد فرمایا کہ اپنی ذات بابرکات اور اپنے صحابہ
کرامؓ کی ذوات قدسہ کو حق، اور باطل کے پرکھنے کا معیار بتایا ہے کہ محض کالے کالے نقوش سہی میا نہیں،
بلکہ وہ ذوات بھی معیار حق ہیں جن میں یہ حروف و نقوش، اعمال و احوال بن کر سج گئے ہیں اور اسی طرح
گھل مل گئے ہیں کہ اب ان کی ذوات کو دین سے الگ کر کے اور دین کو ان کی ذوات سے علیحدہ کر کے نہیں
دیکھا جاسکتا۔ ما انا علیہ و اھلبائی کی حدیث سے صاف یہ حضرات صحابہ کرامؓ کی منقبت اور
فضیلت ہی ثابت نہیں ہوتی اور نیز ان کی محض مقتدایت اور مقبولیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اُمت
کے حق و باطل کے لئے ان کی میاری شان بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ محض حق پر ہی نہیں بلکہ حق کے پرکھنے
کی کسوٹی اور معیار بھی بن چکے ہیں، جن سے دوسروں کا حق و باطل بھی کھل جاتا ہے۔ اور ان کا معیار حق و

باطل ہونا صرف قیاسی ہی نہیں بلکہ ما انا علیہ و اھمابی کے صریح ارشاد سے بطور نص ثابت ہے، نہ جیسا کہ باطل اور گمراہ فرقوں نے ان کو برفِ ملامت بنا کر درحقیقت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر کلوخ اندازی کی اور اسلام کی بنیادی حقیقت کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ حضرات صحابہ کرامؓ کی ثقاہت و عدالت، دیانت و امانت، صداقت اور للہیت ایسے مسلم امور ہیں جن پر مدارِ اسلام ہے، اور ان پر جرح و تعدیل کرنے والا دین کی عمارت کو گرتا ہے۔ حضرت، ملا علی نقی قاریؒ کہتے ہیں :

والصحابۃ کلہم عدول مطلقاً
لظواہر الکتاب و سنتہ و اجماع
من یعتد بہ۔ (مرقات ج ۵ ص ۵۵)

حضرت صحابہ کرامؓ سب کے سب مطلقاً عادل اور ثقہ ہیں
کیونکہ قرآن کریم اور سنت اور متحدہ علیہ لوگوں کے اجماع کے
ظاہری الفاظ اور عبارتیں اسی پر دلالت کرتی ہیں۔

امام ابن اثیر عز الدین علی بن محمد الجزری (المتوفی ۷۴۸ھ) کہتے ہیں :

والصحابۃ یساوون سائر الرواة فی جمیع
ذلک الا فی الجرح والتعدیل فانہم کلہم
عدول لا یتطرق الیہم الجرح لان اللہ
عز وجل ورسولہ زکاہم وعدلاہم
و ذلک مشہور لا یحتاج لذکرہ۔

حضرت صحابہ کرامؓ تمام باتوں میں تمام راویوں میں شریک
ہیں مگر جرح و تعدیل میں نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ
سب کے سب عادل اور ثقہ ہیں، اُن پر جرح نہیں کی جا
سکتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے اُن کی
پاکبازی اور تعدیل بیان فرمائی ہے اور یہ ایک ایسی مشہور بات

(اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ ج ۱ ص ۱۷۱)

ہے جس کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

غرضیکہ حضرات صحابہ کرامؓ اُمت کے لئے حق و باطل، خیر و شر، سنت و بدعت اور ثواب و عقاب وغیرہ امور کے پرکھنے کی کسوٹی اور معیارِ حق ہیں۔ جو کام انہوں نے کیا وہ حق اور سنت اور باعثِ نجات ہے، اور ان کا ہر قول و فعل ہمارے لئے ذریعہ فلاح اور وہی ہمارے لئے ترقی اور سعادت کی راہ ہے، اور اس کی خلاف ورزی تباہی اور بربادی پر منتج ہوگی اور بس۔

مشہور غیر مقلد عالم مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑیؒ تحریر فرماتے ہیں :

”اقوال صحابہؓ کے ساتھ استدلال کرنا ٹھیکہ اسلام میں داخل ہے۔“ (ضمیمہ رسالہ اہل حدیث ص ۱۷)

نیز وہ کہتے ہیں :

”اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صحابہؓ کے اقوال میں اقل تو رفع یعنی رسولؐ کی حدیث ہونے کا احتمال قوی ہے، اور اگر کہیں فہم کا دخل ہو تو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روش کی طرف زیادہ نزدیک ہیں، کیونکہ صحابہؓ آپ کی طرز بات اور طرز استدلال کو دیکھتے تھے۔ اور آپ کے گناہ و اشارے سے خوب سمجھتے تھے، اور جتنی باتیں مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہیں ان سے خوب واقف تھے۔ اور بعد کے لوگ ان باتوں سے محروم ہیں۔ اس لئے پھلوں کے اجنبی پر صحابہؓ کے اقوال کو مقدم کرنا لازم ہے، اور صحابہؓ چونکہ ان باتوں میں برابر ہیں اس لئے ان کے اقوال آپس میں ایک دوسرے کو ماننے لازم نہیں۔ بس یہ ہیں اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے کے معنی۔“ (فہم انتہی بلفظ۔ ایضاً ص ۸)۔

اگر حضرات صحابہؓ کرامؓ کا کسی بات پر اجماع و اتفاق ہو جائے تو اس کے حجت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی بدحجت کلام کرتا ہو چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (المتوفی ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

”صحابہؓ کرامؓ کا اجماع واجب الاتیان ہے، بلکہ صحابہؓ کرامؓ کا اجماع قوی تر حجت اور دوسری (غیر منصوص) حجتوں پر مقدم ہے۔“ (اقامۃ الدلیل ج ۳ ص ۱۳)۔

اور حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانیؒ (المتوفی ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں :

ان اهل السنة والجماعة متفقون على ان
اجماع الصحابة حجة (فتح الباری ج ۲ ص ۲۷۱) صحابہؓ کرامؓ کا اجماع حجت ہے۔

حضرات صحابہؓ کرامؓ کے اجماع کے حجت ہونے پر متعدد حوالجات پیش نظر ہیں، مگر ہمارا مقصد لائل کا

۱۔ حضرت صحابہؓ کرامؓ کے تنقید اور جرح سے بالاتر ہونے کے لئے استیعاب ج ۱ ص ۱۷۱، اصابع ج ۱ ص ۱۷۱، تقریر الاصول ج ۲ ص ۲۷۱، فواتح الرحموت ج ۱ ص ۱۷۱، اور مسامحہ ج ۱ ص ۱۷۱ وغیرہ ملاحظہ کریں۔ اور اجماع صحابہؓ اور اقوال صحابہؓ کے حجت ہونے کے لئے : منہاج السنۃ ج ۱ ص ۱۷۱، اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷۱، بیان الفوائد ج ۳ ص ۱۷۱، طبقات نسکی ج ۱ ص ۱۷۱، عمدۃ القاری ج ۳ ص ۱۷۱، کتاب العلم لابن عبد البر ج ۲ ص ۱۷۱ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

استیعاب نہیں بلکہ صرف بطور نمونہ یہ چند عیارتیں مدیہ قارئین کرام کو دی گئی ہیں، جس سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد حضرات صحابہ کرامؓ کی ذوات کو بھی دین کے حق و باطل پہنچنے کا معیار اور مقیاس بنایا گیا ہے۔

اجماع اُمت | حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت اور حضرات صحابہ کرامؓ کے اجماع کے بعد اُمتِ مرحومہ کے اجماع و اتفاق کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اُمتِ مرحومہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے یوں ارشاد فرماتا ہے کہ :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ كُنْتُمْ مَوَدَّةً لِلْمَعْرُوفِ وَنَهْيًا عَنِ الْمُنْكَرِ وَتَوْفِيًّا لِلْعَقْلِ (پک- آل عمران- ۳۴) کہ تم سب اُمتوں سے بہتر اُمت ہو جو بھی گئی انسانوں کی بھلائی کے لئے، تم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منہ کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ تعالیٰ پر۔

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو نہ تو طاقتور اُمت کہا اور نہ دولت مند، بلکہ بہتر اور عملی اُمت کہا۔ اس لئے کہ اس اُمت کا کام دنیا میں نیکی کی تعلیم دینا اور بدی سے روکنا ہے۔ پھر یہ صرف اپنی ہی قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوامِ عالم کی بھلائی اور فلاح چاہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس اُمت سے متعلق ارشاد فرمایا :

انتم شہداء اللہ فی الارض (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱۲) کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین میں گواہ ہو۔ جس چیز کو یہ اُمت خیر کہے گی وہ عند اللہ تعالیٰ بھی خیر ہی ہوگی، اور جس چیز کو شر کہے گی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی شر ہی ہوگی۔ یہ اُمت سرکاری گواہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے

(بقیہ جاشیہ صفحہ گذشتہ) احکام لعلامہ آمدی ج ۲ مثلاً، ازالۃ الخصال ج ۱ ملاحظہ، اور غیر مقلدین حضرات کی مشہور کتاب دیر من رأی ج ۲ مثلاً کا مطالعہ کیجئے۔

نوٹ : اسی جماعت کا ساتھ چھوڑنے والا تارکِ سنت کہلاتا ہے چنانچہ امام حاکم، علامہ ذہبی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں واما ترک السنۃ فالخروج من الجماعۃ (مسندک ج ۱ ملاحظہ) وخص علیہ ج ۱ مثلاً، ونبہاج السنۃ ج ۲ ملاحظہ وازالۃ الخصال ملاحظہ کہ ترکِ سنت اس جماعت سے نکلنے کا نام ہے۔

دن اسی اُمت کی شہادت پر تمام اُمتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، اور اسی اُمت کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ یہ کبھی گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔

اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد امام حاکم (المتوفی ۴۰۴ھ) کہتے ہیں :
 يستدل بها على الحق بالاجماع (مسندکج اصلاً) اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ اجماع محبت ہے۔
 اور علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ الزہبی (المتوفی ۳۴۰ھ) کہتے ہیں :
 تستدل على ان الاجماع حجة - یعنی (ان احادیث سے) اجماع کے محبت ہونے پر
 (تطبیح المسندکج اصلاً) استدلال کیا گیا ہے۔

اور حضرت ملا علی نقاریؒ ان الله لا يجمع امتي على ضلالة (الحديث) کی شرح میں
 لکھتے ہیں :

في الحديث دليل على حقيقة الاجماع - کہ اس حدیث میں اس امر کی دلیل موجود ہے کہ اُمت کا
 (مقات علی المنکوح اصلاً) اجماع حق اور صحیح ہے۔

اُمت کے اجماع کے حق اور صحیح ہونے پر بے شمار دلائل موجود ہیں، اور ارباب اُصول نے اس پر
 سیر حاصل بحث کی ہے۔ چنانچہ مشہور اُصولی شیخ الاسلام علی بن محمد البردوسی الحنفیؒ (المتوفی ۸۴۰ھ)
 تحریر فرماتے ہیں کہ :

فصار الاجماع كاية من الكتاب او حديث متواتر في وجوب العمل والعلم فيكفر جاحداً في الاصل - (اصول بردوسی ج ۳ ص ۳۱)
 اجماع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے قرآن کریم کی آیت یا حدیث متواتر۔ جیسے یہ موجب عمل و علم ہیں، اسی طرح اجماع بھی
 نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس اجماع کا منکر کافر ہوگا۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ :
 والاجماع اعظم الحجج - (المحبتہ ص ۶)

اجماع بہت بڑی حجت ہے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ :

واما اجماع الامة فهو في نفسه حق لا يتجمع به حال اُمت کا اجماع فی نفسہ حق ہے اُمت کبھی گمراہی

الامة على خلافة وكذلك القياس صحيح۔ پر مجتمع نہیں ہوگی اور اسی طرح قیاس صحیح بھی حق اور
(الحسبہ و مثله في معارج الاصول صلا)۔ محبت ہے۔

خير القرون کا تعامل بھی محبت ہے | حضرات صحابہ کرام کے بعد تابعین اور اتباع تابعین کی اکثریت
کام کو بلا تکثیر کرنا یا چھوڑنا بھی ایک محبت شرعی ہے، اور ہمیں ان کی بھی پیروی کرنا ضروری ہے اس
امر کے ثبوت پر متعدد حدیثیں موجود ہیں۔ ہم اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے چند حدیثیں عرض کرتے ہیں۔
حضرت عبداللہ بن مسعود (المتوفی ۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ :

عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال خير الناس قرني ثم الذين يلونهم ثم
الذين يلونهم ثم يجي اقوام تسبق
شهادة ائمتهم وبيعتهم شهادة
(بخاری ج ۱ ص ۳۶۶، والنظاره وسلم ج ۲ ص ۳۹۰ و مسند
طیالسی ص ۳۹، وموارد النظام ص ۵۶۹)۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
کہ بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانہ میں ہیں پھر
ان کے بعد والے اور پھر ان کے بعد والے پھر ایسی
قومیں آئیں گی جن کی شہادت قسم سے، اور قسم
شہادت اور گواہی سے سبقت کرے گی۔

حضرت عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

او صيكم باصحابي ثم الذين يلونهم ثم
الذين يلونهم ثم يفتشوا الكذب حتى
يخلف الرجل ولا يستخلف ويشهد ولا
يستشهد فمن ادا منكم محبوبو حجة الجنة
فليزها الجماعة (الحديث)۔ (مسند ابو داؤد
طیالسی ص ۳، مستدرک ج ۱ ص ۱۱۱۱ قال الحاكم والذهبي
حلی شرطهما۔ مثله في المشكوة ج ۲ ص ۵۵۲ وفي المقات
رواه النسائي واسناده صحيح وموارد النظام ص ۵۶۸)

میں تمہیں اپنے صحابہ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں
(کہ ان کے نقش قدم پر چلنا) پھر ان کے بارے میں
جو ان سے ملتے ہیں، پھر ان کے بارے میں جو ان
سے ملتے ہیں، پھر جو بوط عام ہو جائے گا یہاں تک
کہ آدمی بلا قسم دیتے بھی قسم اٹھائیں گے اور بلا گواہی
طلب کئے بھی گواہی دیں گے۔ سو جو شخص جنت
کے وسط میں داخل ہونا چاہتا ہے تو وہ اس جماعت
کا ساتھ نہ چھوڑے۔

حضرت عمر بن حصین (المتوفی ۳۵ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خير الناس قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ثم تأتي اقوام يحطون الشهادة قبل ان يستلوهما (متدرک ج ۳ ص ۱۷۷ واللفظ قال الحاكم والذهبي على شرطهما وترمذی ج ۲ ص ۱۷۷)

کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب لوگوں سے بہتر قرن میرا ہے، پھر ان کا جو اس سے ملے ہیں، پھر وہ جو اس سے ملے ہیں پھر ایسی قومیں آئیں گی جو اس سے قبل کہ ان سے گواہی طلب کی جائے وہ گواہی دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

ان کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :

ويعفون ولا يؤمنون ويفشوا فيهم السمن - (ترمذی ج ۲ ص ۱۷۷)

اور خیر القرون کے بعد آئے واسے لوگ خیانت کریں گے، اور امانت میں ان پر اعتبار نہیں کیا جائے گا اور ان میں مٹایا خوب ظاہر ہوگا۔ (یعنی فکر آخرت سے غافل اور حلال و حرام سے بے نیاز ہو کر خوب کمائیں گے۔)

اور ان کی ایک روایت میں یوں آتا ہے :

وينذون ولا يؤفون - (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۸۷)

ان روایات سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیر القرون کے بعد جو لوگ پیدا ہوں گے، ان میں دین کی وہ قدر و عظمت نہ ہوگی جو خیر القرون میں تھی۔ جھوٹ ان میں بکثرت رائج ہو جائے گا۔ بات بات پر بلا طلب کے قسم اٹھاتے پھر اس کے اوبے تماش گواہی دیں گے۔ امانت کی پروا نہ کریں گے اور خیانت ان کا پیشہ ہوگا۔ خوف خدا اور فکر آخرت سے ایسے بے نیاز ہوں گے کہ کما کما کہ خوب فریب ہوں گے اور پیٹ کی فکر کی وجہ سے حلال و حرام کی تمیز ہی باقی رہے گی۔ نذریں اور مینتیں مان تولیں گے مگر ان کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں گے۔ الغرض ظاہری اور باطنی، قوی اور فعلی ہر قسم کے معاملات میں انکی دینی زندگی میں انحطاط ہی انحطاط ہوگا۔ ظاہر امر ہے کہ امانت و صداقت و حق پسندی کا جو جذبہ خیر القرون کے لوگوں میں تھا، وہ بعد والوں میں نہ تھا۔ کیونکہ خیر القرون کے بعد جھوٹ، خیانت اور جھوٹی گواہی کے

علاوہ ایسی ایسی بدعات اور خرافات نکالی گئیں کہ دین اسلام مظلوم ہو گیا اور بدعت نے سنت کی جگہ لے لی۔ بلاشبہ خیر القرون میں بھی فتنوں نے سر اٹھایا تھا مگر اولاً وہ بعد کے پیدا ہونے والے دینی اور دنیوی فتنوں سے بہت کم تھے۔ وثانیاً خیر القرون کی اکثریت نے ان کو قبول کرنے سے سراسر انکار کر دیا، بلکہ ان فتنوں کو مٹانے کے لئے انہوں نے اپنی عزیز جانیں بھی قربان کر دیں اور بعد کو آنے والوں میں یہ جذبہ نسبتاً بہت ہی کم رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ :

سأل رجل النبي صلى الله عليه وسلم ائى الناس خير قال القرن الذى انا فيه ثم الثانى ثم الثالث (مسلم ج ۲ ص ۳۱۷)۔
ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کون لوگ بہتر ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ وہ قرن بہتر ہے جن میں میں ہوں پھر دوسرا قرن بہتر ہے اور پھر تیسرا۔

حضرت امام محی الدین ابو زکریا عینیؒ بن شرف النوویؒ (المتوفی ۷۸۰ھ) خیر القرون کی حدیث کی شرح کرتے ہوئے قرن کے متعدد معانی بیان کرتے ہیں، اور پھر آخر میں لکھتے ہیں :

والصحيح ان قرنه صلى الله عليه وسلم صحيح بات یہ ہے کہ آپ کے قرن سے حضرت صحابہ کرام کا قرن اور دوسرے قرن سے تابعین کا قرن اور میرے قرن سے تابعین کا قرن مراد ہے۔
والصحابۃ والثانی التابعون والثالث تابعوہم۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۳۱۷)۔

اسی سابق بحث سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ خیر القرون تین قرن ہیں اور انہی کو قرون ثلاثہ یا قرون مشہود کہا جائیگا اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ پہلے قرنی سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے سے تابعین اور تیسرے سے تابعین مراد ہیں۔

مشہور مؤرخ اسلام علامہ عبدالرحمن بن خلدون المغربیؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں :

هذا هو الذى ينبغي ان تحمل عليه افعال السلف من الصحابة والتابعين فعمد خيار الائمة واذا جعلناهم عرضة القرح فمن ائى خيريت پر مناسب ہے کہ سلف کے اعمال کو حمل کیا جائے جو حضرات صحابہ کرام اور تابعین تھے وہ امت کی بہترین جماعت تھی اور جب ہم نے ان کو بدھ ملامت بنا دیا تو پھر

الذی یختص بالعدالة والتبى صلی اللہ علیہ وسلم یقول خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم مرتین اولئک ثم یفشیوا الکذب فجعل الخیرة وهی العدالة مختصة بالقرن الاول والذی یشیء فایاک ان تعود نفسك اولسانک التعرض لاحد منهم۔

عدالت کے ساتھ کون مختص ہوگا؟ حالانکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، لوگوں کا بہترین قرن پہلا قرن ہے۔ پھر وہ ہے جو اس سے ملتا ہے، دو مرتبہ فرمایا تین مرتبہ، پھر چھوٹا رائج ہو جائے گا۔ آپ نے ان کی بہتری کو عدالت میں منحصر کر دیا ہے، اور وہ قرن اول اور ثانی، (اور ثالث) کے ساتھ خاص ہے۔ خبردار ان میں سے کسی کے متعلق دل میں بُرا خیال اور زبان پر بُرا لفظ نہ لانا۔

(مقدمہ ص ۲۱۸)

اور یہی علامہ عدالت کی تفسیر کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں :

العدالة وهی وظیفه دینیة۔ عدالت دین کا ایک وظیفہ ہے اور دین کی ایک عمدہ (مقدمہ ص ۲۲)

خصلت ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ خیر القرون کے تین قرن ہیں اور ان قرون سے مراد حضرات صحابہ کرامؓ تابعین اور تبع تابعین کا قرن ہے تو طبقات رجال کی کتابوں میں اس کی تصریح ملتی ہے کہ تبع تابعین کا دور ۲۲۰ھ تک رہا ہے اور یہی وہ حضرات ہیں جن کے نقش قدم پر چل کر ہمیں کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اور وہی اس اُمت مرحومہ کا بہترین گروہ ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فریق مخالف کے وہ اعتراضات جو خیر القرون کے مفہوم پر ان کی طرف سے وارد ہوتے ہیں، یہاں ہی عرض کر دیں اور ایک طائرانہ نگاہ ان پر بھی ڈال لیں کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

پہلا اعتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عمران بن حصینؓ کی روایتوں میں جو سلم وغیرہ میں ہیں، شک کے الفاظ آتے ہیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرن ذکر کئے اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ تین قرن ذکر کئے۔ اب کیسے معلوم ہو کہ تین قرن خیر القرون ہوں گے یا چار (محصّل) ان کے اصل

بعض الفاظ بھی ملاحظہ کر لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں :

”پس قرونِ ثلاثہ کا قاعدہ بروایاتِ صحیحہ مشکوک ٹھہرا۔“ (ملفوظ انوارِ سامعہ ص ۱۸)

جواب :

ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عمران بن حصین اور حضرت عائشہ کی جو صحیح روایات پیش کی ہیں ان میں علی التبعین تین قرن ہی ذکر کئے گئے ہیں۔ چوتھے قرن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعود کی روایت بخاری شریف میں متعدد جگہ آتی ہے (مثلاً ج ۱ ص ۳۱۱ ج ۱ ص ۵۱۵ ج ۲ ص ۱۵۲ ج ۲ ص ۱۸۵)۔ نہ ان میں شک کے الفاظ آتے ہیں اور نہ چوتھے قرن کا ذکر ہے۔ امام مسلمؒ نے جو روایت حضرت ابن مسعود کی اصول میں پیش کی ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ البتہ امام مسلمؒ نے جو روایات متابعات میں اور درجہ دوم میں پیش کی ہیں، جن میں ایک روایت حضرت ابن مسعود اور دوسری حضرت ابوہریرہ کی اور تیسری حضرت عمران بن حصین کی ہے ان میں شک کے الفاظ آتے ہیں۔ لیکن امام مسلمؒ کا قاعدہ ہی الگ ہے۔ وہ اپنے مقدمہ مسلمؒ میں لکھتے ہیں کہ ”ہم درجہ اول میں صرف وہ روایات پیش کریں گے جن کے راوی حفظ اور اتقان میں مسلم ہوں گے اور وہ چنداں وہم اور خطا کا شکار بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ اور درجہ دوم میں ایسے راویوں کی روایتیں ہوں گی جو حفظ و اتقان میں بھی پیچھے راویوں کے ہم پلہ نہ ہوں گے نیز ان سے خطا اور وہم بھی صادر ہوا ہوگا۔“ امام مسلمؒ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے تین قرن والی روایت بالکل صحیح ہے اور جن روایتوں میں چار قرون کا ذکر ہے وہ راویوں کے وہم اور ان کی غلطی پر محمول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام مسلمؒ ان شک والی روایتوں کے بعد حضرت عائشہؓ کی تین قرن والی روایت پیش کر کے اُس پر مہر لگاتے ہیں، کہ صحیح تین ہی قرن ہیں۔ لہذا قرونِ ثلاثہ کا تعین صحیح روایات سے ثابت ہوا، اور شک والی روایتیں راویوں کے وہم اور خطا پر محمول ہوں گی۔ علاوہ بریں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ امام مسلمؒ نے جو روایتیں متابعات میں اور درجہ دوم میں نقل کی ہیں، ان میں بعض میں یہ الفاظ آتے ہیں : واللہ اعلم اذکر الثالث ام لا۔“ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپ نے (اپنے قرن کے بعد) تیسرے قرن کا ذکر کیا ہے یا نہیں کیا؟

اور بعض میں یوں آتا ہے : فلا ادری اقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد قرنہ مرتین او ثلاثا۔ ”مجھے معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے قرن کے بعد دو قرنوں کا ذکر کیا، یا تین کا؟۔ بخاری میں حضرت عمرانؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی لاعلمی سے جاننے والوں کی روایات پر جن میں حضرت ابن مسعودؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ ہیں) مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا جو اپنے حفظ و اتقان صحیح اور پختہ علم کے مطابق وثوق کے ساتھ صرف تین قرنوں کا ذکر فرماتے ہیں اور ان کی روایات میں کوئی نقص شک اور شبہ کا بھی نہیں ہے۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ جو راوی اپنی لاعلمی کا ذکر کرتے ہیں، اُن کی روایات کو لے کر تین قرنوں کے قاعدہ کو مشکوک ٹھہرایا جا رہا ہے، اور وثوق و اعتماد سے صرف تین ہی قرن بیان کرنے والوں کی صحیح روایات کی طرف دھیان ہی نہیں کیا جاتا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چہیں کنند

دوسرا اعتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ قرن واقع ہوتا ہے، اور یہ بہت معانی میں مشترک ہے۔ قرن، سید القوم کو بھی کہتے ہیں، کثافتی القاموس۔ اور بعضوں نے کہا، قرن زمانہ ہے اور بعضوں نے کہا مکتبہ، پھر اُن میں بھی اختلاف ہے۔ دس برس یا پالیس یا ستر یا سو، یا ایک سو اسیس الخ۔ (انوار ساطعہ منہ بلنظر)۔

جواب :

مولوی صاحب کی بڑی نوازش ہے کہ انہوں نے قرن کے معنی قاموس سے سینک اور زلف سکے نہیں نقل کر دیئے، ورنہ اُن کا کوئی کیا بگاڑ لیتا؟ مگر یہ اُن کی ایک اصولی اور کملی غلطی ہے کہ وہ لفظ قرن کی تین میں سے کسی قاموس کی طرف دھڑکتے ہیں اور کہیں بعضوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرا سی تکلیف گوارا کرتے، اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی طرف مراجعت کرتے تو خود بخود اُن کا وہم مُردہ ہو جاتا، اور خود اُن کو اقرار ہے کہ محدثوں میں یہ ٹھہرا ہوا ہے کہ بعض حدیثیں شرح ہوتی ہیں بعض حدیث کی (بلنظر انوار

باطحہ ۲) مسلم کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ ایک سال کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا: "سب سے بہتر قرن وہ ہے جس میں میں ہوں اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا"۔ یہ جواب آپؐ نے اسی الناسِ خیر (کہ کون لوگ بہتر ہیں؟) کے سوال پر ارشاد فرمایا تھا۔ اس صحیح اور صریح روایت سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ آپؐ نے خیریت کو تین قرنوں میں منحصر کر دیا اور صرف ثَم کے ساتھ درج بدرج خیریت کی تین قرنوں میں تنصیص اور تخصیص کر دی ہے۔ اور دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آپؐ نے قرن کے معنی سید القوم نہیں کئے کہ ہمیں قاموس وغیرہ کی ورق گردانی کرنی پڑے، بلکہ آپؐ نے قرن کے معنی بہترین انسانوں کے ایک طبقہ سے کئے ہیں اور اس معنی میں پہلا قرن حضرات صحابہؓ کا، دوسرا تابعینؓ کا اور پھر تیسرا تبع تابعینؓ کا قرن ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ (المتوفی ۳۷ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فِيَغْزُو فَنَاشِمُ مِنَ النَّاسِ
فَيَقَالُ هَلْ فِيكُمْ مِنْ صَاحِبِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُونَ نَعَمْ فَيَفْتَحُ لَهُمْ ثَمٌّ
يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فِيَغْزُو فَنَاشِمُ مِنَ النَّاسِ
فَيَقَالُ هَلْ فِيكُمْ مِنْ صَاحِبِ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُونَ نَعَمْ فَيَفْتَحُ لَهُمْ ثَمٌّ
يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ فِيَغْزُو فَنَاشِمُ مِنَ النَّاسِ
فَيَقَالُ هَلْ فِيكُمْ مِنْ صَاحِبِ أَصْحَابِ
رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُونَ نَعَمْ
فَيَفْتَحُ لَهُمْ ثَمٌّ۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۷۷ و مسلم ج ۲ ص ۲۷۷)۔

لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا، جس میں لوگوں کی ایک
جماعت جہاد کرے گی۔ کہا جائے گا کہ کیا تم میں کوئی صحابی
ہے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ سو ان کی وجہ سے ان کو فتح نصیب
ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ ایک گروہ جہاد
کرے گا۔ کہا جائے گا، کیا تم میں کوئی تابعی ہے؟ وہ
جواب دیں گے ہاں۔ سو ان کی برکت سے کلمیابی
حاصل ہوگی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا، کہ ایک
طائفہ جہاد کرے گا۔ کہا جائے گا، کیا تم میں کوئی تبع
تابعی ہے؟ وہ بولیں گے، ہاں! سو ان کی بدولت
فتح و کامرانی ہوگی۔

حضرت عائشہؓ کی سابق روایت سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح اور آشکارا ہو جاتی ہے کہ

خیر القرون کا معنی اور مفہوم کوئی مجمل اور گول مول حقیقت نہیں ہے بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق خیر القرون کا مفہوم قرن اول، ثانی اور ثالث کے اندر بند اور منحصر ہے۔ اور قرن کا معنی اور مفہوم بھی مجمل نہیں بلکہ اس سے انسانوں کا بہترین طبقہ مراد ہے اور اس لحاظ سے حضرت ابوسعید الخدریؓ کی حدیث کے پیش نظر خیر القرون کا مفہوم حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ میں بند ہے، نہ تو ہمیں قرن سے دس سال مراد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ چالیسؓ نہ سترؓ اور نہ سوؓ وغیرہ۔ باقی جن لوگوں نے قرن کے یہ معانی کئے ہیں، تو صحیح اور صریح حدیث کے ہوتے ہوئے اُن کی بات قابل التفات ہی نہیں ہے۔

تنبیہ: حضرت ابوسعید الخدریؓ کی ایک روایت میں جس کو امام مسلمؒ نے درج دوم میں بطور متابعت پیش کیا ہے، چار طبقوں کا ذکر آیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

وفی رواية مسند ذکوة طبقة رابعة وهي مسلم کی ایک روایت میں چوتھے طبقہ کا ذکر بھی آیا ہے

رواية شاذة واكثر الروایات يقتصر مگر وہ روایت شاذ ہے، اور اکثر روایات میں صرف

على الثلاثة۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۷۷)۔ تین ہی طبقوں کا ذکر آیا ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ صحیح روایات میں صرف تین ہی طبقوں کا ذکر ہے جو حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے طبقات ہیں۔ چوتھے طبقہ کا ذکر جس روایت میں آیا ہے وہ حضرات محدثینؓ کرامؓ کے نزدیک معلول اور شاذ ہے۔ اور یہ اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ شاذ روایات کو لے کر اس کی وجہ سے صحیح روایات کو معلول نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اور شاذ روایت خود متردک اور ناقابلِ احتجاج ہوگی۔ (دیکھئے توجیہ النظر ص ۲۱۱ وغیرہ)۔

تیسرا اقتراض :

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں کہ: کوئی یہ نہ سمجھے کہ قرونِ اولیٰ میں جو کچھ ہوگا سب خیر ہوگا اس لئے کہ تمام بدعتیں زور و ارجار و خروج و دفع وغیرہ سب قرونِ ثلاثہ ہی میں پیدا ہوئیں اور اوقات خیر القرون میں ہونے کے سبب ان کو کوئی اہل سنت جماعت، جماعت خیر نہیں کہتا (بلفظ انوارِ سلطنت ص ۲۹)۔

اور مفتی احمد یار خان صاحب نے تو کمال ہی کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: یہ مطلب نہیں کہ ان تین زمانوں میں جو بھی کام ایجاد ہوا، اور کوئی بھی ایجاد کرے وہ سنت ہو جائے۔ یہاں سنت ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے۔ ورنہ مذہب جبریرہ اور قدریہ زمانہ تابعین میں ایجاد ہوا، اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قتل اور حجاج کے مظالم ان ہی زمانوں میں ہوئے۔ تو کیا معاذ اللہ ان کو بھی سنت کہا جائے گا؟ (بلفظ جار الحق وزہق الباطل ص ۲۱)۔

جواب: یہ دونوں معترض صاحبان خود ایک اصولی غلطی کا شکار ہیں، اس لئے وہ دُور انداز کار باتیں بنا کر ایجادِ بدعات کا چور و رواڑہ تلاش کرتے ہیں۔ ان دونوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ خیر القرون کی احادیث میں قرن سے مراد زمانہ ہے اور خیر القرون سے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور تبع تابعین کے عین زمانے مراد ہیں، جب ہی تو ان کو جبریرہ اور قدریہ کے فرقوں کا اور خارجیوں اور رافضیوں کے گروہوں کا اور حضرت امام حسینؑ کی شہادت اور حجاج کے مظالم کا قصہ چھیڑنا پڑا کہ یہ سب کام ان تین زمانوں میں ہوئے ہیں، حالانکہ ان کو کوئی بھی سنت نہیں کہتا، اور خیر القرون کی حدیث سے استدلال کرنے والے یا تو ان بدعات اور مظالم کو بھی سنت کہیں اور یا اس حدیث سے استدلال ہی نہ کریں، تاکہ ہمارے لئے بدعات کی ایجاد میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے اور ہم جس چیز کو چاہیں سنت یا کم از کم بدعت حسنہ کا غلاف پہنا کر اس پر عمل کرتے رہیں۔ لیکن انہوں نے اس امر پر مطلقاً غور نہیں کیا کہ اگرچہ لغت میں قرن کے جہاں اور معنی بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک معنی زمانہ بھی ہے، اس سے انکار نہیں ہے، مگر سوال یہ ہے کہ جتنا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرن کا خود کیا معنی اور مفہوم بیان فرمایا ہے۔ سو آپ نے صحیح روایات میں یہ پڑھا کہ آپؐ نے قرن کا معنی نہیں کیا، بلکہ قرن کا معنی آپؐ نے اہل زمانہ کیا ہے۔ زمانہ اور اہل زمانہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور اہل زمانہ کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ انساؤں کا وہ طبقہ جو ایک زمانہ میں اکٹھا رہے، اور وہ قرنِ اول میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، قرنِ ثانی میں

لے علامہ فیومی، مصباح المنیر میں لکھتے ہیں القرن الجلیل من الناس، زجاج قرن کا معنی اہل کل مدۃ کان فیہا نبی أو طبقۃ من اہل العلم کرتے ہیں۔ صاحب مجمع البحار قرن کا معنی اہل کل زمان کرتے ہیں (بقیہ صفحہ ۵۱)

تابعین اور قرن ثالث میں تبع تابعین ہیں۔ اور ان روایات کی تشریح میں امام نووی اور علامہ ابن خلدون کی عبارتیں بھی نقل کی جا چکی ہیں کہ قرن اول سے حضرات صحابہ کرام اور ثانی سے تابعین اور ثالث سے تبع تابعین کے پاک نفوس اور خود ان کی برگزیدہ ہستیاں مراد ہیں۔ اور اگر احادیث پر معمولی غور بھی کر لیا جاتا تو معاملہ سہل ہو جاتا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ سائل نے ان الفاظ سے سوال کیا تھا ائى الناس خير؟ کون لوگ بہتر ہیں؟ سائل نے اہل زمانہ کا سوال کیا ہے زمانہ کے متعلق سوال نہیں کیا۔ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ بہترین قرن میرا ہے پھر ثانی اور پھر ثالث۔ یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ سائل تو ائى الناس خير کہتے ہوئے اہل زمانہ کی خیریت پوچھتا ہو اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کو زمانہ کی خیریت بتاتے ہوں۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ یہ کیا قصہ ہوا؟ بخاری کی ایک روایت میں خیر الناس قرنی آیا ہے اور دوسری میں خیر کہ قرنی آیا ہے، اور سلم وغیرہ میں خیر امتی قرنی آیا ہے۔ یہ تمام روایات آفتاب نیم روز کی طرح اس پر دلالت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زمانہ کی خیریت نہیں بیان فرمانا چاہتے بلکہ الناس، کھ اذ امتی (کہ لوگوں میں بہتر تم میں بہتر اور میری امت میں بہتر) سے اہل زمانہ کی خیریت بیان فرماتے ہیں۔ اور حضرت عمرؓ کی یہ روایت بھی نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہ کے متعلق پھر ان کے بعد والوں کے متعلق اور پھر ان کے بعد آنے والوں کے متعلق وصیت کرتا ہوں (کہ انکی پیروی کرنا) یہ تو نہیں فرمایا کہ میں صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ کے بارے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اس زمانہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تین زمانوں کی پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان تین زمانوں میں جو اہل زمانہ تھے، ان کی پیروی کا حکم دیا ہے اور وہ حضرت صحابہ کرام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ابن حجر اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی قرن کا معنی اہل زمانہ واحد متغایب الہ

سے کرتے ہیں۔ دلیل الطالب ص ۸۴۶ و ۸۴۷ اور صاحب المطامع معنی کرتے ہیں: القرن امة هلكت

فلم یبق منهم (ایضاً ص ۸۴۸)

اور تابعین اور تبع تابعین کی ذوات اور ان کی ہستیاں تھیں۔ باقی صحابی کی تعریف واضح ہے، اس کی تشکیح کی ضرورت ہی نہیں۔ اور تابعی وہ ہوتا ہے جس نے صحابی کی اتباع کی ہو۔ اور تبع تابعی وہ ہوتا ہے جس نے تابعی کی اتباع کی ہو۔ اگر تبع تابعی نے تابعی کی اتباع نہ کی، اور تابعی نے صحابی کی اتباع نہ کی تو وہ برگز تبع تابعی اور تابعی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ جیسا کہ صحابی وہ ہے جس نے بحالت ایمان تارک آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی نہ چھوڑی ہو۔ جو آپ کے طریقے سے ہٹ گیا وہ صحابی نہ رہا بلکہ مرتد اور منافق کہلایا۔ اس بحث کو پیش نظر رکھ کر مولوی عبدالستیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھئے کہ وہ کونسا صحابی یا تابعی یا تبع تابعی تھا جس نے جبرہ اور قدریہ کے فرقے ایجاد کئے اور رفض و خروج کی بدعت ایجاد کی۔ وہ کونسا تابعی اور تبع تابعی تھا جس نے امام حسینؑ کو شہید کیا، اور حجاج کو مظالم کی اجازت دی؟ بلاشبہ یہ اور ان سے بڑھ کر بدعات اور مظالم ان زمانوں میں ظاہر ہوئے۔ لیکن خیر القرون زمانے نہیں کہ ان زمانوں میں جو بھی ایجاد ہو ان کی پیروی کی جائے۔ بلکہ خیر القرون ان زمانوں میں رہنے والوں کا نام ہے اور وہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین ہیں۔ اور نہ تو انہوں نے بدعات ایجاد کیں اور نہ مظالم کئے اور ہمیں ان کی پیروی کا حکم ہے۔ باقی جو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جادۂ مستقیم سے ہٹ گیا، نہ وہ صحابی رہا اور نہ تابعی اور نہ تبع تابعی، اور ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کے برگز پابند اور مکلف نہیں بلکہ ان کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔ باقی رہی اجتہادی غلطی تو وہ محل نزاع سے خارج ہے۔ مولوی عبد الستیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب کی یہ ایک اصولی غلطی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے خیر القرون کی تفسیر غلط سمجھی اور غلط کی اور یہ نہ سمجھے کہ ہم خود غلط کار ہیں۔ سچ ہے ع

میں الزام ان کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا

مفتی احمد یار خان صاحب نے خیر القرون کے مفہوم پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں سنت ہونے کا ذکر ہی کہاں ہے؟ سبحان اللہ تعالیٰ کیا یہی نزالی اور عجیب مفتیانہ تحقیق ہے۔ اگر جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صرف اتنا ہی ارشاد فرما دیتے کہ میرے صحابہؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کی پیروی کرنا اور اس جہمت کا ساتھ نہ چھوڑنا تو یہ بھی آپ کی سنت ہی ہوتی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ کی روایت میں یہ الفاظ نقل کئے جا چکے

ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے :

اوھیکد باصحابی ثمة الذین یلوفھم
ثم الذین یلوفھم الی ان قال فیلزم
الجماعة۔
ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں اپنے صحابہؓ کے بارے میں وصیت
کرتا ہوں، پھر تابعینؓ اور پھر تبع تابعینؓ کے بارے میں۔
اس جماعت کا ساتھ نہ چھوڑنا۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کی جماعت کو لازم پکڑنے اور
اس کو نہ چھوڑنے کی وصیت اور ضروری حکم فرماتے ہیں، اور مفتی صاحب کہتے ہیں کہ اس میں سنت کا ذکر ہی
کہاں؟ شاید مفتی صاحب کی یہ تحقیق ہو کہ سنت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور تاکید ہی حکم (وصیت) کا
نام نہیں ہے بلکہ لفظ سنت ہو تو تب ہی سنت کا اثبات ہوگا ورنہ نہیں۔

یہ تو مفتی احمد یار خان صاحب کی تحقیق تھی۔ اب مولوی عبدالستیع صاحب کی بھی سینے۔ وہ خیر القرون کی
احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں : "ان روایتوں میں کسی جگہ بدعت اور احداث کا ذکر نہیں (بلفظ انوار
ساطعہ ص ۷۷)۔ یہ بھی عجیب استدلال ہے۔ ان روایات میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، لیکن ان میں
اس کا ذکر تو ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کی جماعت کا
دامن پکڑنے کی وصیت فرمائی ہے، اس لئے کہ یہ حضرات صحیح معنی میں متبع سنت اور اللہ تعالیٰ اور اس کے
رسول برحق کی مرضی کو حاصل کرنے والے اور ان کی مخالفت سے ڈرنے والے ہیں، اور دین پر عمل کر اُمت
کے لئے ایک بہترین عملی نمونہ ہیں، اور دوسری روایات میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
ارشاد فرمایا کہ :

ایاکم ومحدثات الامور۔ کل محدثة بدعة
کل بدعة ضلالة۔ من احدث فی امرنا هذا
مالیس منه فهو رد۔
جو تم نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے سے۔ ہر نئی چیز بدعت ہے
ہر بدعت گمراہی ہے جس نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد
کی تو وہ مردود ہوگی۔

اور ان روایات میں بدعات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خیر القرون کی حدیث سے اتباع
کے متعلق وصیت کرتے ہوئے آپ نے سنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین فرمائی ہے کہ سنت اس راستہ کا نام

ہے جس پر یہ اکابر عامل رہے ہیں، اور بدعات کی تردید کی احادیث میں اس امر کو مبرہن کیا گیا ہے کہ خیر القرون کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا، جس کا تعلق دین سے ہو تو وہ بدعت بھی ہے اور مردود بھی۔ خیر القرون کے مفہوم سے اتباع کا حکم دیا اور ایسا کہ وحد ثات الامور سے اجتناب کا۔ کیا خوب کہا گیا ہے

وبضدھا تتبین الاشیاء

باقی رہا یہ سوال کہ ان روایتوں میں بدعت اور احداث کا ذکر نہیں، تو نہ ہی جو چیز ان احادیث میں بیان کی گئی ہے وہ ان سے اخذ کر لو، اور جو چیز دوسری احادیث میں بیان ہوئی ہے وہ ان سے لے لو کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی سے

ترے زندوں پر سارے کھل گئے اسرار دیں ساقی
ہو! علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین ساقی

چوتھا اعتراض :

مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفا میں تحریر فرماتے ہیں کہ خیر القرون میں قرن اول آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات پر اور قرن ثانی حضرت عمرؓ کی وفات پر اور قرن ثالث حضرت عثمانؓ کی وفات پر ختم ہو گیا اور حضرت عثمانؓ کی شہادت ۳۵ھ کو ہوئی ہے، اور مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری (المتوفی ۱۲۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ مبنی خیر القرون کے نہایت موزوں اور چسپاں ہیں، اسلام کی شوکت جہی تک خوب رہی، پھر غارتگی شروع ہو گئی، اور خیریت قرون ثلاثہ کی کم ہو گئی۔ (محصلہ انوار ساطعہ ص ۱۷۱)۔

جواب :

حضرت شاہ صاحب کی عبارت سے یہ مطلب اخذ کرنا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کی عقائد اور اعمال میں پیروی کرنا خیر القرون کے مخالف ہے یقیناً اور قطعاً باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ پہلے صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کی پیروی بھی اُمت کے لئے لازم قرار دی گئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ

و سلم نے اس کے بارے میں وصیت فرمائی ہے۔ یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحبؒ انکی پیروی اور اتباع کو خیر القرون کے تعامل کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وثالثاً حضرت شاہ صاحبؒ تو ازالۃ الخفاء میں خلافت منظمہ اور خلافت علیٰ منہاج النبۃ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے یہ ارقام فرماتے ہیں کہ کمال خیریت جس میں نبوت و رسالت کی کما حقہ ٹھلک تھی وہ صرف حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک ہی رہی ہے اور اس کے بعد کمال خیریت باقی نہیں رہی اور خلافت منظمہ کی جگہ خلافت غیر منظمہ نے لے لی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نفس خیریت بھی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ پہلے قرن یہی خیریت دوسرے میں نہ تھی اور دوسرے جیسی خیریت تیسرے قرن میں نہ تھی۔ مع ہذا فی اجماع قرون و خیر القرون ہی تھے۔ وثالثاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق ہی یہی ہے کہ وہ خیر القرون کو حضرت عثمانؓ کی شہادت پر ختم سمجھتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسرے دلائل اور صحیح احادیث کے پیش نظر دیگر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ وغیرہم کی پیروی کو ضروری نہیں سمجھتے، یا ان کی اتباع کو باعثِ نجات تصور نہیں فرماتے، یا عقیدہ و عمل میں ان کی اتباع کے علاوہ کسی اور کی اتباع کو صحیح خیال فرماتے ہیں خود حضرت شاہ صاحبؒ اپنی مایہ ناز کتاب میں ارقام فرماتے ہیں :

اقول الفرقۃ الناجیۃ ہما الأخذون فی
العقیدۃ والعمل جمیعاً بما ظہر من الکتاب
والسنة وجوی علیہ جمہور الصحابة
والتابعین الی ان قال وغیر الناجیۃ کل فرقۃ
انتحلّت عقیدۃ خلاف عقیدۃ السلف او
عمل دون العمل (جہاد البانقرض فی شفاطین مصر)
میں کہتا ہوں کہ فرقہ ناجیہ صرف وہی ہے جو عقیدہ اور عمل
دونوں میں کتاب و سنت کی اور جس پر جمہور صحابہ کرامؓ
اور تابعینؓ کا بندہ تھے پیروی کرے (پھر آگے ارشاد
فرمایا) اور غیر ناجی ہر وہ فرقہ ہے جس نے سلف کے عقیدہ
کے خلاف کوئی اور عقیدہ یا ان کے عمل کے خلاف کوئی اور
عمل اختیار کر لیا۔

اس عبارت کو بار بار پڑھتے اور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت شاہ صاحبؒ تو صرف اس فرقہ کو ناجی تسلیم کرتے ہیں جو عقیدہ اور عمل دونوں میں سلف یعنی حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ عظام کی پیروی کرتا ہو اور فرماتے ہیں کہ ان کے عقیدہ اور عمل کے خلاف جو عقیدہ یا عمل کسی نے اختیار کیا وہ یقیناً غیر ناجی ہوگا

اور دوسرے مقام پر اس فرقہ ناجیہ اور اہل حق کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :

فاخذوا باتبعون احادیث النبی صلی اللہ علیہ
وسلم واثار الصحابة والتابعین والمجتہدین
(عمرہ اللہ بالفرج اٹلا ومثله فی الانصاف ص ۳) کی ہے۔

مشہور ائمہ مجتہدین میں حضرت امام ابو حنیفہ (المتوفی ۱۵۰ھ) تابعی ہیں اور دیگر ائمہ مثلاً حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ تبع تابعین میں شامل ہیں۔ غرضیکہ حضرت شاہ صاحبؒ حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کی عقیدہ و عمل دونوں میں اتباع کو نجات کا ذریعہ اور اس کی علامت اور نشانی بتاتے اور ان کی خلاف ورزی کو باعث ہلاکت اور سبب عدم نجات فرماتے ہیں۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے نزدیک حضرات خلفاء راشدینؓ کے علاوہ جمہور صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ وغیرہم کی اتباع بھی ضروری ہے اور نجات و فلاح انہی کی پیروی میں منحصر ہے۔

فائدہ : سنت اور بدعت کے پیش نظر بغرض اختصار بعض نے خیر القرون کا مفہوم یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی عقیدہ اور عمل ثابت نہ ہو بعض نے شیخینؓ اور خلفائے راشدینؓ کے خلاف کو خیر القرون کے خلاف کہا۔ بعض نے عام صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کی خلاف ورزی کو خیر القرون کے منافی کہا۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ خیر القرون کا مفہوم ہی بس اتنا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق انہوں نے اہم اور عمدہ کلمی کو بیان کر دیا ہے، اور دوسروں کو بالشیعہ سمجھ کر بیان نہیں کیا۔ اور جنہوں نے خیر القرون کی پوری تشریح بیان کی اور بدعت کی جامع و مانع تعریف اور حد سامنے رکھی ہے، تو انہوں نے خیر القرون کی تعریف حضرت صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ سے کی اور ان کے خلاف عقیدہ اور عمل کو بدعت کہا ہے، اور اکثر و بیشتر خود ان حضرات کی اپنی عبارات (جب وہ اس کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تو) اس کی تشریح کرتی ہیں۔ و صاحب البیت ادریٰ بمافیہ۔

اس قاعدہ کو نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی عبد السمیع صاحب نے انوارِ ساطعہ میں اور مفتی احمد یار خان صاحب نے جوارِ حق میں اور اسی طرح دیگر بدعت پسند حضرات نے اپنی اپنی کتابوں اور رسالوں میں ٹھوکریں کھائی ہیں

اور خواہ مخواہ اپنے ذہن اور عوام کو مشوش کیا ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ سہ
ٹھوکریں مت کھائیے، پچھلے سنبھل کر، دیکھ کر
چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور، دیکھ کر

اسلامی فقہ اور قیاس بھی ایک شرعی دلیل ہے

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انسانی ضروریات اور انسانی ماحول
ایک حالت پر قائم رہنے والی چیز نہیں ہے اور تمدنی ترقیات کے ساتھ ہی ساتھ انسانی ضروریات کا تبدیل
ہوتے رہنا ضروری امر ہے۔ لہذا آپ نے بہت سی فرعی باتوں سے متعلق خود احکام صادر فرمانے مناسب
نہیں سمجھے، اور ان باتوں کا اُن لوگوں کے فہم و فراست پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی کتاب
اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغمبر مانتے اور کتاب و سنت کے اصولی
احکام کو واجب التحمل جانتے ہیں کتاب و سنت کے قوانین کو لازمی اور قابل عمل جاننے والوں کو حق حاصل
ہے کہ وہ اپنے اجتہاد و تفقہ سے کام لیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں ضروری اور ہنگامی قانون بنائیں
اسی کو فقہ اور قیاس کہتے ہیں۔ اور مجتہد مصیب بھی ہو سکتا ہے اور غلطی بھی۔ لیکن اگر صاحب اجتہاد نے اپنی
پوری طاقت اور وسعت صوف کی اور مع ہذا اس سے غلطی ہو گئی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ مجبور
ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بلے پایاں سے ثواب کا مستحق ہو گا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت
ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا حکم
الحاکم فاجتهد واصاب فله اجران واذا حکم
فاجتهد واخطا فله اجر واحد (بخاری ج ۳ ص ۲۷۱)
و سلم ج ۲ ص ۲ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۱۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ جب
کوئی فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے اور اجتہاد کرتے ہوئے درست
فیصلہ کرے تو اس کو دو برابر اجر ملے گا، اور اگر اس سے غلط
سرزد ہو تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت اور مشقت کو ہرگز راسخاں نہیں کرتا، تو اجتہاد کرتے وقت جو تکلیف اور

کاوش مجتہد کو ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اس کو ضرور ایک اجر مرحمت فرمائے گا، اور اصابتِ رائے کی صورت میں ایک اجر اجتہاد کا اور ایک اصابتِ رائے کا اس کو حاصل ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجتہد صحیح معنی میں مجتہد ہو، ورنہ القضاۃ ثلاثہ کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ جاہل آدمی کا فیصلہ اس کو دوزخ میں لے جائے گا (رواہ ابو داؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)۔ اس صحیح روایت سے اجتہاد کا درست ہونا اور خطا کی صورت میں مجتہد کا معذور بلکہ مجرم ہونا صراحت سے ثابت ہوا۔ صرف بطور تائید و شاہد کے حضرت معاذ بن جبلؓ (المتوفی ۱۸ھ) کی روایت بھی سن لیجئے۔ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کو مین کا گورنر بنا کر بھیجا تو اُس وقت آپ نے حضرت معاذ سے فرمایا کہ :

کیف تقضی اذا عرض لك قضاء قال اقصی	تو کس طرح فیصلہ کرے گا جب تیرے سامنے کوئی جھگڑا پیش
بکتاب اللہ قال فان لم تجد فی کتاب اللہ قال	ہوا، حضرت معاذ نے عرض کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کے
فبسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال	موافق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ
فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتہد	تجھے نہ مل سکے، عرض کیا تو پھر سنتِ رسول اللہ کے موافق فیصلہ
برائی ولا الو قال فضرب رسول اللہ صلی	کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر سنتِ رسول اللہ میں بھی نہ ہو،
اللہ علیہ وسلم علی حذرہ وقال الحمد لله	تو حضرت معاذ نے عرض کیا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا
الذی وفق رسول رسول اللہ یرضی بہ رسول	یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول
اللہ - (رواہ الترمذی و ابو داؤد والدارمی)	کے قاصد کو اُس چیز کی توفیق عطا فرمائی، جس پر اللہ تعالیٰ
مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲۴)	کا رسول راضی ہے۔

حافظ عمامہ والدین ابن کثیرؒ (المتوفی ۷۷۴ھ) اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

باسناد جید کما هو مقرر فی موضعہ۔ اس روایت کی سند عمدہ اور گہری ہے جیسا کہ اپنے (تفسیر ج ۱ ص ۱) موقع پر ثابت ہے۔

اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے جواب پر کہ اجتہد برائی

(کہ میں قیاس اور رائے سے کام لوں گا) اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا اور اظہارِ مسرت کیا، جس سے صاف طور

پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فروعی قوانین کو مجھ رکھنا پسند نہیں فرمایا۔ بلکہ ضرورت کے پیش نظر ایسے قوانین کو مستقرانی رکھنا چاہا ہے تاکہ انسان کے قواسے و مانعہ کی نشوونما اور انسانی ترقیات میں کسی قسم کی کاوٹ پیدا نہ ہو سکے۔ حضرت ابو بکرؓ (المتوفی ۳۸ھ) کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں اس کو تلاش کرتے تھے، ورنہ اجتہاد سے کام لیتے تھے۔

ان ابا بکرؓ اذا نزلت به قضیۃ لم یجحد
لہا فی کتاب اللہ اصلاً ولا فی سنتہ اثرًا
فقال اجتہد بوائ فان یمکن صوابا
فمن اللہ وان یمکن خطا ففی واستغفر
اللہ۔ (طبقات ابن اسحاق ج ۲ ص ۱۲۱)۔
حضرت ابو بکرؓ کے پاس جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ میں اگر ان کو اس کی وضاحت دلتی تو فرماتے، میں اپنی رائے سے اجتہاد کرتا ہوں۔ اگر درست ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہوگی ورنہ میری خطا ہوگی، اودین اللہ سے معافی چاہتا ہوں۔

حضرت عمرؓ نے مشہور تابعی قاضی شریح (المتوفی ۸۸ھ) کو خط لکھا۔ اس میں کتاب و سنت اور اجماع کے بعد خاص طور پر اجتہاد کرنے کا ذکر ہے۔ (دیکھئے مسند دارمی ص ۱۲۱ و مشنفی کنز العمال ج ۲ ص ۱۲۱)۔
اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی اجماع کے بعد قیاس اور اجتہاد کرنے کا حکم دیا کرتے تھے (مسند دارمی ص ۱۲۱)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ معمول تھا کہ جب کتاب و سنت کے بعد حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کوئی ثبوت نہ مل سکتا تو قال فیہ بواہ (مسند دارمی ص ۱۲۱ و مستدرک ج ۱ ص ۱۲۱ و قالہ علی شریحہما) اپنی رائے سے کام لیتے تھے۔

الغرض جمہور اہل اسلام قیاس شریعی کو صحیح اور حجت تسلیم کرتے ہیں چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں:
”جمہور از صحابہ و تابعین و فقہاء و متکلمین ہائے
رفتہ کہ اصلی از اصول شریعت است استدلال
میرود بادل بر احکام وارودہ بسبع ظاہریہ
انکارش کردہ اند“ (افادہ الشیوخ ص ۱۲۱)
جمہور صحابہ و تابعین اور فقہاء و متکلمین اس کے قائل ہیں کہ قیاس شریعت کے اصولوں میں سے ایک اصل ہے اس سے احکام فارہد بسبع میں باقاعدہ استدلال صحیح ہے اور اہل ظاہر نے قیاس کا انکار کیا ہے۔

اہل ظاہر کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ غیر نبی کو یہ مقام کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ

”باقی رہا وہ شخص جو ابھی اس مرتبہ (اجتہاد) تک نہیں پہنچا تو اس کے لئے سلامتی اسی میں ہے، کہ وہ ائمہ فہم کی تحقیقات اور ان کی آراء کا اتباع کرے۔ تمام دنیوی علوم کی طرح مذہبی علوم میں بھی یہی طریقہ بہتر اور صحیح تر ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو لوگ اجتہاد بلا علم کا علم بلند کرتے ہیں وہ دنیا اور دین دونوں میں اپنے لئے رسوائی کا سامان کرتے ہیں۔“ (تفہیمات ص ۲۸۶)۔

کاش مودودی صاحب خود بھی اس بہترین اور زہدین نصیحت پر عمل کرتے۔ اور پلارِ اراخِ علم کے خام اجتہاد کا چور دروازہ نہ کھولتے، جس کی بدولت وہ خود بھی اس رسوائی سے بچتے اور لوگوں کو بھی گمراہی سے بچاتے۔

عباد اور زہاد کا قیاس | یہ بات طے شدہ ہے کہ اجتہاد کے لئے چند نہایت ضروری شرطیں ہیں جن میں وہ نہ پائی جاسکیں، اُن کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح محض صوفیوں کی باتیں بھی شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اِلا یہ کہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ چنانچہ علامہ قاضی ابراہیم الحنفی (المتوفی فی حدود متنازعہ) لکھتے ہیں :

”اور جو عابد و زہاد اہل اجتہاد نہیں، وہ عوام میں داخل ہیں، ان کی بات کا کچھ اعتبار نہیں ہاں اگر ان کی بات اصول اور معتبر کتابوں کے مطابق ہو تو پھر اس وقت معتبر ہوگی (نفائس الانوار ترجمہ مجالس اللبرار علیہ السلام) مجالس اللبرار و مسالک الاخیار علامہ ملا احمد بن عبدالقادر الرومیؒ (المتوفی ۷۸۰ھ) کی کتاب ہے مصابیح کی ستون فقہ احادیث کی شرح اس میں کی گئی ہے ہر حدیث اور اسکی شرح کو مجلس کا عنوان دیا گیا ہے جو کل ستون مجلس میں (کشف الظنون عن اسامی الکتاب والننون ج ۱ ص ۵۹) علامہ ملا کاتب چلبیؒ (المتوفی ۱۰۸۰ھ) طبع نور محمد کراچی) مجالس اللبرار کی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے بھی بڑی تعریف کی ہے فرماتے ہیں کہ کتاب ”معتبر است“ (فتاویٰ عزیز ص ۱۱۲)۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ :

عمل صوفیہ در حل و حرمت سننیت میں پس حضرت صوفیاء کی بات حل و حرمت میں سند است کہ مایشاں را محذور داریم و ملامت نہ کنیم نہیں ہے۔ یہی کافی ہے کہ ہم ان کو ملامت نہ کریں اور ہم مایشاں را محبت سبحانہ و تعالیٰ منقوض داریم ان کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کریں۔ اس جگہ حضرت امام

ایہجا قول امام ابو حنیفہؒ و امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ معتبر ہوگا
محمدؒ معتبر است نہ عمل ابو یوسفؒ و ابو حسن نوریؒ (مکتوبات دفتر اول ص ۲۳۵، مکتوب ملاک)
ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول معتبر ہوگا
نہ کہ ابو یوسفؒ و ابو حسن نوریؒ جیسے صوفیاء
نوریؒ (مکتوبات دفتر اول ص ۲۳۵، مکتوب ملاک) کہ امام کا عمل۔

قیاس بدعت نہیں ہے | پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ قیاس و اجتہاد قرآن و حدیث
سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس میں غیر منصوص کی کڑی کو منصوص سے ملا دیا جاتا ہے، اور یہ ایک شرعی حجت
ہے۔ قیاس و اجتہاد سے نہ تو دین میں خلل واقع ہوتا ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بدعت کا اطلاق
ہرگز درست نہیں ہے۔ چنانچہ امام ابو اسحاق شاطبیؒ (المتوفی ۵۹۰ھ) کہتے ہیں :

ولیس من شأن العلماء اطلاق لفظ البدعة
على الفرع المستنبطة التي لم تكن في ماسلف
وان دقت مسائلها فكذلك لا يطلق على دقائق
الاخلاق الظاهرة والباطنة انما بدعة لان
الجميع يرجع الى اصول الشريعة (الاختصار ج ۱ ص ۲۵۷)
کہ علماء کی شان سے بعید ہے کہ وہ ان فروع مستنبطہ پر بدعت
کا اطلاق کریں جو ماضی زمانہ میں نہ تھے۔ اگرچہ ان کے مسائل
بڑے دقیق ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح اخلاق ظاہرہ اور باطنہ
کے دقائق پر بھی لفظ بدعت کا اطلاق صحیح نہیں ہے اس لئے
کہ یہ سب کے سب اصول شریعت کی طرف راجع ہیں۔

اور دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ یعنی

واما الكلام في دقائق التصوف فليس
ببدعة۔ (ج ۱ ص ۲۵۷)
تصوف کے دقائق اور اسرار میں کلام کرنا اور ان کا اثبات
کرنا بھی بدعت نہیں۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ معتبر بزرگان دین نے تصفیہ قلوب کے لئے جو اعمال و اشغال بتائے
ہیں وہ بدعت نہیں ہیں کیونکہ یہ سب امور اصول شریعت سے ثابت ہیں بخلاف بدعات کے کہ ان کا ثبوت اصول
شریعت سے ہرگز نہیں ہے بلکہ ان میں متہدین کی اپنی آراء اور خواہشات کا رومہا ہین ذلك قولہم بانوا محمد
صد حیرت ہے مولوی عبدالستیع صاحب پر کہ وہ لکھتے ہیں: تعجب ہے کہ جو لوگ اعمال و اشغال مشائخ
صوفیہ عمل میں لائیں اور تقلید شخصی کو واجب اور حق کو منحصر چار امام میں جانیں اور اجماع اُمت کو درست
جانیں اور پھر یہ بات زبان پر لائیں کہ بعد قرون ثلاثہ کے جو کچھ حادث ہوگا وہ بدعت ضلالت اور فی النار ہوگا۔

(انوارِ ساطعہ ص ۱۷۱)۔ مگر غیر سے غیر القرون کا مفہوم خود ہی نہیں سمجھے۔ بحث گزر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ معلوم وہ کونسا محقق عالم ہے جس نے یہ کہا ہو کہ حق صرف ائمہ اربعہ میں منحصر ہے اور جو ان کی تقلید نہیں کرتا وہ قطعاً اور یقیناً باطل پر ہے۔ سینکڑوں امام ان کے علاوہ بھی گندے ہیں، اور لوگ ان کی بھی تقلید کرتے رہے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ حسب تحقیق حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ہندوستان وغیرہ کے مزاج کے مطابق حضرت امام ابو حنیفہ کی فقہ قریب تر ہے اور ان پر ان کی تقلید واجب ہے اور مجموعی لحاظ سے لب ائمہ اربعہ کی تقلید نہایت ضروری ہے۔ جیسا کہ علامہ ابن خلدون (دیکھئے مقدمہ ص ۹۷۸) وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، مگر تقلید کے انحصار سے حق کا انحصار ان میں کیسے اور کس طرح لازم آیا؟

اور مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں کہ: "تصوف کے اشغال صوفیاء کی ایکاد ہے اور ہر زمانہ میں نئے نئے ہوتے رہتے ہیں اور جائز ہیں، بلکہ راہِ سلوک ان ہی سے ملے ہوتی ہے۔ کہتے اب وہ قاعدہ کہاں گیا کہ ہر نئی چیز حرام ہے۔" (جارِ الحق و زہقِ الباطل ص ۲۱۷)۔

قاعدہ تو اپنی جگہ پر ہے مگر مفتی صاحب کی اپنی سمجھ کا تصور ہے۔ اس لئے کہ ابھی الاعتصام کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ تصوف کی باریکیوں اور ان کے اسرار کو بدعت نہیں کہا جاتا کیونکہ یہ سب اصولِ شریعت کی طرف راجع ہیں اور ان میں محض حضرات صوفیاء کے آثار اور قیاسات ہی کا دخل نہیں، تاکہ ان کی بات قابلِ التفات نہ ہو اور ہم ان کو مضور تصور کریں بلکہ یہ سب اصولِ شریعت کی طرف راجع ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ صوفی ظاہری علوم سے بھرہ و درہ ہو، کتاب و سنت کا عالم ہو، اخلاص اور تقیہ میں نمایاں اور اتباعِ سنت کا شیدائی ہو۔ ہر صوفی، صوفی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

نہ ہر کہ موئے برافروخت دلبری دانہ

بات دُور جا پڑی۔ بات یہ عرض کی جا رہی تھی کہ قیاس بدعت نہیں ہے، اور حضرت مجدد

الف ثانی فرماتے ہیں:

واما القیاس والاجتہاد فلیس من البدعة
فی شئٍ فانہ مظهر لمعنی النصوص لاثبتہ
بہر حال قیاس واجتہاد تو اس کا بدعت سے کوئی تعلق ہی
نہیں ہے کیونکہ قیاس نصوص کے معانی کو ظاہر کرنے والا

امروزائے۔ (مکتوبات حصہ سوم ص ۷۷) ہے، کسی زمانہ چیز کا اثبات نہیں کرتا۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

”علماء مجتہدین اظہار احکام دین فرمودہ اند نہ احداث مالیس منہ، پس احکام اجتہاد یہ از امور محدثہ نباشند بلکہ از اصول دین ہونہ۔“ (مکتوبات حصہ چہارم ص ۹۷، مکتوب ۲۶۰)۔

الحاصل ان سابقہ احکام کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات آفتابِ نمرود کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ دلائل اور براہین کی اصولی چار قسمیں ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ اور یہ امر بھی ثابت ہو چکا ہے کہ قیاس بھی شرعی حجت ہے، بدعت نہیں ہے۔ جب قیاس اور اجتہاد صحیح ہے تو پھر کسی مجتہد کی تقلید کرنا کیسے بدعت ہوگا؟ اب ہمیں اپنے ہر قول و فعل کو ان دلائل کی کسوٹی پر پرکھنا ہے۔ جو ان کے موافق ہو، وہ حق ہے اور اسی میں نجات و فلاح ہے۔ اور جو ان سے ٹکراتے، یا اس کا ثبوت ان سے نہ ہو سکے تو وہ باطل اور مردود ہوگا، اور بقول علامہ اقبالؒ (المتوفی ۱۳۵۷ھ) اسے سحر

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

قیاس کے متعلق ایک نفیس اور عمدہ بحث | یہ بالکل ٹھیک ہے کہ دین کی تکمیل انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں ہو چکی تھی۔ مگر تکمیل دین کا یہ مطلب ہے کہ قواعد و ضوابط اور کلیات دین پورے طور پر مکمل ہو چکے تھے۔ بعد کو پیش آنے والے واقعات اور حوادث کو ان اصول اور کلیات کے تحت درج کرنا اور انہی جزئیات کو کلیات پر منطبق کرنے کا نام قیاس و اجتہاد ہے، لیکن بسا اوقات جزئیات کا کلیات میں داخل کرنا کسی خاص عارضہ کی وجہ سے بعض لوگوں پر مخفی رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فروعی مسائل میں فقہاء اسلام کا اختلاف رہا ہے، اور ایسے مواقع پر جو چیز اقرب الی الحق ہو، اس کو قبول کر لینا اور اس پر عمل کرنا نجات کے لئے کافی ہے۔ ہاں اگر قرآن اور حدیث سے کوئی نص مل جائے، یا اجماع پر اطلاع ہو جائے تو اس صورت میں قیاس سے رجوع کرنے میں ہرگز تاثر نہیں ہونا چاہیئے، اور یہی کچھ ائمہ دین نے فرمایا ہے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ راقم المحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقليد کا مطالعہ کافی ہوگا،

جن مسائل اور امور میں حضرات فقہاء کرامؒ نے اجتہاد و قیاس کیا ہے، ان کے اصول و ضوابط اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ و تبع تابعینؓ کے زمانہ میں موجود تھے مگر ان کے دعائی و اسباب و محرکات اُس وقت رونما نہ ہوئے تھے۔ جب ان مسائل کے اسباب و محرکات مجتہدین کے زمانہ میں پیدا ہوئے تو ان کو قیاس و اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے اپنے چلنے قیاس و اجتہاد سے ان کی کڑی نصوص شرعیہ سے جوڑ دی اور جزئیات کو کلیات میں داخل کر دیا بخلات ان جملہ بدعات کے جن پر آج شدت کے ساتھ بدعت پسند حضرات عامل ہیں (حتیٰ کہ انہوں نے اپنے عمل اور اصرار سے ان کو شعار دین بنا رکھا ہے، اور ان بدعات میں شریک نہ ہونے والوں کو دہانی اور عدم معلوم کیا کیا خطابات مرحمت فرماتے ہیں) کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک بدعت کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا، مگر ان خود ساختہ بدعات کا اس وقت ہرگز وجود اور رواج نہ تھا۔ لہذا ان بدعات کو قیاس و اجتہاد کی مد میں شامل کرنا سراسر بے دینی اور نری جہالت ہے۔ مثلاً میلاد کے منانے کا سبب، (یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت) اُس وقت موجود تھا۔ چالیس سال قبل از نبوت اور تیس سال بعد از نبوت آپؐ نے ولادت کے بعد اپنی قوم اور حضرات صحابہ کرامؓ میں گنا سے، تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ وغیرہم میں آپؐ کا گہرا عشق اور محبت بھی تھی لیکن کسی نے آپؐ کا یوم ولادت نہ منایا جیسے آج منایا جاتا ہے، اور نہ عرفی میلاد کا ان میں کوئی ثبوت تھا جب سبب اور محرک موجود تھا اور یہ بدعت موجود نہ تھی، تو بعد کو اس میں قیاس کرنے کی ہرگز نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش اسی طرح آپؐ کی مدد ازواج مطہرات حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب ام المساکینؓ اور آپؐ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہؓ اور آپؐ کی تین صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت زینبؓ اور جملہ صاحبزادے آپؐ کی زندگی میں اس دنیا سے فانی سے رخصت ہو چکے تھے، مگر نہ تو آپؐ نے ان کا تیج کیا اور نہ ساتواں اور نہ سوواں اور نہ چالیسواں۔ نہ ان کی قبروں پر میلاد لگایا اور نہ عرس کیا، نہ چراغ جلانے، اور نہ اُور پر چادریں ڈالیں، نہ پھول چڑھانے اور نہ گنبد بنوائے۔ بلکہ ان میں بیشتر اشیاء کے متعلق صریح نہی بلکہ لعنت فرمائی۔ (مثلاً قبروں پر چراغ روشن کرنا وغیرہ) پھر نص کے مقابلہ میں قیاس کا کیا مطلب ہے؟ اور آپؐ کی وفات

کے بعد باوجود کمال عشق و محبت کے حضرات صحابہ کرام نے ان میں سے کوئی کام نہ کیا، اور نہ حضرات صحابہ کرام کی وفات کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے ایسا کیا۔ یہ سب کے سب اسباب اور دواعی موجود تھے اور کوئی مانع بھی نہ تھا جو بعد کو نازل ہو گیا ہو۔ لیکن ان خود تراشیدہ بدعات کا مطلقاً وجود نہ تھا و علیٰ ہذا القیاس۔ ایصالِ ثواب کیا جاتا تھا مگر نہ دونوں کی تعیین ہوتی تھی اور نہ کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھا جاتا تھا۔ (تبرک کے لئے کھانے پر کچھ پڑھنا محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے) ختنے ہوتے تھے مگر آج کل کی بدعات اور رسوم نہ ہوتی تھیں۔ شادیاں ہوتی تھیں مگر نہ تو سہرے باندھے جاتے تھے اور نہ پیسے وغیرہ پھینکے جاتے تھے۔ اسی طرح دیگر خرافات کا وجود اُس وقت نہ تھا۔ جنازے ہوتے تھے مگر جنازہ کے ساتھ جہرے نہ تو لکھ پڑھا جاتا تھا اور نہ کل جی میوت کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ نماز جنازہ تو پڑھی جاتی تھی مگر نماز سے فارغ ہونے کے بعد بل کر دُعا نہ مانگی جاتی تھی۔ دفن کرنے کے بعد تلقین تو ہوتی تھی مگر قبر پر اذان نہیں دی جاتی تھی۔ مُردوں کو گفن تو وہ پہناتے تھے مگر الفی اور کفنی لکھنے کا دستور نہ تھا۔ ذکر بھی کیا کرتے تھے اور دُرود شریف بھی پڑھتے تھے مگر بل کر اجتماعی صورت میں جہرے ذکر کرنے اور دُرود شریف باواؤ بلند پڑھنے کا اُن میں ہرگز رواج نہ تھا۔ الغرض آج جتنی بدعات رائج ہیں، ان میں سے ایک ایک کا سبب خیر القرون میں موجود تھا مگر یہ بدعات نہ ہوتی تھیں، تو پھر ان میں قیاس و اجتہاد کا کیا مطلب ہے؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان امور میں اگر قیاس و اجتہاد کی ضرورت اور گنجائش ہوتی، تو حضرات ائمہ مجتہدین اس سے ہرگز نہ بچ سکتے۔ یہ بالکل سمجھ سے بالاتر ہے کہ اُس وقت یہ قیاس و اجتہاد اُن کو نہ سوجھا اور آج یہ قیاس جائز ہو گیا۔ عشق و محبت اُن میں زیادہ تھی، علم و تقویٰ ان میں زیادہ تھا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت ان میں کامل اور مکمل تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُس وقت ان امور کو دین بنانا نصیب نہ ہوا اور آج بیک انقلابِ یہ دین اور شہارِ دین اور علاماتِ اہل التَّائِبِ بن گئے۔ بشرطِ کچھ تو فرمائیے اسے

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی، کدورتوں کی کچھ انتہا بھی؟

زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر، کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے؟

یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جس کو ذہن نشین کر لینے کے بعد تمام خود ساختہ بدعات کی کموکلی بھارتِ خود

بخود پیوندِ زمین ہو جاتی ہے۔ ایسے امور میں جن کے تمام اسباب و دواعی اور محرکات اُس وقت موجود

تھے، نہ قیاس ہو سکتا ہے اور نہ یہ بدعتِ حسنہ کا درجہ پا سکتے ہیں۔ یہ امور قطعی طور پر بدعتِ قبیحہ اور سنیہ کی مدین داخل ہیں، اس میں ایک رٹنی برابر بھی شک نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ قاضی ابراہیم الحنفی تحریر فرماتے ہیں: ”اور اگر آپ کے زمانہ میں سبب موجود ہو لیکن کسی عارضی وجہ سے متروک ہو اور حضور کی وفات کے بعد وہ مانع جاتا رہا ہو تو ایسے امر کا احداث بھی جائز ہے جیسے قرآن کا جمع کرنا۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حیات میں یہ مانع تھا کہ وہی برابر آتی رہتی تھی، اللہ تعالیٰ جو چاہتا تھا بدل دیتا تھا حضور کی وفات کے بعد وہ مانع جاتا رہا اور جس فعل کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہوا وہ کوئی مانع بھی نہ ہوا اور باوجود اس کے حضور نے نہ کیا ہو، تو ایسا کام کرنا اللہ تعالیٰ کے دین کو بدلنا ہے؟ کیونکہ اگر اس کام میں کوئی مصلحت ہوتی، تو سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس فعل کو خود ضرور کرتے یا ترغیب فرماتے اور جب آپ نے نہ خود کیا نہ کسی کو ترغیب دی، تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی بھلائی نہیں، بلکہ وہ بدعتِ قبیحہ سنیہ ہے۔“ (نفائس الاظہار ترجمہ مجالس الابرار ص ۱۲)۔

یہ عبادت اس پر واضح محبت ہے کہ محرک اور سبب کے ہوتے ہوئے جبکہ کوئی مانع بھی موجود نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اگر کسی کام کو نہیں کیا اور کرنے کی ترغیب بھی نہیں دی تو وہ کام بدعتِ قبیحہ اور بدعتِ سنیہ ہوگی۔ اگرچہ وہ بظاہر عبادت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ: اَتَّبِعُوا اِمَامَنَا وَلَا تَبْتَدِعُوا فَقَدْ كَفَيْتُمْ۔ تم ہمارے نقش قدم پر چلو، اور نئی نئی مبعات مت ایجاد کرو (الاعتصام ص ۵۷) کیونکہ تم کفایت کئے گئے ہو۔

اور حضرت حذیفہؓ (المتوفی ۳۷ھ) نے ارشاد فرمایا کہ:

كُلُّ عِبَادَةٍ لَمْ يَتَّبِعْهَا اَحْبَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَا تَقْبَلُ وَهَا (الاعتصام ص ۵۸)
مردہ عبادت جس کو حضرات صحابہ کرام نے نہیں کیا سو
تم بھی اس کو مت کرو۔
اور حافظ ابن کثیرؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ:

و اما اهل السنة والجماعة فيقولون
في كل فعل وقول لم يثبت عن الصحابة
اهل سنت والجماعة یہ فرماتے ہیں کہ جو قول اور فعل
جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات

رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہو بدعة لہذا لو کان
 خیرا لسبقونا الیہ انہم لم یتوکوا خصلۃ
 من خصال الخیر الا وقد بادروا الیہا -
 (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۸)

صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو تو اس کا کنا بدعت ہے کیونکہ
 اگر وہ کام اچھا ہوتا تو ضرور حضرات صحابہ کرام ہم سے پہلے
 اس کام کو کرتے اس لئے کہ انہوں نے نیکی کے کسی پہلو اور
 کسی نیک اور عمدہ خصلت کو تشنہ عمل نہیں چھوڑا بلکہ
 وہ ہر کام میں گئے سبقت لے گئے ہیں۔

الحاصل مجتہد کا قیاس واجتہاد تو حق اور صحیح ہے، مگر صرف ان امور اور مسائل میں جن کے دواعی
 و اسباب اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ظہور پذیر ہوئے اور ایسے امور میں برگز
 قیاس واجتہاد جائز نہیں ہے جن کے دواعی و اسباب اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور
 حضرات صحابہ کرام کے وقت موجود تھے، اور آج کل عموماً جتنی بھی بدعات رائج ہیں وہ بیشتر وہی ہیں جن
 کے اسباب اور محرکات اُس وقت موجود تھے، ایسے امور میں فلاح و نجات صرف ان حضرات کے نقش قدم
 پر چلنے سے ہی نصیب ہوگی اور ان کی مخالفت کرنے پر اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوگا اور جناب نبی کریم صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم بھی برگز راضی نہ ہوں گے اور صرف اسی پہلو میں حضرات صحابہ کرام اور تابعین وغیرہم کا صحیح
 عشق منحصر ہے اور اس کے خلاف گمراہی بھی ہے اور بدعت بھی، اخروی تباہی بھی ہے اور بربادی بھی۔
 اعادنا اللہ تعالیٰ منہ

الہی خیر ہو کہ فتنہ آخر زماں آیا
 ہے ایمان و دیں باقی کہ وقت امتحان آیا

باب دوم

بدعت لغوی اور شرعی کی تعریف، اس کی اقسام اور اس کے احکام کے بیان میں

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس طرح بدعت اور اہل بدعت کی تردید فرمائی ہے شاید ہی کسی اور چیز کی ایسی تردید فرمائی ہو، اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ بدعت سے دین کا اصلی حلیہ اور صحیح نقشہ بدل جاتا ہے، اور اصل و نقل اور حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور قرآن کریم نے صراحت سے اس امر کو بیان کیا ہے کہ دین کے مٹ جانے کے اصولی دو طریقے ہیں۔ کتمان حق اور تبلیغ حق و باطل۔ اور اسی اختلاط اور تبلیغ کی وجہ سے دین الہی لوگوں کی خواہشات اور اہوار کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا ہی چاہا کسی چیز کو اپنی مرضی سے دین بنا دیا، اور جس کی خواہش ہوئی کسی چیز کو دین سے خارج کر دیا۔ خدا تعالیٰ کا دین نہ ہوا، بچوں کا کھیل ہوا (معاذ اللہ تعالیٰ)۔ یہ بات بھی طوطا خاطر رہے کہ کسی امر کے باعث ثواب اور موجب عذاب ہونے کا فیصلہ صرف باری تعالیٰ کا کام ہے اور اس کو لوگوں تک پہنچانا اور بیان کرنا نبی اور رسول کا کام ہے، اپنی مرضی اور خواہش سے کسی چیز کا کارِ ثواب اور کارِ عذاب کہنے والا گویا دراصل اپنے لئے منصب الوہیت اور رسالت تجویز کرتا ہے (حیاذ باللہ تعالیٰ)۔ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کامل اور مکمل نمونہ بنا کر ہمیں ہر کام میں (جو آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ ہو) آپ کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہمیں اپنی مرضی پر مہرگز نہیں چھوڑنا چنانچہ ارشاد فرمایا کہ :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ
اللَّهَ تَعَالَىٰ ۚ بَلَىٰ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُ الشَّاكِرُونَ ۚ

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
(پ ۳، آل عمران، رکوع ۴)

اے محمد! آپ اعلان کر دیں کہ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے تو میری اتباع اور پیروی کرو، تاکہ مجھ سے تم سے اللہ تعالیٰ اور بخشے گا۔

آپ کے اس بہترین اسوہ اور ہدیٰ و سیرت کی اتباع کا نام سنت، اور خلاف و رزی کا نام بدعت ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ (المتوفی ۷۱ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جمعہ کے خطبہ میں جبکہ ہزاروں کا مجمع سامنے ہوتا تھا، پُر زور اور بلند آواز سے یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ :

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی بدیٰ اور سیرت کا بدعت سے تقابل کہ کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آپ کی سیرت اور نمونہ کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا وہ سب بدعت ہوگا اور ہر بدعت مگر اسی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بدعت بُری نہیں تاکہ دنیاوی ایجادات بھی مذموم

ہو جائیں، بلکہ وہ بدعت بُری ہے جو کتاب اللہ اور بدی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خلاف ہو۔ لہذا جو چیز کتاب و سنت کی روش کے خلاف نہ ہوگی وہ بدعت اور گمراہی نہ ہوگی، اور اگر اسی سے خدا تعالیٰ کبھی راضی نہیں ہوتا۔ بلکہ بُرائی کو مٹانے کے لئے اس نے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث کیا اور ان پر کتابیں صحیفے اور وحی نازل کی۔ امام نسائی (المتوفی ۳۸۳ھ) کی اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں :

وَكُلُّ خِلَافَةٍ فِي الشَّارِ (نسائی ج ۱ ص ۱۷۱) اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اہل بدعت کو تمام کائنات کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے، اور ان کی تکظیم و توقیر کرنے سے منع کیا ہے، اور ان کی تمام عبادات کہے کہے کا رد فرمایا ہے۔ تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت سے باز نہ آجائیں۔ اور نیز فرمایا کہ اہل بدعت کو توبہ تک نصیب نہیں ہوتی۔ اعادنا اللہ منہا ومن سائر انواع المعاصی۔

چنانچہ حضرت عائشہؓ، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة حوام مابين عير الى ثور فمن احدث فيها حدثا او اولى محمدا فعليه لعنة الله والملائكة والناس اجمعين لا يقبل منه صرف ولا عدل (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۲ و بخاری ج ۲ ص ۲۸۲ و مسلم ج ۱ ص ۱۷۱)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مدینہ منورہ مقام خیر ہے کہ تمام ٹور تک حرم ہے سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعت کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی انتقام انسانوں کی لعنت ہو، نہ تو اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔

اس حدیث میں حدود حرم کی قید محض تقبیح اور تشنیع کے لئے ہے۔ یہ قید احترازی نہیں ہے کہ حرم مدینہ میں

تو بدعت بُری جو اندھا رج از حرم وہ بُری نہ ہو۔ جو چیز بدعت اور بُری ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت بدعت اور بُری ہی ہوگی۔ ہاں البتہ شرف مکان یا فضیلت زمان کی وجہ سے اس کی بُرائی اور قباحت اور بُرہ جائے گی بدعت اور بدعتی کی تردید اور مذمت کے لئے اس سے بڑھ کر اور سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں جو جناب رؤف رحیم اور رحمت للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان پاک سے نکلے ہیں۔ بدعت کی تردید کے لئے یہ روایتیں بالکل کافی ہیں۔ صرف بطور شاہد اور اعتبار کے چند روایتیں اور بھی ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :
 قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو
 ابی اللہ ان یقبل عمل صاحب بدعة حتی یدع بدعته۔ (ابن ماجہ ص ۱۸۰)
 قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت
 کو ترک نہ کر دے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے :

من احدث فیہا حدثا او اوعى محدثا فعليه لعنة اللہ والملائکة والناس اجمعین لا یقبل منه صرف ولا عدل۔
 کو جس کسی نے بدعت طیبہ میں بدعت گھڑی یا کٹی مٹی
 کو ٹھکانا دیا تو اس پر اللہ تعالیٰ اور تمام فرشتوں اور
 انسانوں کی لعنت ہو نہ تو اس کی فعل عبادت قبول ہوگی اور نہ
 فرضی بدعت جہاں بھی ہو بدعت ہی ہے ہاں بدعت طیبہ
 میں اسکے گناہ کا وزن زیادہ ہوگا کیونکہ بدعت منہجہ ہدایت ہے۔
 (بخاری ص ۲۵۱)

حضرت ابراہیم بن مسیر (المتوفی ۱۳۳ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :
 قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قرء صاحب بدعة فقد اعلن علی ہدم الاسلام۔
 کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے کسی بدعتی کی
 تنظیم و توقیر کی، تو اس نے اسلام کو گرانے پر اس کی
 مدد اور اعانت کی۔
 (رداء البیہقی فی شعب الایمان ص ۱۸۰ - مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱)

یہی وجہ تھی کہ حضرات صحابہ کرامؓ کو بدعت اور اہل بدعت سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن
 عمرؓ (المتوفی ۳۸ھ) کے پاس ایک شخص کسی کا سلام لایا تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا :

بلغنی انه قد احدث فان کان قد احدث فلا تقرئہ منی السلام۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۸۰،
 دارمی ص ۱۸۰، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۸۰، ابن ماجہ ص ۲۸۰، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱)
 کہ مجھے سلام بھیجنے والے کی یہ شکایت پہنچی ہے کہ اس
 نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے۔ اگر واقعی اس نے کوئی
 بدعت ایجاد کی ہے تو میرا سلام اس کو نہ دینا۔
 حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ :

الاقتصاد فی السنۃ احسن من الاجتهاد سنت میں میاں زد روی اختیار کرنا بدعت میں گوشش

فی البدعۃ۔ (مسندک ج امین علی شریطہ)۔ کہنے سے بہتر ہے۔

حضرت انس بن مالک (المتوفی ۳۱ھ) روایت کرتے ہیں کہ :

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اللہ حجبت التوبۃ عن کل صاحب بدعۃ۔ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا ہے (اعاذنا اللہ منہا)۔

(رداء الطالبانی فی الاوسط ورجالہ رجال الصیح غیر ہارون بن موسیٰ القفیری وهو ثقۃ بجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۸۹)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت ایسی قبیح، بُری اور منحوس چیز ہے کہ انسان کے دل میں فطری طور پر جو نورانیت اور صلاحیت ہوتی ہے، بدعت اس کو بھی ختم کر دیتی ہے اور اس کی نحوست کا یہ اثر ہوتا ہے کہ توبہ کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ اور عقلی طور پر بھی یہ بات بالکل درست ہے اس لئے کہ جب بدعتی بدعت کو کارِ ثواب سمجھ کر کرتا ہے تو اس سے وہ توبہ کیوں کر لے گا؟ توبہ تو گناہوں اور جرائم پر کی جاتی ہے نہ کہ نیکیوں پر۔ کوئی مسلمان نماز پڑھ کر اور روزہ رکھ کر یہ نہیں کہتا۔ اے اللہ! میری نماز اور روزہ سے توبہ۔ بدعتی نے توبہ کا دروازہ اپنے اوپر اسی وقت بند کر دیا ہے جس وقت کہ اُس نے بدعت کو کارِ ثواب سمجھا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ روایت کرتی ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد۔ جس کسی نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ رد ہو جائیگی۔

(بخاری ج ۱ ص ۱۸۹ واللفظہ مسلم ج ۲ ص ۲۰۷، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۷، ابن ماجہ ص ۶۷ مسند احمد ج ۱ ص ۱۸۹)

نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فی امرنا هذا کی قدر سے تشریح کر دیں تاکہ کسی کوتاہ فہم کو مغالطہ پیش نہ آئے۔ حافظ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں :

کل من احدث فی الدین مالم یاذن به اللہ ورسوله فلیس من الدین فی شیء۔ (جامع العلوم ونگم طبع مصر ص ۱۲) جس نے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جس کا اذن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے نہیں دیا، تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

علامہ موصوفؒ یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر احداثِ مردودہ نہیں بلکہ جو احداث فی الدین ہوئے

لہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ بدعت از معصیت بالاتر است کفر از بدعت بالاتر بدعت بکفر نزدیک است (فوائد الفضول ص ۱۸)

مردود ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں فی امرنا ہذا کی جگہ صریح طور پر دین کا لفظ آیا ہے :

و فی بعض الفاظہ من احدث فی دیننا اور اس حدیث کے بعض الفاظ میں فی دیننا کے الفاظ آئے ہیں
مالیس منه فهو رد۔ (مٹا)

یعنی جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی تو وہ مردود ہوگی
جب جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اسی روایت کے اندر دوسرے الفاظ میں
فی امرنا ہذا کی جگہ فی دیننا کے الفاظ وارد ہوئے ہیں تو پھر اس سے بڑھ کر صحیح تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے۔
حافظ ابن حجرؒ فی امرنا ہذا کی شرح میں لکھتے ہیں کہ :

"والمراد امر الدین" (فتح الباری ج ۵ ص ۲۱۲)۔ فی امرنا ہذا سے دین کا امر مراد ہے یعنی جس
نے دین کے اندر کوئی نئی چیز نکالی تو وہ مردود ہوگی علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں ان المراد بهذا الکھوان
یجعل فی الدین مالیس منه... الخ (شرح المقاصد ص ۲۱۲)

علامہ عزیزیؒ (المتوفی ۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں کہ: "من احدث فی امرنا ہذا ای فی دین الاسلام"
السراج المنیر ج ۳ ص ۲۱۲) یعنی فی امرنا ہذا سے "دین اسلام" مراد ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات واضح سے واضح تر ہو گئی ہے کہ ہر بدعت اور ہر احدث بُرا اور مردود نہیں
ہے، بلکہ وہ بدعت اور وہ احدث بُرا اور مردود ہے جو دین اسلام کے اندر دین سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے، اور
یہ صرف شراح حدیث نے ہی نہیں کہا، بلکہ بقول ابن رجبؒ اسی حدیث کے بعض الفاظ میں دین کی قید (فی دیننا)
خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لگائی ہے۔ یہ حدیث اس بات کے لئے نقض صریح ہے کہ جتنی بدعتیں
لوگوں نے دین کے امور میں نکالی ہیں، وہ سب کی سب مردود ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا خرم علی صاحب الخفّیؒ
(المتوفی ۱۲۸۷ھ) مترجم مشارق الانوار لکھتے ہیں :

"جتنی بدعتیں لوگوں نے خلافِ شرع نکالی ہیں، اس حدیث سے سب رد ہو گئیں تفصیل کی کچھ حاجت
نہیں۔ مثلاً قبر پر گج کرنا، گنبد بنانا، قبروں پر روشنی کرنا، تعزیہ بنانا، بزرگوں کا میل کرنا، اولیاء کی منت
ماننا، جسدے نشان کھڑے کرنا سراسر دین کے خلاف ہیں۔ قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس شرعی
میں ان کی کچھ اصل نہیں۔" (ترجمہ مشارق الانوار ص ۲۱۲)۔

اکابرین علماء دیوبند | اس حدیث سے اکابرین علماء دیوبند بھی یہی کہتے ہیں کہ فی امرنا هذا سے امر دین مراد ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری (المتوفی ۱۳۳۶ھ) لکھتے ہیں کہ فی امرنا هذا سے امر دین مراد ہے۔ (بذل الجہود ۵: ۱۹۵)۔ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۶ھ) لکھتے ہیں: "والمراد بالامر الدین كما صرحوا به" (فتح الملبہم ۲: ۲۴۷)، کہ اگر اس سے امر دین ہے، علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔

بریلوی عقائد کے علماء | اس حدیث کی تفسیر بریلوی حضرت نے بھی امر دین سے کی ہے چنانچہ مولوی محمد صالح صاحب (مشہور بریلوی عالم) لکھتے ہیں کہ "مراد امر سے امر دین کہ ہے۔ مطلب یہ ہے، کہ اُمورِ دنیویہ عبادات ہوں یا معاملات کہ جن کے حدود و ضوابط نے مقرر کئے ہیں، ان میں کسی بیشی کرنا مرفوض ہے۔" (تحفۃ الاحباب فی تحقیق ایصال الثواب ۱۱)۔

مولوی عبدالستیع صاحب رام پوری لکھتے ہیں کہ "یہ حدیث صحیحین کی ہے، یعنی جس نے نکالی اس دین میں وہ بات جو دین کی قسم سے نہیں یعنی کتاب اور سنت کے مخالف ہے، وہ بات اس کی مذہب ہے۔" (انوارِ ساطعہ ص ۳۲)

فریقِ مخالف کے مجدد و ملت اعلیٰ حضرت مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی (المتوفی ۱۳۴۴ھ) تمباکو کو حلال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اُس کا بدعت ہونا یہ کچھ باعثِ ضرر نہیں کہ یہ بدعت کھانے پینے میں ہے نہ کہ اُمورِ دین میں، تو اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار کام ہے۔" (احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۶)۔ آپ نے فریقِ مخالف کے محقق اور مسلم علماء سے بھی یہ سُن لیا کہ بدعت وہی مذموم ہے، جو امورِ دین سے سمجھ کر کی جائے۔ جن کا تعلق امورِ دین سے نہیں، اس کی حرمت ثابت کرنا ایک دشوار امر ہے۔ بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے | قارئینِ کرام نے یہ ملاحظہ کر لیا کہ جو چیز قرآنِ کریم، حدیث، اجماع اور شرعی قیاس سے ثابت نہ ہو اور وہ کام جنابِ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ اسوۂ حسنہ اور نمونہ کے خلاف ہو، اور وہ کام جب دین کے اندر ایجاد کیا گیا تو یقیناً بدعت ہوگا۔ اب آپ بدعت کی تعریف ائمہ لغت سے سُن لیجئے کہ وہ کیا کرتے ہیں :

مشہور امام لغت الافتح ناصر بن عبدالسید المطرازی الحنفی (المتوفی ۱۰۶۱ھ) لکھتے ہیں کہ :

البدعة اسم من ابتدع الامور اذا ابتدأها
واحدثة كالرفعة اسم من الارتفاع والخلفة
اسم من الاختلاف ثم غلب على ما هو زيادة
في الدين او نقصان منه - (منرب ج ۲) -
بدعت ابتداع کا اسم ہے جس کا معنی یہ ہے کہ کوئی نئی چیز ایجاد
کی جائے رفعت ارتفاع کا اور خلفت اختلاف کا اسم ہے۔
لیکن پھر بدعت کا لفظ ایسی چیز پر غالب آگیا، جو دین میں
زیادہ یا کم کر دی جائے۔

علامہ محمد الدین فیروز آبادی (المتوفی ۱۱۸۰ھ) لکھتے ہیں :

بدعت بالكسر الحدث في الدين بعد
الاكمال او ما سجدت بعد النبي صلى الله عليه
وسلم من الامور والاعمال - (قاموس ج ۲ ص ۲)
بدعت (کسر) بار کے ساتھ ایسی چیز کو کہا جاتا ہے، جو
تکمیل دین کے بعد نکالی گئی ہو، یا وہ چیز جو آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد غماہات اور اعمال
کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہو۔

امام راغب اصفہانی (المتوفی ۱۰۵۰ھ) لکھتے ہیں :

والبدعة في المذهب ايراد قول لم يستن
قائلها او فاعلها فيه بصاحب الشريعة و
امثالها المتقدمة واصولها المتقنة -
مذہب میں بدعت کا اطلاق ایسے قول پر ہوتا ہے جس کا
قائل یا فاعل صاحب شریعت کے نقشب قدم پر نہ چلا ہو۔
اور شریعت کی سابق مثالوں اور اس کے حکم اصولوں پر وہ
گامزن نہ ہوا ہو۔ (مفردات قرآن ص ۳)

امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر الرازی (المتوفی ۱۰۸۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

والبدعة - الحدث في الدين بعد الاكمال -
بدعت، اکمال دین کے بعد اس میں احداث کا نام ہے۔
(مختار الصحاح ص ۲۸)

علامہ ابو الفضل محمد بن عمر الجمال القرشی (المتوفی ۱۰۸۰ھ) لکھتے ہیں :

”بدعت نو بیرون آور دن رسے در دین بعد اکمال دین“۔ (صرح ص ۲ ص ۲۸)

ابو کی مشہور لغت فیروز اللغات میں ہے :

بدعت : ۱: دین میں کوئی نئی بات یا نئی رسم نکالنا، نیا دستور یا رسم و رواج۔ ۲: سختی، ظلم۔
۳: جھگڑا، فساد، شرارت۔ (فیروز اللغات ص ۱۹۸)

اور مصباح اللغات میں ہے :

البدعة : بغیر نمونہ کے بنائی ہوئی چیز۔ دین میں نئی رسم۔ وہ عقیدہ یا عمل جس کی کوئی اصل قرآن
ملائے مشہود یا باخبر میں نہ ملے۔ (مصباح اللغات ص ۱۹۸)۔
امام نوویؒ بدعت کا لغوی معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ :

”كل شيء عمل على غير مثال سبق“ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۸۵) یعنی ہر وہ چیز جو کسی سابق
نمونہ کے بغیر کی جائے۔

بدعت کا شرعی معنی | حافظ بدر الدین عینی الحنفیؒ (المتوفی ۸۵۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

والبدعة في الاصل احداث امر لم يكن في زمن
رسول الله صلى الله عليه وسلم (عمدة القاری ج ۲ ص ۳۵۶)
بدعت اصل میں ایسی نو ایجاد یا چیز کہ جسے میں جو آنحضرت صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی۔
حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ :

والبدعة اصلها ما احدث على غير مثال
سابق وتطلق في الشرع في مقابل السنة
فتكون مذمومة۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۲۱۹)۔
بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سابق مثال اور
نمونہ کے ایجاد کی گئی ہو۔ اور شریعت میں بدعت کا اطلاق سنت
کے مقابل میں ہوتا ہے لہذا وہ مذموم ہی ہوگی۔

علامہ ترمذیؒ (المتوفی ۲۵۵ھ) لکھتے ہیں :

كل محدثة بدعة انما يريد ما خالف اصول الشريعة
ولم يوافق السنة۔ (تاج العروس ج ۵ ص ۲۴۵)۔
کل محدثہ بدعتہ انما یرید ما خالف اصول الشریعہ
شریعت کے خلاف ہو اور سنت کے موافق نہ ہو۔

حافظ ابن رجبؒ لکھتے ہیں کہ :

والمراد بالبدعة ما احدث مما لا اصل له
في الشريعة يدل عليه واما ما كان له اصل
بدعت سے مراد وہ چیز ہے جس کی شریعت میں کوئی اصل
نہ ہو جو اس پر دلالت کہے، اور بہر حال وہ چیز جس کی

من الشرع يدل عليه فليس ببدعة شرعا و شریعت میں کوئی اصل ہو جو اس پر دال ہے، تو وہ شرعا ان کا بدعة لغة (جامع العلوم والحکم ص ۱۹۳)۔ بدعت نہیں ہے۔ اگرچہ لغة بدعت ہوگی۔

اور بعینہ ان الفاظ سے بدعت کی تعریف علامہ معین بن صنفی (المتوفی ۸۸۹ھ) نے شرح اربعین نووی میں کی ہے (الجذہ ص ۱۵۹)۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ :

”بدیع السموات کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور لغت میں برائی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے اور بدعت کی دو قسمیں ہیں : ۱: بدعت شرعی جس کے متعلق جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة۔ کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ۲: کہی بدعت لغوی ہوتی ہے، جیسے حضرت عمرؓ نے لوگوں کے بل کر تراویح پڑھنے کے متعلق فرمایا : فہبت البدعة هذه۔“ یہ کیا ہی اچھی نوا بجا دے۔“

پھر آگے لکھتے ہیں کہ :

و كذلك كل حدث قولاً او فعلاً لم يتقدم فيه متقدم فان العرب تسميه مبتدعا۔ (تفسیر ص ۱۷۱)۔ اور اسی طرح ہر وہ قول یا فعل جس کو پہلے کسی نے نہ کیا ہو، اہل عرب ایسے کام کو بدعت کہتے ہیں۔

علامہ ابواسحاق غزنائیؒ بدعت شرعی کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ :

طريقة في الدين مخترعة تضاهي الشرعية وہ دین کے اندر ایسا اختراع کیا جو طریقہ ہے جو شریعت يقصد بالسلوك عليها المبالغة في التعبد کے مشابہ ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے سے اللہ تعالیٰ کی لله سبحانه۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۳)۔ عبادت میں مبالغہ قصد کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالستیع صاحب، حضرات فقہاء کرامؒ سے بدعت کا معنی یہ نقل کرتے ہیں کہ علامہ شمسؒ وغیرہ محققین نے بدعت سنیہ مذمومہ کی تعریف اس طرح فرمائی ہے :

ما احدث على خلاف الحق المتلقى عن (کہ بدعت وہ چیز ہے) جو اس حق کے خلاف ایجاد کی گئی ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم
او عمل او حال بنوع شیعہ واستحسان
وجعلہ دینا قویا وصلراط مستقیما (انوار ساطعہ)
جو انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اخذ کیا گیا ہو، یا
عمل یا حال اور کسی شیعہ کی بنا پر اس کو اچھا سمجھ کر دین
کویم اور صراط مستقیم بنایا گیا ہو۔

بدعت شرعیہ اور بدعت سنیہ کی بعینہ اسی عبارت سے بحر الرائق اور درنختار وغیرہ فقہ حنفی کی مستند
اور معتبر کتابوں میں تعریف کی گئی ہے۔ (دیکھئے الجذعہ ص ۱۶)۔

مولانا سخاوت علی صاحب الحنفی جونپوری (المتوفی ۱۲۴۴ھ) لکھتے ہیں :

"بدعت وہ کام خواہ عقیدہ کہ دین کا ہو اور آخرت کا نفع اور ضرر اس میں سمجھتے ہو، ثابت نہ ہو
ہو رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اور آپ کے صحابہ سے"۔ (رسالہ تقویٰ ص ۱)۔

اور نواب قطب الدین خان صاحب دہلوی الحنفی (المتوفی ۱۲۴۹ھ مولف مظاہر حق) لکھتے ہیں : پس بدعت او
نو احداث دین میں تو ہے تعزیر اور مہندی اور چھڑی مدار اور سالار کی الخ"۔ (رسالہ گزائر جنت ص ۵۹)

فریق مخالف کے مشہور محقق عالم مولوی محمد صالح صاحب لکھتے ہیں کہ : اصطلاح شریعت میں بدعت
اُس چیز کو کہتے ہیں جو امور دینیہ سے سمجھی جائے مگر کسی دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہ ملتا ہو، نہ کتاب سے
نہ احادیث نبویہ سے، نہ اجتماع مجتہدین سے نہ قیاس شرعی سے۔ تحفۃ الاحیاء ص ۹۵

اکابرین علماء دیوبند | اکابرین علماء دیوبند ہر مسئلہ میں اتباع سنت کے ساتھ سلف صالحین کی
تحقیق پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ دیگر مسائل کی طرح وہ بدعت کی تعریف میں بھی سلف کی پیروی کرتے ہیں چنانچہ
حضرت مولانا کیم بخش صاحب (المتوفی ۱۳۶۵ھ) لکھتے ہیں : اصطلاح شریعت میں بدعت ہر وہ فعل دین
ہے جس کو قرون ثلاثہ کے اہل حق کی اکثریت نے قبول نہ کیا ہو، یا ان پاک زمانوں میں اس کو خلاف
دین کہا گیا ہو، یا خود ان زمانوں کے بعد پیدا ہو جس میں عقیدہ غیر ضروری کو ضروری سمجھا جائے، یا
ضروری کو غیر ضروری۔ (حقیقۃ الایمان ص ۳۱)۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "بدعت کہتے ہیں ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب سنت اور
قرون مشہود بہا بالخیر میں نہ ہو، اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے"۔ (حامل شریف ص ۱)۔

اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب (المتوفی ۱۳۸۵ھ) لکھتے ہیں کہ "بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اصل شریعت سے ثابت نہ ہو، یعنی قرآن مجید اور احادیث شریف میں اس کا ثبوت نہ ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے زمانہ میں اس کا وجود نہ ہو، اور اُسے دین کا کام سمجھ کر کیا یا سچوڑا جائے۔" (تعظیم الاسلام حصہ چہارم ص ۲۷)

قارئین کو اِلام! ان ٹھوس حواجیات کو پڑھ پڑھ کر اور ٹخن ٹخن کر آپ یقیناً اُلتا پچے ہوں گے، مگر ہم بھی مجبور ہیں۔ ہمیں ایسے حضرات سے سابقہ پڑ چکا ہے جو دین سے یقیناً بے بہرہ ہیں مگر لوگوں کے ایمان اور دین کو شبہات کی بدولت ٹوٹنے میں بڑے چُست اور ہوشیار ہیں، اور عوام بیچارے ان کے جُبُول اور قبہ نما دستاروں میں اُلجھ کر متاعِ ایمان گنوا دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان گندم نما جو فردشوں سے محفوظ رکھے۔ ان عبارت میں آپ نے بخوبی ملاحظہ کر لیا کہ کیا دیوبندی حضرات اور کیا بریلوی اور کیا وہ اکابر علماء اُمت جو فرقہ پرستی کے نزدیک مسلم ہیں۔ بدعت کی تعریف میں دین کی قید لگاتے ہیں اور ظلم اور عمل اور حال۔ عبادات و معاملات سب کو اس میں درج کرتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ جو عقیدہ یا عمل یا حال کتاب و سنت و اجماع و قیاس شرعی کے تحت درج نہ ہو وہ بدعت ہے۔ دین کی اور عقیدہ کے علاوہ عمل کی خاص طور پر قید لگاتے ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کی عبارت میں حضرات صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی (کل قول و فعل لم یثبت عن الصحابة هو بدعة) گزر چکا ہے۔ اس سب بحث کو پیشِ نظر رکھ کر آپ مفتی احمد یار خان صاحب بدایونیؒ ثم گجراتی کی تحقیقِ اِتیق بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ احادیثِ صحیحہ اور اقوالِ علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ حدیث میں ہے کل محدثۃ بدعة (مشکوٰۃ باب الاعتصام) ہر نیا کام بدعت ہے۔ اس میں دینی یا دنیادہی کی قید نہیں۔ نیز ہم اشعة اللمعات اور مرقات کی عبارتیں نقل کر چکے ہیں۔ اُس میں دینی کام کی قید نہیں لگائی۔" (جاء الحق و ذہق الباطل ص ۲۱۱)۔

نیز لکھتے ہیں کہ : "ان دونوں عبارتوں (مرقات اور اشعة اللمعات کی عبارت) میں نہ تو دینی کام کی قید ہے اور نہ زمانہ صحابہؓ کا لحاظ ہے، جو کام بھی ہو دینی ہو یا دنیادہی حضور علیہ السلام کے بعد جب بھی بڑا خواہ

زمانہ صحابہ میں یا اس کے بعد، وہ بدعت ہے۔ (عبدالحق ص ۲۱۰)۔

مفتی صاحب کا یہ ارشاد سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ اولاً اس لئے کہ سابق عبارات میں اس کی پوری تحقیق عرض کی جا چکی ہے کہ شرعی بدعت میں جو مذموم اور قبیح ہے، دین کی قید ملحوظ ہے بلکہ ایک روایت میں فی دیننا کے الفاظ آتے ہیں۔ وثانیاً اگر بالفرض مرقات اور اشعۃ اللغات کی عبارتوں میں دین کی قید اور صحابہ کو اہم کا ذکر نہیں تو کیا کسی اور کی عبارت میں بھی اس کا ذکر نہ ہوگا؟ لیجئے ہم مفتی صاحب کو مرقات اور اشعۃ اللغات سے دین کی قید بتاتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بدعتی کو سلام کا جواب نہ دینے کی روایت باحوالہ پہلے عرض کی جا چکی ہے۔ اس روایت میں بلغنی قد احدث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ملا علی بن القاریؒ لکھتے ہیں کہ:

قد احدث ای ابتدع فی الدین ما یعنی اس نے دین میں ایسی چیز نکالی ہے، جو دین لیس منہ۔ (مرقات علی مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۱۰)۔ سے نہیں ہے۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ: رسیدہ است مرا کہ دے احدث نمودہ و پیدا کر وہ است در دین چیز ہے را کہ نمودہ است۔ (اشعۃ اللغات ج ۱ ص ۱۱۱)

لیجئے مفتی صاحب کی منہ مانگی مراد پوری ہو گئی اور مرقات و اشعۃ اللغات کی عبارتوں میں دین کی قید نکل آئی۔ اب مفتی صاحب ان سے پوچھ لیں کہ انہوں نے محض اپنی طرف سے دین کی قید کیوں لگائی ہے اور احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کی خلاف ورزی کیوں کی ہے؟ اسی طرح علیہ کو بستنی و سنت الخلفاء الراشدین اور ما انا علیہ و اھلبانی کی شرح میں ان دونوں بزرگوں کی عبارت میں ملاحظہ کر لیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل سنت ہے یا بدعت؟ طبیعت صاف ہو جائے گی، اور اشعۃ اللغات کی یہ عبارت پہلے نقل کر دی گئی ہے کہ حضرت خلفاء راشدین نے اجتہاد و قیاس سے جو احکام صاؤ کئے ہیں وہ بھی سنت ہیں؛ و اطلاق بدعت برائے نتواں کرد، چنان کہ فرقہ زائذ کند۔ مفتی احمد یار خان صاحب تو صحابہ کے عمل کو بھی الزامی طعن پر بدعت کہہ کر بدعت کا چور دروازہ کھولتے ہیں تعجب اور حیرت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو حضرات خلفاء راشدین کے عمل کو سنت فرمائیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کو میا برحق

قرار دیں اور خیر القرون کے نقش قدم پر چلنے کی وصیت فرمائیں، اور مفتی احمد یار خان صاحب یہ کہیں کہ خواہ زمانہ صحابہؓ میں یا اس کے بعد، وہ بدعت ہے۔ وثالثاً مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ یہ ان کا خالص متناہی اور انفراد اور سفید جھوٹ ہے۔ دینی کام کی قید نہ تو احادیث صحیحہ کے خلاف ہے اور نہ اقوال فقہاء اور محدثین کے خلاف ہے۔ کسی ایک معتبر امام و فقیہ اور محدث عالم کا حوالہ پیش نہیں کیا جاسکتا جو یہ کہتا ہو کہ بدعت مذمومہ اور شرعی بدعت کی تعریف میں دین کی قید ملحوظ نہیں۔ فہل من مبادرہ

ستعلو لیلی ای دین تداینت

وای غریم فی التقاضی غریہا

حضرت امام مالکؒ کا حوالہ الاعتصام سے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ابتداء فی الاسلام کی قید لگاتے ہیں اور باقی علماء و محدثین کی عبارتیں (بلکہ فریق مخالف کے محقق اور مسلم علماء کی عبارتیں بھی) غریب نقل کی جا چکی ہیں، اور ائمہ لعنت سے بھی یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ وہ بدعت کی تعریف کرتے ہوئے دین کی قید سے بے اعتنائی اور بے پروائی نہیں کرتے اور کل محدثہ بدعت کے متعلق بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اس کو بیان کر کے یہ متعین فرمادیا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے اور حافظ ابن کثیرؒ اور علامہ زبیدیؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد شرعی بدعت ہے، لغوی نہیں۔ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ اور عرض کریں، مگر مفتی صاحب کی خود فریبی اور مغالطہ آفرینی کے پیش نظر چند حوالجات اور سپرد قلم کئے جاتے ہیں۔

حبر ائمتہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ (المتوفی ۳۷ھ) آیت فَلَاحَقُّوْهُمْ

الایۃ کے تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں :

ابنہ شیخ عبدالحق صاحب، حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت خط لنا الخ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ صراط مستقیم صرف وہ ہے جس پر سلف صالحینؓ از صحابہ و تابعین باحسان من بعدہم برائیں اعتقاد و بریں طریقہ بودہ اند و ایں بدع و اہوار در مذہب و اقوال بعد صد اول حادث شدہ۔ (اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۱۷)

دخل في هذه الآية كل محدث في الدين و اس ایت میں مردہ بدعت جو دین میں نکالی جاتے اور تمام کل مبتدع الی یوم القیمة۔ بدعتی جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے داخل ہیں۔

(خازن ج ۱ ص ۵۹ و معالم بر خازن ج ۱ ص ۵۹)

مفتی صاحب بہت کر کے مفسر قرآن اور بلند پایہ صحابی سے دریافت کریں کہ آپ نے فی الدین کی قید محض اپنی طرف سے کیوں لگائی ہے۔ بدعت تو ہر نئی چیز کا نام ہے، دینی ہو یا دنیاوی؟ حضرت حسان تابعی (المتوفی بعد ۱۳۷ھ) فرماتے ہیں:

ما ابتدع قوم بدعة في دينهم الا نزع الله من سنتهم مثلها ثم لا يعيدها اليهم كوني قوم دين میں بدعت نہیں نکالے گی مگر اللہ تعالیٰ من سنتهم مثلها ثم لا يعيدها اليهم اتنی ہی مقدار میں سنت اُن سے اٹھالے گا۔ اور پھر الی یوم القیمة۔ (دارمی ص ۲۷ و مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱) قیامت تک ان کو وہ سنت واپس نہ دے گا۔

حضرت حسان بھی بدعت کے ساتھ فی دینہم کی قید لگاتے ہیں اور سنت اور بدعت کا تقابل کر کے یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ اگر سنت دینی کام ہے تو بدعت بھی دینی ہی کام کا نام ہے بلکہ حضرت مخضف بن الحارث الثمالی (المتوفی ۱۵۷ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما احدث قوم بدعة الا رفع مثلها من السنة فتسك بسنة خير من احدث بدعة۔ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی قوم بدعت ایجاد نہیں کرے گی مگر اسی کی مقدار میں سنت اُن سے اٹھالی جائے گی۔ سو سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت کے (مسند احمد ج ۱ ص ۵۱ و مشکوٰۃ ج ۱ ص ۳۱) ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی بدعت کا تقابل سنت سے کیا ہے۔ اگر سنت دینی کام ہے، تو بدعت بھی دینی کام ہوگا۔ اگر بدعت دنیاوی کام ہو جیسا کہ مفتی صاحب کو دھوکا ہوا ہے تو اتحادِ عمل نہ رہا۔ پھر بدعت کے لئے احداث سے سنت کیسے رفع ہوگی؟

لے شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ سنت بمعنی سیرت و طریقہ مسلوک در دین (اشتقاقیات ج ۱ ص ۶۸) یعنی سنت کے معنی سیرت کے اور دین میں اُس راستہ کے ہیں جس پر چلا جائے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی (المتوفی ۷۹۲ھ) تحریر فرماتے ہیں :

ان البدعة المذمومة هو المحدث في الدين مذموم بدعت وہ ہے جو دین کے اندر ایجاد کی جائے۔ اور وہ
من غير ان يكون في عهد الصحابة والتابعين حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعین کے عہد میں نہ ہو اور نہ اس
ولا دل عليه الدليل الشرعي (شرح القاصد ص ۲۴) پر کوئی شرعی دلیل دلالت کرتی ہو۔

علامہ عبد العزیز فرہارویؒ جو بدعت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

هو كل ما حدث في الدين بعد زمن الصحابة بلا بدعت ہر وہ چیز ہے جو حضرت صحابہ کرامؓ کے زمانہ کے بعد
حجة شرعية (بنا اس ص ۱۷۱) بلا حجت شرعیہ دین میں نکالی جائے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ جس بدعت کی مذمت کی گئی ہے وہ بقول مفتی احمد یار
خان صاحب ہر نیا کام نہیں جو دینی ہو یا دنیاوی، بلکہ وہ بدعت مذموم ہے جو محدث فی الدین ہو، اور
یہی بدعت حرام ہے۔ اور جو بدعت امور دین میں نہ ہو اس کی حرمت ثابت کرنا بقول خان صاحب بریلوی
ایک دشو رام ہے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے حضرت مجدد الف ثانی ایک مقام پر ارقام فرماتے ہیں :

"از حق تعالیٰ تضرع است کہ ہرچہ در دین محدث شدہ است و مبتدع گشتہ کہ در زمان خیر البشر و خلفاء
راشدین اذ بودہ اگرچہ آں چیز در روشنی مثل فلک صبح بود ایں ضعیف را بالجمہ کہ باو مستند اند کہ قائل
نگہداناد و مفتون حسن اں مبتدع نکلند بکرمۃ سید المرسلین" (مکتوبات حصہ سوم ص ۱۸۷)

اسی مکتوب میں حضرت مجدد صاحبؒ نے حضرات خلفاء راشدین کے علاوہ حضرات صحابہ کرامؓ اور
تابعینؓ کا ذکر بھی کیا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے لے کر فریق مخالف کے مسلم عالم
مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی تک سب بدعت کے ساتھ دین کی قید لگاتے ہیں مگر مفتی احمد یار
خان صاحب ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ دینی کام کی قید لگانا محض اپنی طرف سے ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ !
کیا بعید ہے کہ وہ یہ کہہ دیں گے

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں
الغرض مذموم بدعت صرف وہ ہے جو کارِ ثواب اور دین سمجھ کر کی جائے اور اسی کی مذمت

پر حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین اور سلف صالحین کا اجماع ہے چنانچہ علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ یعنی :

اجماع السلف الصالح من القحابة والتابعين حضرت صحابہ کرامؓ و تابعین اور تبع تابعین وغیرہم سلف صالحین ومن يليهم على ذلك (الاتصاف ص ۱۸۱) کا اسی بدعت کی مذمت پر اجماع و اتفاق رہا ہے۔

اور اس میں دینی کام کی قید موجود ہے۔ دنیوی امور اس بدعت میں ہرگز داخل نہیں ہیں بلکہ یقین سے یکساں ہو سکتا ہے کہ وہ مکروہ تک بھی نہیں چر جائیکہ وہ حرام اور بدعت مذمومہ میں داخل ہوں۔ ہمارے کہنے پر یقین نہ آئے تو آپ شیخ الاسلام ابن دقیق العید (المتوفی ۷۴۸ھ) کی سن لیجئے :

انا اذا نظرنا الى البدع المتعلقة بامور الدنيا ہم نے جب ان بدعتوں کو دیکھا جو امور دنیا سے متعلق ہیں لم نساو البدع المتعلقة بامور الاحكام الفرعية تو وہ ان بدعات کے مساوی نظر آئیں جو بدعات فرعی اصل البدع المتعلقة بامور الدنيا لا تکره وعل اصلاً بل كثير منها يجزم فيه بعدم الكراهة متعلق ہیں بالکل مکروہ بھی نہ ہوں بلکہ ایسی بہت سی و اذا نظرنا الى البدع المتعلقة بالاحكام دنیوی بدعات کے متعلق یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مکروہ الفرعية لم تكن مساوية للبدع المتعلقة بھی نہیں ہیں اور جب ہم نے ان بدعات کو دیکھا جو باصول العقائد - (احکام الاحکام ص ۱۵۷) فرعی احکام سے متعلق ہیں تو وہ ان بدعات کے مساوی نہیں جو بدعات اصول عقائد سے متعلق ہیں۔

اس عبارت کو ذہن نشین کر لیجئے جس میں صراحت سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بدعت عقائد میں بھی ہوتی ہے اور اعمال میں بھی۔ دینی امور میں بھی اور دنیوی میں بھی۔ مگر دنیوی امور کی بدعت نہ تو حرام ہے اور نہ مذموم، بلکہ مکروہ تک بھی نہیں۔ جو لوگ امور دنیاوی کو بدعت کی زد میں شامل کرتے ہیں، وہ نرے جاہل ہیں۔ ہم نہیں کہتے۔ مؤلف انوار ساطع شرح جوہر توحید سے نقل کرتے ہیں :

ومن الجفلة من يجعل كل امر لم يكن في زمن اصحابه بدعة مذمومة وان لم يقم دليل على قبحه تمسكاً بقوله صلى الله عليه وسلم لوگ جاہل ہیں جو ہر اس چیز کو جو حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں نہ تھی، بدعت مذمومہ قرار دیتے ہیں اگرچہ اس کی قب پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکی ہو، اور وہ جاہل۔

وسلم ایاکم ومحدثات الامم ولا یعلمون
 المواد بذلک ان یجعل فی الدین ما
 لیس منه - (انوار ساطعہ ص ۳۷)

دلیل پر پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 نے فرمایا کہ تم نہی نہی چیزوں سے بچو۔ اور وہ جاہل نہیں
 جانتے کہ محدثات الامم سے مراد یہ ہے کہ دین میں ایسی

چیز ایجاد کی جائے جو اس میں نہ ہو۔

ان تمام اقتباسات کو دیکھتے اور پھر مفتی احمد یار خان صاحب کی علمی تحقیق ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں :
 "آج کل دنیا میں وہ وہ چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں جن کا خیر القرون میں نام و نشان بھی نہ تھا، اور
 جن کے بغیر اب دنیاوی زندگی مشکل ہے۔ بشخص ان کے استعمال پر مجبور ہے۔ ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ہمدردی
 جہاز، تانگہ، گھوڑا گاڑی۔ پھر خط، لٹاؤ، تار، ٹیلیفون، ریڈیو، لاؤڈ سپیکر وغیرہ تمام چیزیں اور ان کا
 استعمال بدعت ہے، اور انہیں ہر جماعت کے لوگ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ بولو دیوبندی وہابی بغیر بدعت
 حسنہ کے دنیاوی زندگی گزار سکتے ہیں؟ برگز نہیں!" (انتہی بلفظ جارا الحق وزہق الباطل ص ۱۲)

اس کی تحقیق تو اپنے مقام پر آئے گی کہ بدعت حسنہ کیا ہے اور بدعت سیئہ کیا ہے؟ مگر سابق عبارت
 کو ملاحظہ کر کے مفتی صاحب کو مناسب ہے کہ وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنا محاسبہ کر لیں کہ غلطی ان
 کی ہے جو ہر نہی چیز کو بدعت کہتے ہیں یا دیوبندیوں اور وہابیوں کی ہے؟ سہ

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولی برق خرم کہے خون گرم دہقان کا

قارئین کرام! غور تو کیجئے کہ خود مفتی احمد یار خان صاحب حدیث من احداث فی امرنا هذا
 ما لیس منه فہورد کا کیا معنی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "بشخص ہمارے اس دین میں وہ عقیدے
 ایجاد کرے جو کہ دین کے خلاف ہوں وہ مردود ہے۔ ہم نے ہمارے معنی عقیدے اس لئے کہے کہ دین عقائد
 ہی کا نام ہے، اعمال فروع ہیں۔" (بلفظ جارا الحق ص ۱۲ و ص ۲۰)

مفتی صاحب سے دریافت کیجئے کہ آپ نے محض اپنی طرف سے احادیث صحیحہ اور اقوال علماء و
 فقہاء اور محدثین کے خلاف کرتے ہوئے کیوں دین کی قید لگائی ہے؟ خصوصاً جب کہ بقول آپ کے اشعۃ
 التلعات اور مرقات کی عبارتوں میں بھی دین کی قید نہیں لگائی گئی۔ فرمائیے کیا داعیہ پیش آیا ہے؟ اور

پھر یہ بھی خوب کہی کہ دین عقائد ہی کا نام ہے، اعمال فروغ ہیں۔ بلا شک نماز روزہ حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ احکام عقائد کے لحاظ سے فروغ ہیں مگر اپنے مقام پر وہ ارکان اسلام اور اصول دین بھی ہیں، اور قرآن کریم اور احادیث میں نماز اور جہاد وغیرہ احکام پر صراحت کے ساتھ نطق دین کا اطلاق کیا گیا ہے۔ بیسیوں مثالیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر ہمارا مقصد ابھی بہت وسیع ہے لہذا اشارہ ہی کافی ہے۔ الفرض عقائد ہوں یا اعمال، بدعت سب میں ہوتی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی محض اپنی طرف سے اختراع مفتی صاحب نے مآ کے معنی کو صرف عقائد پر بند لکھا ہے اور اسی کی بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "ثابت ہوا کہ بدعت عقیدے کو فرمایا گیا۔" (جہاد الحق صفحہ ۲۵)۔ آگے لکھتے ہیں: "بدعت اور بدعتی پر جو سخت وعیدیں احادیث میں آئی ہیں ان سے مراد بدعت اعتقادیہ ہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس نے بدعتی کی تعظیم کی، اس نے اسلام کے ڈھلنے پر مدد دی یعنی بدعت اعتقادیہ والے کی فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کتاب البعثات صفحہ ۱۱ میں ہے جس عبارت میں ایسی شدید وعید ہے وہ بدعت فی العقائد ہے جیسا کہ روافض خوارج کی بدعت۔" (ملفوظ، ج ۱۱ الحق وزہق الباطل صفحہ ۲۰)۔

بلا شک وعید شدید ایسی ہی بدعت پر وارد ہوئی ہے جو عقائد کی بدعت ہے مگر مفتی صاحب ہی بتاتے ہیں کہ کیا علم غیب، حاضر و ناظر اور غماز کل اور بشریت وغیرہ کے مسائل عقائد ہیں یا محض دل لگی کا سامان ہے؟ اور کیا ایسی شدید وعید ایسی بدعت اعتقادیہ پر آئے گی یا نہیں؟ خیر القرون میں تو یہ عقائد کسی کے دستے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ اگر وعید شدید کا اطلاق بدعت اعتقادیہ پر ہوتا ہے تو احکام اور فروغ اور غیر اعتقادی امور پر نفس بدعت کا اطلاق ہی نہ ہو اور ان پر نفس وعید بھی نہ ہو متعدد حوالے سپرد قلم کئے گئے ہیں کہ بدعت، اعتقاد اور عمل دونوں میں ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ کی عبارت میں قول و فعل کے الفاظ اور صاحب قاموس کی عبارت میں احوال و اعمال کی قید اور علامہ شمسؒ وغیرہ محققین کی عبارت میں علم و عمل اور حال کی قید اور ابن دقیق العیدؒ کی عبارت میں احکام فرعیہ اور اصول اعتقادیہ کی قید خاص طور پر مذکور ہے۔ حافظ ابن رجبؒ لکھتے ہیں کہ:

فکل من احدث شیئاً ونسبه الی الدین
ولم ین له اصل من الدین یرجع الیه
فهو ضلالة والذین بری منه وسواء فی
ذلك الاعتقادات او الاعمال او الاقوال
الظاہرة والباطنة واما ما وقع فی کلام
السلف من استحسان بعض البدع فانما
ذلك فی البدع اللغویة لا الشرعیة -
اور شیخ عبدالحی محمدؒ دہلویؒ لکھتے ہیں کہ :

”ولازم است اتباع سنت سنیہ اور عبادات و عادات و اعتقاد باید کرد کہ ہرچہ خلاف
سنت و طریقہ اوست باطل است و ہرچہ پیدا کردہ اند و ہرکہ پیدا کردہ است از انچه
بدل تغیر ہست و مخالفت آن لازم آید قولاً و عملاً و اعتقاداً ضلالت است و مردود
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو
رد و فرمود کل بدعة ضلالة و گفته اند ہرگز در ولی کہ گرفتار بدعت است نور ولایت
در نیاید۔ (مکتوبات شیخؒ مکتبہ برعاشیہ اخبار الاحیاء)۔

حضرت شیخ صاحبؒ کی اس عبارت میں ایک تویہ واضح کیا گیا ہے کہ جو چیز جناب رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت کی مغیرہ اور مخالف ہو، وہ بدعت ضلالت اور مردود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر
نوا ایجاد اور احداث مردود نہیں دینی ہو یا دنیوی۔ بلکہ وہ احداث مردود ہے جو سنت کا مغیرہ اور مخالف
ہو۔ دوسرے امر واضح ہوا کہ عبادات، عادات اور اعتقاد تمام چیزوں میں سنت کی پیروی لازم ہے
اور اس کی مخالفت بدعت اور مردود ہے۔ تیسرے امر واضح ہوا کہ کل بدعة ضلالة سے مراد کام مراد نہیں
جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحبؒ نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ بقول شیخ صاحبؒ اس سے شرعی بدعت مراد ہے جو
سنت سنیہ کے مخالف ہو، اور چوتھا یہ امر واضح ہوا کہ بدعتی میں نور ولایت کبھی نہیں آسکتا۔ اسلئے کہ نور ولایت

تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور بدعتی اس سے سراسر محروم ہوتا ہے۔
ایک دہم اور اُس کا ازالہ ممکن ہے مفتی احمد یار خان صاحب یہ فرمادیں کہ میں نے یہ تو نہیں کہا
 کہ دین کی قید اس حدیث میں نہیں ہے، میں نے تو یہ کہا ہے کہ دینی کام کی قید محض اپنی طرف سے ہے۔
 سو اس کا جواب یہ ہے کہ پیش کردہ عبارات میں دونوں قیدیں موجود ہیں۔ دین کی قید بھی اور عمل
 کی قید بھی۔ اور یہ روشن ہو چکا ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، جو بھی دین میں نواجا دیا جائے گا وہ باطل اور
 مردود ہے۔ اور حدیث من احدث فی امرنا ہذا ہا الما مطلق ہے۔ حرف ما عقائد اعمال اور
 اقوال و خواہشات سب کو شامل ہے جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کو محض عقائد پر بند
 کر دینا جیسا کہ مفتی صاحب نے کیا ہے سراسر باطل ہے بلکہ اس حدیث کے دوسرے سیاق میں صراحت
 کے ساتھ عمل کا لفظ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
 علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو بدعة۔ جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہماری طرف سے ثبوت
 (بخاری ج ۲ ص ۱۹۲ و مسلم ج ۱ ص ۱۷۱ و مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۱) موجود نہیں تو وہ کام مردود ہوگا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ بدعت صرف اعتقاد کا نام ہی نہیں بلکہ بدعت عملی
 بھی ہوتی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس ارشاد میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ جس کام کے لئے
 آپ سے ثبوت موجود نہ ہوا اور جس پر آپ کی مہر نہ لگی ہوگی ہو تو وہ عمل باطل اور مردود ہوگا۔

لیجئے ہم مفتی احمد یار خان صاحب کی زبانی ان کو یہ مسئلہ منوا دیتے ہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:
 "بدعت کے شرعی معنی میں وہ اعتقاد یا وہ اعمال جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ
 حیات ظاہری میں نہ ہوں بعد میں ایجاد ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدعت شرعی دو طرح کی ہوتی ہے
 اعتقادی اور بدعت عملی"۔ (بلفظ جامع الحق ص ۲۰۴)

۱۔ بلکہ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۱ کی روایت میں من صنع امرأ علی غیر امرنا فهو بدعة کے الفاظ آئے ہیں اور یہی الفاظ
 من غیر امرنا کے مسند احمد ج ۱ ص ۱۷۱ میں بھی ہیں یعنی جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہماری طرف سے ثبوت نہیں تو وہ مردود ہے۔

اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ بدعت دو طرح کی ہوتی ہے بدعت اعتقادی اور بدعت عملی اور وعید دونوں پر وارد ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بدعت اعتقادی پر وعید شدید آتی ہے اور بدعت عملی پر نفس وعید وارد ہوتی۔ مگر وعید کی مد اور اس کی زد میں دونوں بدعتیں آتی ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی ایک غلطی | وہ لکھتے ہیں کہ : ”اگر مان لیا جاوے کہ بدعت میں دینی کام کی قید ہے تو دینی کام اُسی کو تو کہتے ہیں جس پر ثواب ملے (الٰہی ان قال) اور دنیا کا کوئی کام بھی نیت خیر سے کیا جاوے اس پر ثواب ملتا ہے (الٰہی ان قال) لہذا مسلمان کا ہر دنیاوی کام دینی ہے۔ اب بتاؤ کہ نیت خیر سے پلاؤ کھانا بدعت ہے یا نہیں؟“ (جبار الحق ص ۲۱۲)۔

اس کا فلسفہ تو مفتی صاحب ہی جانیں کہ پلاؤ کی تخصیص میں کیا حکمت مضمر ہے؟ اور اس کا راز بھی وہی جانیں کہ لوگوں کو پلاؤ کھانے کی ترغیب کیوں دی ہے کھانے کی کیوں نہیں دی؟ مگر مفتی صاحب یہ تو بتائیں کہ کیا انہوں نے کتب فقہ اور اصول فقہ میں مباح کی تعریف بھی کہیں پڑھی ہے؟ اگر اور کتابیں نصیب نہیں ہو سکیں تو خلاصہ کیدانی ہی ملاحظہ کر لیتے۔ اور اگر وہ بھی دستیاب نہ ہو تو انوارِ ساطعہ تو پیش نظر ہی ہوگی جس سے رطب یا بس حوالے چن چن کر جبار الحق تیار کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ :

”اور بعضہ مباح یعنی اُن کے کرنے میں نہ ثواب نہ عذاب۔“ (ملفوظ انوارِ ساطعہ ص ۱۶۱)

یعنی مسلمانوں کے بعض کام ایسے بھی نکل آئے جن کے کرنے میں گو عذاب بھی نہیں مگر ثواب بھی نہیں ہے بلکہ خود مفتی صاحب نے اپنے استدلال میں ایک عبارت نقل کی ہے جس میں اس کی تصریح ہے کہ مباح سے ثواب متعلق نہیں ہوتا (دیکھئے جبار الحق ص ۲۱۵) مفتی صاحب کو اس سے بڑا ثبوت اور کیا درکار ہے؟ حذر

مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے دہان

اہل بدعت حضرات کا ایک اصولی مغالطہ | دیگر اہل بدعت حضرات عموماً اور مولوی عبد الستار صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ لیس منہ سے وہ عقائد

ملہ مباح وغیرہ کے متعلق توضیح ص ۲۱ میں لکھا ہے لایثاب ولا یعاقب علیہ۔ یعنی نہ تو اس کے کرنے میں ثواب، نہ تاجا ہے اور نہ عذاب۔

اور اعمال مراد ہیں جو سنت اور دین کے خلاف ہوں اور مخالفت کا یہ مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہی ان پر موجود ہو اور جو امور سکوت عنہا ہیں ان کا احداث بدعت نہیں اور اگر بدعت بھی ہوں تو بدعت حسنہ ہوں گے۔ چنانچہ مولوی عبدالستیم صاحب لکھتے ہیں کہ :

"پس جمیع اہل اسلام کو جاننا چاہیے کہ حدیث من احدث فی اہونا کے ذیل میں جو شارحین حدیث لکھ رہے ہیں کہ نکالنا اس چیز کا جو مخالفت کتاب و سنت کے نہ ہو بُرا نہیں۔ اس کے صاف یہی معنی ہیں کہ جس چیز کی نہی کتاب اور حدیث رسول اللہ میں موجود نہیں، اس کا نکالنا بُرا نہیں۔ اور جس کی نہی موجود ہو، وہ ایجاد و احداث مردود ہے۔ (ملفوظ انوار ساطعہ ص ۳۷۱)"

اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ :

"اگر اعمال بھی ہوں تو لیس منہ سے مراد وہ اعمال ہیں جو خلاف سنت یا خلاف دین ہوں۔" (ملفوظ ج ۱ ص ۲۱۳)

اجواب : یہ ان کی اُصولی غلطی اور جہالت کا بدترین مظاہرہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ ابھی حدیث نقل کی جا چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا (لیس علیہ امرنا) جس پر ہمارا ثبوت موجود نہیں تو وہ مردود ہوگا۔ یہ تو آپ نے نہیں فرمایا کہ وہ کام مردود ہوگا (نہینا عنہ) جس پر ہماری نہی موجود ہو یا جس سے ہم نے منع کیا ہو، اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جس چیز پر (باوجود اس کے کہ اُس وقت اس کا سبب اور محرک موجود تھا) آپ کی طرف سے ثبوت موجود نہ ہو تو وہ یقیناً بدعت ہوگی اگرچہ اس پر صریح نہی موجود نہ ہو۔

وثانیاً جس چیز پر آپ کی نہی موجود ہو وہ تو ممنوع اور منہی عنہ ہوگئی۔ وہ چیز احداث اور ابتداء کی مد میں کیسے رہی؟ پھر بدعت اور احداث کو الگ بیان کرنے کی کیا ضرورت رہی حالانکہ بدعت اور احداث نہیں سے الگ چیز ہے جیسا کہ صحیح روایات اور اجماع اُمت سے ثابت ہے۔

وثالثاً اگر احداث اور بدعت کی یہ تعریف ہے کہ اُس پر نہی موجود ہو تو پھر اس کی قسمیں بدعت

اور بدعتِ سنیہ کیسے بنائی گئی؟ کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نہیں کے بعد بھی اس کا احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ اس میں حسن موجود ہو؟ اور اس صریح نہیں کے ہوتے ہوئے علماء اُمت یہ نہ سمجھ سکے کہ آپ کی نہیں کا اقل درجہ کراہت ہے۔ پھر بدعت کے یہ احکام کہ واجب، مندوب، حرام، مکروہ اور مباح کیسے تجویز ہوئے (دیکھئے شرح مسلم للنووی ج ۱ ص ۲۸۵ و مدخل لابن امیر الحاج ج ۲ ص ۲۵۷)۔

و سلباً یہ کہنا کہ جس چیز کی نہیں کتاب و سنت میں نہ ہو، اس کا نکالنا اور کنا بُرا نہیں، یہ بھی سراسر باطل اور قطعاً مردود ہے اور محدثین عظام و فقہاء کرام کے صریح ضوابط کے خلاف ہے۔ علماء اسلام نے اس کی تصریح کی ہے کہ جیسے عزائم سے خدا تعالیٰ کی بندگی اور عبادت و خوشنودی کی حاجت ہے اسی طرح رحمتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی متعلق ہے اور جس طرح جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی کام کو کرنا سنت ہے اسی طرح کسی کام کو چھوڑنا بھی سنت ہے۔ لہذا آپ کے ترکِ فعل کی اتباع بھی سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔ چنانچہ حضرت ملا علی نقاریؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ایک حدیث شریف، یوں پیش کرتے ہیں :

ان الله يحب ان يؤتى رخصة كما يحب ان يؤتى عزيمة ان الله تعالى يحیی عزائم کی ادائیگی کو پسند کرتا ہے اسی طرح یوئی عن ائمة (مرقات ج ۱۵ ص ۱۵۸) داشتہ العزمین (۱۲۸) من وہ اسکو بھی پسند کرتا ہے کہ اسکی رخصت پر بھی عمل کیا جائے۔ نیز حضرت ملا علی نقاریؒ منکوة شریف کی پہلی حدیث ائمة الاعمال بالانقیات کی شرح میں یہ نقل کرتے ہیں :

والله تابعه كما تكون في الفعل يكون في الترك كالتابع جیسے فعل میں ہوتی ہے اسی طرح ترک میں بھی ايضا فمن واظب على فعل لم يفعله الشارع فتابعت ہوتی ہے۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر موافقت فہو مبتدع (مرقات ج ۱ ص ۱۷۱) کی جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہے۔

اور اسی موقع پر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ :

"اتباع سیمیناں کہ در فعل واجب است و ترک نیز اتباع جیسے فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک میں بھی

سلباً کتب ہذا کا ۲۸۷ بھی ملاحظہ کیجئے۔

می باید پس آنکو مواظبت نماید فعل آنچہ شارع مکروہ
باتشد مبتدع بود، کذا قال المحققون۔
اتباع ہوگی۔ سو جس نے کسی ایسے کام پر مواظبت کی
جو شارع نے نہیں کیا تو وہ بدعتی ہوگا اسی طرح محدثین

(اشعة اللمعات ج ۱ ص ۱۷۱) کرام نے فرمایا ہے۔

اور مظاہر حق ج ۱ ص ۱۷۱ میں بعینہ میضمون مذکور ہے :

شرح مسند امام ابو حنیفہ میں ہے :

والا اتباع کما یكون فی الفعل یكون فی الترتیب
فمن واطب علی ما لم یفعل الشارع صلی اللہ علیہ
وسلم فهو مبتدع لشمول قوله صلی اللہ علیہ
وسلم من عمل عملاً لیس علیہ امرنا فهو رد۔
اتباع بیسے ذل میں ت اسی طرح ترک میں بھی ہے۔
سو جس نے ایسے فعل پر مواظبت کی جسے شارع علیہ السلام
نے نہیں کیا تو وہ مبتدع ہوگا۔ کیونکہ اس کو آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یہ قول شامل ہے کہ جس
نے کوئی ایسا کام کیا جس پر مجاز اثبات نہیں تو وہ مردود ہوگا۔
(مواہب لطیفہ شرح مسند ابی حنیفہ بحث فتنہ بالقیس)

امام علامہ السید جمال الدین المحمّد (المتوفی ۷۵۰ھ) فرماتے ہیں :

ترکہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتہ کما ان فعلہ سنتہ
(مواہب لطیفہ بحث مذکور)۔ (الجنتہ ص ۱۷۱)۔
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز اور کام کو ترک کرنا
بھی سنت ہے جیسا کہ آپ کا فعل سنت ہے۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کا کسی کام کو نہ کرنا ایسا ہی سنت ہے جیسا کہ آپ کا کسی کام کو کرنا سنت ہے۔ اور جو شخص آپ کی
اس سنت پر عمل نہیں کرتا، وہ محدثین کرام کی تصریح کے مطابق بدعتی ہوگا۔ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں، کہ وہ
تمام کام جو اہل بدعت کرتے ہیں ان کے دواعی اور محرکات آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت بھی موجود تھے
مگر آپ نے ان کو ترک کیا ہے اور آپ کا ان کو ترک کرنا سنت ہے اور اس کی مخالفت بدعت ہے۔

لہ الجنتہ لا مصاب السنتہ مؤلف مولانا عبد الغنی خان صاحب صدر مدرس مدرسہ عین العلم شاہجہان پور ریسرچ ڈسٹریکٹ
محمد کنایت اللہ صاحب دہلوی کی بلند پایہ اور گراں قدر تقریظ موجود ہے۔ اس کتاب میں جہاں بھی الجنتہ کا حوالہ آئے گا
اس سے بھی کتاب مراد ہوگی۔ بڑی بہترین کتاب ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دعائیں صبح سے بچو، کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام دعائیں صبح نہیں کیا کرتے تھے (صحیح بخاری ج ۱ ص ۹۳۸)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ:

ان رفعکم ایدیکم بدعة ما زاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ هذا یعنی الی الصدر (مسند احمد ج ۲ ص ۶۷)۔
تبہاے (اس طرح) ہاتھ اٹھانے بدعت ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سینہ مبارک سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

حضرت عمارہ بن رزیہ (المتوفی ۸۵ھ) نے بشر بن مروان کو منبر پر دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا، تو سخت لہجہ میں یوں ارشاد فرمایا کہ:

قبّح اللہ ہاتھین الیدین لقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما یرید علیٰ ان یقول ہکذا ابیدۃ و اشار باصبعہ المسبحة (مسلم ج ۲ ص ۲۸۷)۔
اللہ تعالیٰ ان دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا تاس کوئے میں نے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اشارہ کی انگلی سے زیادہ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا (اور یہ دونوں ہاتھ اٹھا رہا ہے)۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت عمارہ بن رزیہؓ تینوں جلیل القدر صحابی ہیں اور وہ ایسے ائمہ کا سختی سے رد فرما رہے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اور ابن عباسؓ دعائیں صبح کرنے سے صرف اس لئے منع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ایسا نہیں کیا۔ اگرچہ دعا اپنے مقام پر ایک بہت بڑی عبادت ہے لیکن بقیہ صبح محض اس لئے منع ہے کہ آپ سے اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے ایسا ثابت نہیں۔ اور حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دعائیں ہاتھ اٹھانے ثابت ہیں مگر صرف سینہ مبارک تک ہی، اور تم لوگ سینہ سے اوپر اٹھا کر آپ کے عمل کے خلاف کرتے ہو، لہذا یہ فعل بدعت ہے۔ اور حضرت عمارہ بن رزیہؓ بشر بن مروان کے لئے قبّح اللہ الخ کے سنگین الفاظ سے صرف

لہ یعنی عمدی دعائوں میں کیونکہ استسقاء وغیرہ کی مخصوص ادویہ اس سے تنبیہ ہیں دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۱ و قال متفق علیہ۔

اس لئے بدو عاکتے ہیں کہ آپ کے فعل پر اس نے زیادتی کی ہے جو ہر الت میں قابلِ ملامت ہے۔

غور کیجئے کہ کس طرح یہ اکابر آپ کے عمل پر زیادتی کو اور تفسیر ہیئت اور کیفیت کو بدعت قرار دیتے اور اس سے منع کرتے ہیں علامہ سید الدین کاشغری الحنفی (المتوفی فی حدود ۸۳۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

و الزیادة علی ثمان رکعات لیلاً و علی اربع
رات کے وقت آٹھ رکعات سے زیادہ اور دن کے وقت
چار رکعات سے زیادہ ایک سلام کے ساتھ نقلی نماز پر
(منیۃ المصلی ص ۱۲) اکثر احناف کے اجماع سے مکروہ ہے۔

اور نہر الخافق میں اس کی تصریح ہے کہ مکروہ تحریمی ہے۔ حضرات فقہار احناف نے اس کی دلیل یہ
پیش کی ہے: لعدم ورود الاثر به۔ اس لئے مکروہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اثر اور دلیل موجود نہیں ہے
اور ملک العلما علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود انکاسانی الحنفی (المتوفی ۸۵۵ھ) بعض فقہار کرام سے
نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں یکره لان الزیادة علی هذا الترو عن رسول الله صلى الله تعالى
عليه وسلم الخ (البدائع والصنائع ج ۲ ص ۲۹۵)۔ یعنی یہ اس لئے مکروہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم سے اس سے زیادہ مروی نہیں ہے۔ اور صاحب بدایہ لکھتے ہیں کہ:

ودلیل الکراهة انه علیه السلام لم یزد علی
ذلك ولولا الکراهة لزد تعلیماً للجواز (بدایہ ج ۲ ص ۲۹۵)
کراہت کی دلیل یہ ہے کہ آپ سے زیادہ منقول نہیں اگر
کراہت نہ ہوتی تو آپ تعلیم جواز کیے زیادہ بھی کر دیتے۔

فتاویٰ کبیری، در مختار، فتاویٰ عجیب، فتاویٰ ابراہیم شاہی اور کنز العباد شرح اعداد میں ہے کہ:
یکره الدعاء عند ختم القرآن فی شہر رمضان
وعند ختم القرآن بجماعة لان هذا لم
ینقل عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم و
لا عن الصحابة (بحوالہ الجذ ص ۱۲)
رمضان میں ختم قرآن کے وقت دُعا کرنا اور اسی طرح
ختم قرآن کے وقت مل کر دُعا کرنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ
سے ایسا کرنا منقول نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے کہ حضرات فقہار کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کے
عدم فعل کو ایک مستقل قاعدہ اور ضابطہ سمجھ کر متعدد مقامات میں اس سے استدلال کیا ہے مزید پختہ

حوالہ جات اور سن لیجئے :

الامام المحقق المدقق علی بن ابی بکر الحنفی صاحب ہدایہ (المتوفی ۱۱۰۳ھ) لکھتے ہیں کہ :

ویکولہ ان یتنفل بعد طلوع الفجر باكثر من
رکعتی الفجر لانه عليه السلام لم يزد عليه
طلوع فجر کے بعد فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کوئی نایہ (نفل)
نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص ہونے کے اس سے
مع حرصه على الصلوة -

(ہدایہ جلد ۱ ص ۸۷) زیادہ نماز نہیں پڑھی -

آپ نے ملاحظہ کیا کہ شیخ الاسلام نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدم فعل کو کراہت کی دلیل بنایا ہے حالانکہ اس
موقع پر نفلی نماز کے ترک کرنے پر صاحب ہدایہ کی رائے میں کوئی صریح نئی موجود نہیں ہے۔ اور باوجود اسکے حضرت فقہاء احناف
کے دلیل "صاحب ہدایہ" انکو برا اور مکرر کہتے ہیں اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں اور اگر حدیث لا
صلوة بعد الفجر المسجدین (جو نصب الایہ ص ۲۵۵ وغیر میں ہے) صحیح کے ساتھ ثابت ہو جائے تو نور علی نور ممانعت قولاً
وفعلاً ثابت ہو جائے گی۔ ایک دوسرے موقع پر صاحب ہدایہ یوں لکھتے ہیں :

ولیس فی الکسوف خطبة لانه لم یُتقل - (ہدایہ ص ۱۵۶)
صلوة کسوف میں خطبہ نہیں کیونکہ خطبہ منقول نہیں ہے۔ جو

صلوة کسوف کے لیے شرط ہو جو خطبہ منقول ہے وہ ایک دم اڑا رکھے گیا۔

ایک صاحب ہدایہ عدم نقل کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہ نہیں فرماتے کہ آنحضرت صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے منع کیا ہے، اس لئے یہ ممنوع اور نہی عنہ ہے۔ اور ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ :

ولا یتنفل فی المصلی قبل صلوة العید لان
النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یفعل ذلك
اور عید گاہ میں نماز عید سے پہلے نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود نماز پر حریص
ہونے کے ایسا نہیں کیا۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ کراہت

عید گاہ کے ساتھ خاص ہے، یہ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ بھی

کہا گیا ہے کہ عید گاہ اور غیر عید گاہ دونوں میں کراہت ہوگی،

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عید گاہ وغیر

عید گاہ دونوں میں نماز نہیں پڑھی۔

لم یفعله - (ہدایہ جلد ۱ ص ۱۵۶)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ صاحب ہدایہ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عدم فعل کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش کیا ہے حالانکہ صراحتہ مرفوع حدیث سے نہیں اس پر پیش کرنا ایک شراب کر کہ آپ نے عید گاہ میں، یا عید کے دن کسی دوسری جگہ نفل پڑھنے سے علی الخصوص منع کیا ہے۔ بمؤلف انوار ساطعہ اور مفتی احمد یار خان صاحب کے نزدیک اس فعل کو برا اور مکروہ نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھی اس پر موجود نہیں ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی الحنفیؒ (المتوفی ۱۰۵۹ھ) نے صلوٰۃ رغائب (جو رجب میں پڑھی جاتی ہے) وغیرہ کے بدعت اور مکروہ ہونے کی یہ دلیل پیش کی ہے :

ان الصحابة والتابعين ومن بعدهم من
الائمة المجتہدين لم ينقل عنهم (کبریٰ ۴۳۳) سے یہ منقول نہیں ہے۔

مشہور حنفی امام احمد بن محمد جو احمد الفقہاء الکبار تھے (المتوفی ۲۴۱ھ) ایک مسئلہ کی تحقیق میں یوں ارقام فرماتے ہیں :

لانها بدعة لم تنقل عن الصحابة
والتابعين - (اوقات) یہ بدعت ہے حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ سے منقول نہیں ہے۔

فقہ حنفی کی مستند ترین کتاب محیط اور فتاویٰ عالمگیری سے کوئی مسلمان ناواقف ہوگا؟ ان میں صراحت سے یہ لکھا ہے :

قراءة الكافرون الى الانحرع الجمع
مكروهة لانها بدعة لم ينقل ذلك عن
الصحابة والتابعين (عالمگیری باب الکراہت ۲۶۲) منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کوئی صحیح روایت نہیں پیش کی جاسکتی جس سے یہ ثابت ہو کہ صلوٰۃ رغائب بر آپ کی بھی موجود ہے اور سورۃ کافرون کو آخر تک بالجمع پڑھنے سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ لیکن حضرات فقہاء احناف اس کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور بدعت بھی۔ اور دلیل صرف اتنی ہی پیش

کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ سے منقول نہیں ہے۔ اگرچہ ان پر صریح نہیں بھی موجود نہیں ہے۔ مولوی عبدالمصعب صاحب وغیرہ کے خود ساختہ اور خود تراشیدہ قاعدہ کے رُوسے ان اشبار کو بدعت اور مکروہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ان میں صریح نہیں بھی موجود نہیں ہے۔ دیکھئے اب مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ ان حضرات فقہاء احنافؒ کی بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے خفی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں یا صرف اسی پر عمل پیرا ہوتے ہیں کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے آور، دکھانے کے آور۔ ان عبارات میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کا خصوصیت سے حضرات فقہاء احنافؒ نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ یہ یہ کام حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ سے منقول نہیں لہذا بدعت ہے مفتی صاحب کو اپنی یہ عبارت دیکھ کر بدعت نہ کام ہے جو حضور علیہ السلام کے بعد پیدا ہوا اس میں صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کا ذکر نہیں، (واللہ اعلم) حق کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ خدا توفیق دے مرقاۃ اور اشعۃ اللمعات وغیرہ میں سنۃ الخلفاء الراشدينؓ مَا اَنَا عَلَيْهِ واصحابی اور خیر القرون کی حدیثیں بھی بغور دیکھ لیں کہ کیا حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کی بات کو تسلیم کرنا سنت ہے یا بدعت؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ بہار شریعت حصہ چہارم ص ۲۲ میں ہے شب قدر میں جماعت کے ساتھ نماز نفل بعض لوگ ادا کرتے ہیں فقہاء اسے ناجائز و بدعت کہتے ہیں اور لوگ اس بارے میں جو حدیث بیان کرتے ہیں محدثین اسے موضوع ہوتے ہیں۔

۱۔ حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب میں

بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی تحقیق نہایت مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بدعتِ حسنہ اور بدعتِ سیئہ کی قدرے وضاحت کر دی جائے تاکہ کسی کوتاہ فہم اور ابلہ فریب کو اس سے غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اور اگر ہو چکی ہے تو بشرط انصاف زائل ہو جائے۔

بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ لغوی بدعت اور شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر اُس نواہد یا عبادت کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پیدا ہوئی ہو، عام اس سے کہ وہ عبادت شرعی یا عادت۔ اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔ واجب، مندوب، حرام، مکروہ، مباح۔ اور شرعی بدعت وہ ہے جو قرآن ثلاثہ کے بعد پیدا ہوئی ہو اور اُس پر قولاً فعلاً، صراحتاً اور اشارتاً کسی طرح بھی شارع کی طرف سے اجازت موجود نہ ہو۔ یہی وہ بدعت ہے جس کو بدعتِ ضلالہ اور بدعتِ قلیجہ

اور بدعتِ مسیئہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور علماء نے اس کی تصریح کی ہے۔ ملاحظہ ہو :

ان البدعة علی قسمین بدعة لغویة و بدعت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لغوی بدعت ، اور بدعة شرعية فالقول هو المحدث مطلقاً دوسری شرعی بدعت۔ لغوی بدعت ہر نواہد کا عادیۃ کانت او عبادۃ وہی التي یقسمونها نام ہے جو عبادت یا عادت ، اور اسی بدعت کی پانچ قسمیں کی جاتی ہیں اور دوسری بدعت ہے جو طاعت کی مد میں کسی مشروع امر پر زیادت (یا کمی) کی جاتے مگر الزمنة الثلاثة بغیر اذن من الشارع لا قولاً ہو قرونی ثلاثہ کے ختم ہونے کے بعد اور یہ زیادتی شارع کے اذن سے نہ ہو ، نہ اس پر شارع کا قول موجود ہو اور ولا فعلاً ولا صریحاً ولا اشارةً وہی المراد رد فعل نہ صراحت اور نہ اشارہ ، اور بدعتِ ضلالہ بالبدعة المحکوم علیها بالضلالة۔

(ترویج الجنان ص ۱۶۱ والجذہ ص ۱۶۱) سے یہی مراد ہے۔

بدعتِ حسنہ اور قبیحہ کی مزید بحث کے لئے ارشاد الساری ج ۲ ص ۲۴۴، عمدۃ القاری ج ۵ ص ۳۵۶ نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۸۵ اور رد منہل ج ۲ ص ۲۵۷ وغیرہ کتابوں کی طرف مراجعت کریں۔

حافظ ابن حجر مکتھے ہیں کہ :

والتحقیق انها ان كانت مما تدرج تحت مستحسن فی الشرع فی حسنة وان كانت مما تدرج تحت مستقیم فی الشرع فہی مستقبحة والا فہی من قسم المباح وقد تنقسم الی الاحکام الخمسة (فتح الباری ج ۱ ص ۱۶۱)

تحقیق یہ ہے کہ اگر بدعت ، شریعت کی کسی پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعت حسنہ ہوگی اور اگر وہ شریعت کی کسی غیر پسندیدہ دلیل کے تحت داخل ہے تو وہ بدعتِ قبیحہ ہوگی ، ورنہ مباح ہوگی اور بدعت پانچ احکام کی طرف منقسم ہے۔

اسی کے قریب قریب عبارت علامہ عینی کی ہے۔ ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۵ ص ۳۵۶۔

اب اس بات پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ مستحسن فی الشرع کیسے اور مستقیم فی الشرع کیسے حضرت امام شافعی (المتوفی ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں کہ :

البدعة بدعتان بدعة خالفت کتابا و سنتا
 او اجماعاً او اثر اثنی بعض اصحاب رسول
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فہذا بدعة ضلالة
 و بدعة لم تخالف شیئاً من ذلک فہذا قد
 تكون حسنة لقول عمر نعت البدعة ہذا۔
 بدعت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ بدعت ہے جو کتاب یا سنت
 یا اجماع یا کسی صحابی کے اثر کے مخالف ہو ایسی بدعت مگر اسی
 اور دوسری بدعت وہ ہے جو ان میں سے کسی ایک کے مخالف
 نہ ہو تو ایسی بدعت کبھی اچھی ہوتی ہے جیسے کہ حضرت عمرؓ
 نے فرمایا۔ یہ کیا ہی اچھی نو ایجاد اور بدعت ہے۔

(موافقة منہ المعقول الصبح المنقول لابن تیمیہ علی منہاج السنۃ ج ۱ ص ۱۲۸)

اس کی پوری تحقیق قارئین کرام نے پڑھ لی ہے کہ مخالفت جیسے قول میں ہوتی ہے، اسی طرح فعل
 میں بھی مخالفت ہوتی ہے۔ جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود داعی و اسباب کے ترک کیا
 اور خیر القرون نے بھی اُسے ترک کیا تو وہ یقیناً بدعت اور ضلالت ہوگا۔ کیونکہ وہ کتاب و سنت اور اجماع
 خیر القرون اور قیاس صحیح کے مخالف ہے، اور جو ان میں سے کسی دلیل میں داخل ہو تو وہ کبھی اچھا ہوگا،
 جس پر ثواب ملے گا اور کبھی صرف مباح ہوگا جس پر نہ ثواب ہوگا نہ عقاب۔

قیاس کی بحث میں مجالس الابرار کا حوالہ اور مذکورہ بالا عبارتیں پیش نظر رکھ کر بدعت حسنة اور
 بدعت حسنة کی تعریف یوں ہوگی :- بدعت حسنة وہ دینی کام جس کا مانع آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 کے بعد زائل ہو گیا ہو، یا اس کا داعیہ، محرک اور سبب بعد کو پیش آیا ہو اور کتاب و سنت اور اجماع و
 قیاس سے اس پر روشنی پڑتی ہو اور ان میں سے کسی دلیل سے اس کا ثبوت ملتا ہو تو وہ بدعت حسنة اور باغیض
 دیگر لغوی بدعت ہوگی جو مذموم نہیں ہے۔ علامہ ابن رجبؒ وغیرہ کی عبارتیں نقل کی جا چکی ہیں جو اس پر
 صراحت سے دلالت کرتی ہیں۔ اور جس چیز کا محرک اور داعیہ اور سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 زمانہ مبارک میں موجود تھا مگر آپ نے وہ دینی کام نہیں کیا اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعینؓ
 نے بھی باوجود کمال عشق و محبت اور محرکات و اسباب کے نہیں کیا تو وہ کام بدعت قبیحہ اور بدعت حسنة
 اور بدعت شرعیہ کہلائے گا جو ہر حالت میں مذموم اور ضلالت و گمراہی ہوگا۔ باقی غیر مجتہد کا اجتہاد خصوصاً
 اس زمانہ میں ہرگز کسی بدعت کو حسنة نہیں قرار دے سکتا۔ چنانچہ حضرات فقہاء کرامؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

تو نصاب الفقہی آرہے ہر انچ بدعتِ حسنہ مجتہدان قرار داحہ اندہاں صحیح است و اگر کسے دیں زمانہ چیزے بدعتِ حسنہ قرار دہد خلاف است زیرا کہ در مصطفیٰ میگوید کہ کل بدعتہ ضلالتہ فی زماننا (انتہی) (فتاویٰ جامع الروایات - والجنہ منہ)۔ یعنی نصاب الفقہ میں ہے کہ بدعتِ حسنہ وہ ہے جس کو حضرات مجتہدینؑ نے بدعتِ حسنہ قرار دیا ہو۔ اور اگر کوئی شخص اس زمانہ میں کسی چیز کو بدعتِ حسنہ قرار دے گا تو وہ حق کے خلاف ہے کیونکہ مصطفیٰ میں ہے کہ ہمارے زمانہ میں ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس عبارت سے مراحات کے ساتھ یہ بات واضح ہو گئی کہ بدعتِ حسنہ صرف وہی ہوگی، جس میں حضرات مجتہدینؑ کا اجتہاد کار فرما ہوگا، اور اجتہاد و قیاس صرف اُن احکام اور مسائل میں ہی ہو سکتا ہے جو غیر منصوص ہوں اور ان کے دوائی اور اسباب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خیر القرون میں موجود نہ ہوں بلکہ بعد کو ظہور پذیر ہوئے ہوں۔ اس نئی تہذیب کے زمانہ میں جو شخص بدعت کو حسنہ قرار دیتا ہے اس کا قول سراسر باطل اور مردود ہے۔ اور ایسی چیز کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ سہ

اٹھا کر پھینک دو با بر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور یہی وہ بدعت ہے جس کے متعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ (وغیرہ) فرماتے ہیں کہ: چیزے کہ مرود و باشد حسن از کجا پیدا کند۔ (مکتوبات حصہ سوم ص ۱۷۱) یعنی جو چیز مردود ہے وہ حسن اور خوبی کہاں سے پیدا کرے گی؟

مشتی احمد یار خان صاحب کی تعلیٰ مفتی احمد یار خان صاحب نے تمام بدعاتِ سیدہ کو بدعاتِ حسنہ قرار دے کہ اور بزعم خود اس کارروائی پر مرقعات اور اشعۃ اللغات کی مجمل عبارتوں سے دلائل پیش کر کے یہ مورچہ ایسا فتح کیا کہ فاتحانہ بلکہ حاکمانہ رنگ میریوں فرماتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دیوبندی کوئی غیر مقلد اور کوئی شرک و بدعت کی رٹ لگانے والا ان چار چیزوں (بدعت، شرک، دین اور عبادت) کی تعریف ایسی نہیں کر سکتا جس سے اس کا مذہب بچ جائے۔ آج بھی ہر دیوبندی اور ہر غیر مقلد کو اعلانِ عام ہے کہ ان کی ایسی صحیح تعریف کرو جس سے محفل میلاد حرام ہو۔ (بلفظہ، ج ۱، ص ۲۱۱)۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے کسی کام کا خیر القرون میں نہ ہونا اور اس کا ترک کرنا سنت ہے۔ اور سنت کی مخالفت بدعت بھی ہے اور گمراہی بھی۔ مفتی صاحب ہی بتائیں کہ خیر القرون میں میلاد کس نے منائی؟ فیصلہ انہی پر ہے۔ بدعت کی تعریف تو اس کتاب میں ملاحظہ کر لیں، جس سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اکابرین علماء دیوبند کے کسی کام کو بدعت کے ساتھ دُور کی نسبت بھی نہیں ہے، اور شرک اور عبادت وغیرہ کی تعریف راقم الحروف کے رسالہ گلاستہ توحید وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے، اور اپنی خاص محفل میں تو خوب تعلیٰ کا اظہار کیجئے، مگر میدان میں تعلیٰ کا کوئی کام نہیں۔ آخر ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور بقول شیخ مصلح الدین سعدی (المتوفی ۱۱۹۹ھ) :

ہر پیشہ گماں مبرکہ خالی ست شاید کہ پلنگ خفتہ باشد
فائدہ : یہ تحقیق ان حضرات کے نظریہ کے مطابق ہے جو بدعت کی تقسیم کے قائل ہیں، اور جو حضرات اس تقسیم کے قائل نہیں (مثلاً حضرت مجدد الف ثانی وغیرہ) تو وہ بدعتِ حسنہ کو سنت میں داخل کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نزاع صرف لفظی ہوگا جیسا کہ مثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالستیم صاحب لکھتے ہیں :

”یہ کہ (جو) بدعت کی تقسیم نہیں کرتے وہ بدعتِ حسنہ کو سنت میں داخل کرتے ہیں پس بدعتِ حسنہ کا لفظ وہی کہے گا جو تقسیم بدعت کا قائل ہوگا۔ اور جو تقسیم کا قائل نہ ہوگا وہ بدعتِ حسنہ کو سنت کہے گا۔“ (انوار ساطعہ ص ۴۵)

باب سوم

بدعات کے جواز پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں
اُن پر ایک نظر

دیگر اہل بدعت حضرات عموماً اور مفتی احمد یار خان صاحب خصوصاً لا تسئلوا عن اشیاء (الآیۃ) اور قُلْ لَا اَجِدُ فِیْہَا اَوْحٰی اِلٰی مَحْضُوْمًا (الآیۃ) نفل کے کہتے ہیں۔ "نیز فرماتا ہے قُلْ مَا حَرَّمَ (اِطْل میں مِّنْ حَرَّمَ ہے) زِیْنَةُ اللّٰہِ الَّتِیْ اُخْرِجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبَاتِ مِنَ التَّوْذِی (الآیۃ) ان آیات سے معلوم ہوتا کہ حرمت کی دلیل نہ ملنا حلال ہونے کی دلیل ہے نہ کہ حرام ہونے کی۔ یہ حضرات اس سے حرمت ثابت کرتے ہیں الخ" (جاء الحق ص ۲۱۹)۔ ان آیات سے بدعات کے جواز پر تو ہرگز ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا جیسا کہ ظاہر ہے۔ مگر مرکزی نقطہ ان آیات سے اباحت کا سمجھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔

کیا اصل اشیاء میں اباحت ہے؟ اکثر مبتدعین حضرات بدعات کے جواز پر ان آیات سے غلط مفہوم اخذ کر کے یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ چونکہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اس لئے یہ کام جائز اور مُباح ہیں، اور اسی قاعدہ پر وہ بے شمار بدعات کی عمارت استوار کرتے ہیں چنانچہ مولوی عبد الستار صاحب چند احادیث کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں کہ ان احادیث سے علماء نے ایک اصل عظیم پیدا کی ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ (انوار ساطعہ ص ۳)۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں "بدایت فہرستہ جو حضرات کہ ہر بدعت یعنی کام کو حرام جانتے ہیں وہ اس قاعدہ ٹکلیف کے کیا معنی کریں گے کہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ۔" تمام چیزوں کی اصل یہ ہے کہ وہ مُباح ہیں یعنی ہر چیز مباح اور حلال ہے۔ پھر

اگے شامی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: المختار ان الاصل الباحۃ عند الجہود من الحنفیۃ
والشافعیۃ۔ جمہور حنفی اور شافعی کے نزدیک یہ ہی مسئلہ ہے کہ اصل مباح ہوتا ہے۔ (جارالحق
۳۱۸ و راجع ص ۳)۔

جواب: قطع نظر اس سے کہ بعض محققین کے نزدیک قاعدہ کلیہ صرف یہ ہے ان لا کلیۃ
اور اس سے بھی صرف نظر کر لیجئے کہ ہر بدعت حرام ہی نہیں ہوتی بلکہ بعض بدعتیں مکروہ بھی ہوتی ہیں،
دیکھنا یہ ہے کہ اباحتِ اصلہ کا کیا مفہوم ہے اور احادیث سے اس پر کیا روشنی پڑتی ہے؟ اور کیا یہ قاعدہ
حضرات فقہار کرامؒ کا اتفاقی اور طے شدہ ہے یا اس میں بھی اختلاف ہے؟ اور راجح مسلک کے رو
سے یہ کس گروہ کا مسلک ہے؟ اور یہ اختلاف درود و شرع سے قبل کا ہے یا بعد کا؟ نہایت متانت اور
سنجیدگی سے ان امور پر غور کرنا ہے۔ اولاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الامر
ثلثۃ امر بین سر شد لا فاتبعہ و امر
بین غیۃ فاجتنبہ و امر اختلف فیہ
فکملہ الی اللہ عز وجل۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کام
تین قسم کے ہیں ایک وہ کہ اس کا ہدایت ہونا واضح ہو سو
اسکا اتباع کرو اور دوسرا وہ کام ہے کہ اسکی گمراہی ظاہر ہو
سو اس سے اجتناب کرو۔ اور تیسرا وہ جس میں اشتباہ
واقع ہو سو اس کا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کرو۔
(دناہ احمد - مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳)

اس روایت کے آخری جملہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جس معاملہ کا حکم مخفی ہو اور اس
میں اشتباہ ہو تو ایسے معاملہ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر کے اُس میں توقف کرنا چاہیئے، نہ یہ کہ اس کے ساتھ
مباح کا سا معاملہ ہو۔ چنانچہ علامہ طیبی الحنفیؒ (المتوفی ۱۰۴۳ھ) لکھتے ہیں:

وما لم یثبت حکمہ بالشرع فلا تقل
فیہ شیئا وفوض امرہ الی اللہ۔
کہ جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو تو اس میں تم
کچھ بھی نہ کہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔

اور حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ فکملہ الی اللہ کی شرح میں لکھتے ہیں:
پس بسیار اور انجا و توقف کن در آں۔ سو اس کو تم خدا تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور

(اشعة المصابيح ج ۱ ص ۹) اس میں توقف کرو۔

اس حدیث اور اس کی شرح سے بخوبی علم ہو گیا کہ جس چیز کا حکم شرع سے ثابت نہ ہو اس میں توقف کیا جائے گا اور اس کا معاصر خدا تعالیٰ کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ نیز کہ اس کو مباح سمجھ کر اس پر جواز کا فتویٰ صادر کیا جائے گا۔ اور حضرت ابو ثعلبة الخشنی (المتوفی ۱۵۸ھ) کی وہ روایت بھی توفیق کی دلیل ہے جس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها و الله تعالى نهىكم فرائض متعين فرماتے ہیں سو ان کو حرم حرما ت فلا تنتهكوها وحد حلالاً مت ضائع کرو۔ اور کچھ چیزوں کو حرام کر دیا ہے سو ان فلا تعتدوها وسكت عن اشیاء من غیر نسیان فلا تبحثوا عنها۔

(رقاء الدارقطنی - مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۲) نسیان کے سوا کیا ہے سو ان سے بحث نہ کرو۔

یہ روایت بھی توقف کی دلیل ہے جیسا کہ ظاہر ہے باقی رہی وہاں سکت عنه فهو مما عفا عنه تو اس حدیث سے بھی توقف ہی مراد ہے۔ اس سے اباحت کا اثبات درست نہیں ہے کمالاً یحییٰ۔ مشہور امام علاء الدین محمد بن علی انصاری (المتوفی ۸۸۰ھ) لکھتے ہیں :

على ما هو المنصور من ان الاصل في بيني منصور مسلک یہ ہے کہ اصل اشیاء میں الاشیاء المتوقف۔ (در مختار ج ۱ ص ۱۸۱) توقف ہے۔

اور طوابع الانوار حاشیہ در مختار میں اسی موقع پر ہے :

على ما هو المنصور اي التأييد بالدلة القوية من ان الاصل في الاشیاء المتوقف فلا يعرف اباحة المباح الا بقوله وفعله عليه الصلوة والسلام۔ یعنی جس مسلک کی تائید قوی دلائل سے ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اصل اشیاء میں توقف ہے۔ سو مباح کی اباحت بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے سوا معلوم نہیں ہو سکتی۔

اور یہی مضمون اس موقع پر طحاوی حاشیہ در مختار میں بھی ہے۔

اور تعلیقات شرح منار میں ہے :

قال اصحابنا الاصل فيها التوقف الخ هذا
اصح شيء عندی فی هذا الباب لان التوقف
اصل التقوی فی الاموال المسکوت عنه
وهو مذهب ابی بکر وعمر وعثمان و
اشباههم من الصحابة والمصیح ان
الاصل فی الافعال التوریم وهو مذهب
علی وائمة اهل البيت ومذهب الکوفیین
منهم ابو حنیفة - (بحوالہ الجۃ ۱۶۵)

اور چارے اصحاب فرماتے ہیں کہ اصل اشیا میں توقف
ہے اور اس باب میں میرے نزدیک یہی صحیح ترین قول ہے کیونکہ
جس چیز کے بارے میں شریعت کی طرف سے سکوت ہو اس میں توقف
ہی اصل فتویٰ ہے اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ
اور ان کے پیغمبر جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ کا یہی مذہب ہے
اور صحیح بات یہ ہے کہ اصل افعال میں حرمت ہے اور یہی
حضرت علیؓ اور حضرت ائمہ اہل بیتؓ اور اہل کوفہ کا مسلک
ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔

لیجئے اس عبارت نے یہ آشکارا کر دیا کہ حضرت خلفار راشدینؓ میں سے تین حضرات اور اسی طرح دیگر
جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ مسلک ہے کہ اصل اشیا میں توقف ہے اور حضرت علیؓ اور اہل کوفہ کا صحیح
میں خصوصیت سے حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی شامل ہیں، یہ مسلک ہے کہ اصل اشیا میں حرمت ہے۔

اور شیخ احمد المعروف بہ ملا جیون الحنفیؒ (المتوفی ۱۱۲۰ھ) لکھتے ہیں :

ان الاصل فی الاشیاء الاباحۃ کما هو مذهب
طائفة بخلاف الجمهور فان عندہم الاصل
هو الحرمة الی ان قال وعند الشافعی الاصل
هو الحرمة فی کل حال - (تفسیر احمدی ص ۱۰۰)

کہ اصل اشیا میں اباحت ہے جیسا کہ ایک گروہ کا مسلک
ہے، جمہور اس کے مخالف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اصل اشیا
میں حرمت ہے اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اصل
اشیا میں یہ حال حرمت ہے۔

اور مشہور اصولی اور متحقق عالم ملا محمد شاہ بہاری الحنفیؒ (المتوفی ۱۱۲۰ھ) لکھتے ہیں :

الاباحۃ حکم شرعی لانه خطاب الشوع
تتمیماً - (مسلم الثبوت ۱۶۵) -

اباحت کلم شرعی ہے کیونکہ اباحت شرع کا خطاب ہے جس
میں کرنے اور نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اور علامہ ابن رشدؒ لکھتے ہیں :

وَمُخْتَرَفِيهِ وَهُوَ الْمَبَاحُ (بداية المجتهد واصل)۔ جس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ مباح ہے۔
 اور ملامین شرح مسلم میں کہتے ہیں کہ:
 المباحها اذن الشارع بالتخيير بين فعله مباح وہ ہے جس میں شارع نے اس کے کرنے اور نہ
 وتركه۔ کرنے میں اختیار دیا ہو۔

امام محمد بن محمد الغزالی (المتوفى ۵۰۵ھ) کہتے ہیں کہ:

وحد المباح انه الذي ورد الاذن من مباح کی تعریف یہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے
 الله تعالى بفعله وتركه غير مقرون بدم اس کے کرنے اور چھوڑنے کا اذن دیا گیا ہو۔ نہ تو اس
 فاعله ومدحه ولا بدم تاركه و کے کرنے والے کی مذمت اور تعریف ہو، اور نہ چھوڑنے
 مدحه۔ (المستصفى ج ۱ ص ۱۱۱)۔ والے کی مذمت اور تعریف کی گئی ہو۔

ان تمام عبارات سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ مباح بھی ایک شرعی حکم ہے جس کے کرنے اور
 نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے۔ اور کسی مباح کی اباحت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بعض نے اصل اشعار میں اباحت تسلیم کی ہے لیکن جمہور کا مسلک
 اس کے خلاف ہے حضرت علیؓ اور حضرات ائمہ اہل بیتؓ اور کوفہ کے فقہاء و محدثین اور خاص طور پر حضرت
 امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ اصل اشعار میں حرمت کے قائل ہیں اور باقی جمہور اصل اشعار میں توقف کے
 قائل ہیں بلکہ صاحب درمختار نے صاف لکھا ہے کہ:

القصيح من مذهب اهل السنة ان الاصل اهل سنت والجماعت کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اصل اشعار
 في الاشياء التوقف والا باحة حاشی میں توقف ہے اور اباحت کا قول معتزلہ کا خیال اور
 المعتزلة۔ (درمختار مجتہد ج ۱ ص ۱۱۱)۔ رائے ہے۔

مفتی صاحب تو دوسروں سے اس قاعدہ کا منہ نہ در یافت کرتے تھے مگر اس عبارت کو سامنے رکھ کر
 انہیں سوچنا چاہیے کہ اباحت کس کا مسلک ہے اور اس کے مختلف ہونے میں تو شاید ہی کوئی کوڑ مفر شک
 اور شبہ کرے گا۔ جب اصل ہی متفق علیہ نہیں تو اس پر قیاس کی دیوار رکھنا اور اس پر بدعات کی عمارت

کھڑی کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ علاوہ بریں جو علماء اباحت کے قائل ہیں وہ بھی اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ محبت اللہ صاحب اپنی بے نظیر اور دقیق کتاب میں فرماتے ہیں :

واما الخلاف المذكور بين اهل السنة ان اصل بهر حال اہل سنت و الجماعت کے درمیان جو اختلاف مذکور
الافعال الاباحۃ کما هو مختار اکثر الحنفیۃ ہے کہ اصل اشیا اور افعال میں اباحت ہے جیسا کہ اکثر حنفیہ
والشافعیۃ واصلھا الحظر کما ذهب اور شافعیہ کا مختار مسکت یا اصل ان میں منع ہے جیسا کہ
الیہ غیرہم وقال صدق الاسلام الاباحۃ فی دو سر علماء کا مسکت ہے۔ امام صدق الاسلام نے یوں تطبیق دی ہے
الاموال والحظر فی النفس (المستم الثبوت ص ۱۷) کہ اموال میں اباحت اصل ہے اور نفوس میں خطر اور منع اصل ہے۔

اس عبارت سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اہل سنت و الجماعت کا آپس میں اختلاف محض اباحت اور توقف تک ہی محدود نہیں بلکہ اباحت اور خطر و منع کا اختلاف بھی ہے۔ اگر ایک گروہ اشیا اور افعال کو اصل میں مباح کہتا ہے تو دوسرا ان کو اصل میں ممنوع اور محظور ٹھہراتا ہے اور امام صدق الاسلام اموال اور نفوس میں فرق کرتے ہوئے اول کو اصل میں مباح اور ثانی کو محظور اور ممنوع قرار دیتے ہیں۔

و ثانیاً جو حضرات اباحت اصل کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے کلام کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اصول امور تعبیریہ کے لئے نہیں بلکہ امور عادیہ کے لئے ہے۔ بالفاظ دیگر وہ معاملات میں تو اس قاعدہ کو قابل عمل بناتے ہیں لیکن عبادات میں اس پر عمل نہیں کرتے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو نہی نہی عبادات کے ایجاد کرنے کا حق ہوگا اور وہ ایجاد کردہ عبادتیں اسی اصول پر مباح اور درست ٹھہریں گی۔ مثلاً فرض کیجئے کہ کوئی بدعت پسند پانچ نمازوں کے علاوہ ایک چھٹی نماز ایجاد کرے اور اس کی ہر رکعت میں دو دو رکوع اور چار چار سجدے ایجاد کرے تو کیا اس اباحت اصل کے قانون سے اس نوا ایجاد نماز کو بھی جائز کہا جائے گا؟ الغرض اباحت اصل کے قانون کو عبادت میں جاری کرنا سراسر جہالت ہے۔ چنانچہ علامہ ابوالسحاق شاطبی غرناطی (المتوفی ۷۹۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

ولا یصح ان یتقال فیما فیہ تعبدانہ مختلف اور تعبیریہ کے متعلق یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ان کے بارے
فیہ علی قولین هل هو علی المنع ام هو علی میں بھی اختلاف ہے کہ آیا یہ ممنوع اصل ہیں یا مباح اصل۔

الاباحة بل هو امر زائد على المنع لان
التعدييات انما وضع الشارع فلا يقال في
صلوة سادسة مثلاً انها على الاباحة فللمكلف
وضعها على احد القولين ليتعبد بها لله
لانه باطل باطلاق - (الاعتصام ج ۱ ص ۱۷۱)
اور علامہ عبد الرحمن بن احمد بن رجب الحنبلی (الموتوی ۱۵۸۸) لکھتے ہیں :

وان كان قد زاد في العمل المشرع ما
ليس بمشروع فزيادته مردود ولا عليه معنى -
انما تكون قرينة ولا ثياب عليها ولكن
تاسر يبطل بها العمل من اصله فيكون
مردوداً كمّن زاد ركعة عمداً في صلاة
مثلاً وتاسر لا يبطله ولا يردّه من اصله
كمّن توجهاً اربعاً اربعاً -
(جامع العلوم والحكم ص ۱۷۱)

کہے (مگر ایسا شخص ثواب کا اہل نہ ہوگا)۔
اس سے معلوم ہوا کہ جس عمل مشروع کا فعل یا ترک کی صورت میں شریعت نے ایک معیار قائم کر
دیا ہے تو اس میں اپنی مرضی اور خواہش سے کوئی کمی یا زیادتی کرنا مردود ہوگا۔ اور اس زیادتی کی وجہ سے
کبھی تو سرے سے سارا عمل ہی مردود ہو جائے گا۔ اور کبھی بایں طور مردود ہوگا کہ اس پر ثواب نہ ملے گا۔
اور وہ قربت اور عبادت نہ ہوگا۔

و ثالثاً حضرات فقہار کہ ام کا یہ اختلاف کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حظر اور توقف،
تو یہ دُرودِ شرع سے قبل کا معاملہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دُنیا میں مبعوث ہونے سے قبل

ایک گروہ اشیاء و افعال میں اباحت کا قائل ہے اور ایک حرمت و خطر یا توقف کا (باستثنائے کفر کے کہ وہ ہر زمانہ میں حرام ہی رہا ہے) بالفاظ دیگر یہ اختلاف ہماری شریعت سے پہلے کابے ذکر شریعت کے اجراء کے بعد کا۔ شریعت نازل ہو چکنے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یا حرمت و خطر یا توقف۔ کیونکہ ہر عبادت اور ہر معاملہ کی شریعت مطہرہ نے حدود اور قیود متعین کر دی ہیں ان میں کمی و بیشی اور پس و پیش کرنا ہرگز صحیح اور درست نہیں ہے۔ لہذا اباحتِ اصلیہ کا قول بھی منقح احمدیہ خان صاحب وغیرہ کو مفید نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ عبد العلی محرم العلوم الحنفی (المتوفی ۱۲۲۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

بظہر من تتبع کلامہم ان الخلاف قبل
علا کے کلام میں خود کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف
ورود الشرع۔

نیز وہ اسی مسئلہ کی معتقدانہ بحث کرتے ہوئے ایک علمی تمہید کے بعد فرماتے ہیں:

فاذا ليس الخلاف الا في زمان الفتوة
الذي اندرست فيه الشريعة بتقصير من
قبلهم وحاصله ان الذين جاؤ بعد اندراس
الشريعة وجعل الاحكام فاما جعلهم هذا
يكون عندنا فيعامل مع الافعال كلها معاملة
المباح اعني لا يؤخذ بالفعل ولا بالترك
كما في المباح وذهب اليه اكثر الحنفية
والشافعية الى ان قال وانما هذا الى القول
بالاباحة الاصلية بناء على زمان الفتوة قبل
شريعتنا يعني اذ لا اباحة حقيقة بل معنى
نفي الحرج ولعل المراد من الافعال ما عدا
الكفر ونحوه فان حرمتها في كل شرع

اس تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اختلاف زمانہ فتوہ کے بلکہ
میں ہے جس میں پہلے لوگوں کی کوتاہی کی وجہ سے شریعت
مٹ چکی تھی اور اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جو شریعت
کے مٹ جانے کے بعد آئے اور احکام سے ان کو واقفیت نہ تھی
تو ان کا جہل تصور ہوگا اور سب افعال کے ساتھ مباح کا
معاملہ کیا جائے گا یعنی نہ فعل پر ان کا مواخذہ ہوگا اور نہ
ترک پر، جیسا کہ مباح کا حکم ہے اور یہی اکثر حنفیہ اور شافعیہ
کا مسلک ہے۔ (پھر آگے فرمایا) اور یہ بات یعنی اباحتِ اصلیہ
کا قول ہماری شریعت سے قبل زمانہ فتوہ پر محمول ہے۔
اور اباحت بھی بایں معنی کہ حرج کوئی نہ ہوگا اور شاید کہ
مراد افعال سے کفر وغیرہ کے علاوہ ہے۔ کیونکہ کفر وغیرہ کی
حرمت ہر ایک شریعت میں واضح اور غیر مبہم طور پر بیان

بَیِّنٌ ظَهْرًا مَاتًا۔ (نوائح الرعمت ج ۱ ص ۵۰) کی گئی ہے۔

اس عبارت سے یہ معاملہ بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ اکثر حضرات شافعیہ اور حنفیہ کا اباحتِ اصلیہ کے بارے میں جو مختار قول ہے وہ درودِ شریع سے قبل کے متعلق ہے۔ درودِ شریع کے بعد وہ اباحتِ اصلیہ کے پرکڑ قائل نہیں ہیں۔ اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب البدائع والصنائع میں اور خاص طور پر تلخیص شریع توضیح میں اس کی تصریح کی ہے کہ یہ اختلافات قبل البعثت کا ہے۔ قبل الشریع اور قبل البعثت کے الفاظ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں۔ الحاصل : اشیاء میں اباحتِ اصلیہ کا قول حضرات فقہاء کرام کماستفق علیہ قول نہیں بلکہ بقول صاحبِ درختار یہ معتزلہ کا مذہب ہے، اہل السنۃ کا نہیں اور اہل السنۃ میں بھی بہت سے علماء کا قول توقف بلکہ خطر بلکہ حرمت کا ہے۔ اور وہ بھی عبادات سے نہیں بلکہ معاملات سے متعلق ہے پھر اباحتِ اصلیہ کا قول درودِ شریع سے قبل کا ہے بعد کا نہیں۔ لہذا اس سے استدلال کر کے بدعات کی تردید کرنا جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کر رہے ہیں، دینِ اسلام سے اعلیٰ درجہ کی خیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو اس سے بچائے۔ مگر مفتی صاحب اور ان کی پارٹی کو اس سے کیا تعلق؟ ان کا تو اپنا کام بنتا رہے، اسلام بگڑے یا نہ ہو۔ بقول کبر الہ آبادی مرحوم

سہ ماہیں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے وہ دیکھیں مگر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے
مَنْ مِّنْ سَنَةِ حَسَنَةٍ سَ بَدَعًا پَرِئْتِ لَلْ اَوْزِ اس کا جواب اکثر بدعت پسند حضرات اپنے منہ پر اس روایت کو بطور دلیل پیش کیا کرتے ہیں۔ لہذا مناسب ہے کہ اس کو نقل کر کے اس کا جواب بھی دیا جائے حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ (ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب کا ہے)

مَنْ مِّنْ سَنَةِ حَسَنَةٍ سَ بَدَعًا پَرِئْتِ لَلْ اَوْزِ اس کا جواب
 کہ جس نے جاری کیا اسلام میں طریقہ نیک پہرچ کر جس طرح اس طریقہ
 حسنہ پر عمل کیا گیا تو کھانا جاوے گا اس شخص کے واسطے استدراجر
 اور ثواب کہ جتنا در سب عمل کرنے والوں کو اس کے بعد ہوگا اور ان
 لوگوں کے ثواب میں کچھ کاٹ کر اسکو دینگے (انوار الساطعہ ص ۲۴۷)

جواب : اس روایت سے بدعات کی تردید اور ان کے جواز پر استدلال کرنا باطل اور مردود ہے۔

اولاً اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ (دیجئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲) اور حضرت عبداللہ بن عباس (ملاحظہ ہو
 بامش مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲) اور حضرت غصیف بن الحارث الثمالی (دیجئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲) کی روایتوں میں اس
 امر کی تصریح موجود ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا من تمسک بسنتی
 جس نے میری سنت سے تمسک کیا اور مضبوطی سے اس کو پکڑا، اور فرمایا: فتمسک بسنتی خیر الخ
 کہ سنت کے ساتھ تمسک کرنا بہتر ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ اتنی کا کام سنت پر چلنا اور اس سے
 تمسک کرنا ہے، سنت جاری کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ رہا حضرات خلفاء راشدین اور دیگر حضرات صحابہ کرام
 اور خیر القرون کا معاملہ، تو محل نزاع سے خارج ہے، اور اس کی پوری بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وثانیاً خود اسی روایت میں من سن فی الاسلام الخ کے بجائے یہ الفاظ بھی آئے ہیں ایما
 داع دعا الی ہدی کہ جس داعی نے ہدایت کی طرف دعوت دی (مسلم ج ۲ ص ۲۳۱) وابن ماجہ ص ۱۰۷ و مجمع
 الزوائد ج ۱ ص ۱۶۸) اور اسی روایت کے دوسرے طریق میں ہے :

من احیا سنتہ من سنتی قد اُمنیت بعدی (ابن ماجہ ص ۱۰۷، ترمذی ج ۲ ص ۹۱، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۲)
 کہ جس نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد
 مردہ ہو چکی تھی۔

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے :

من احیا سنتہ من سنتی فعمل بہا الناس - الحدیث - (ابن ماجہ ص ۱۰۷)
 کہ جس نے میری سنتوں میں سے کوئی سنت زندہ کی کہ
 لوگ اس پر عمل پیرا ہوں۔

اور نیز فرمایا :

من استن خیراً (ابن ماجہ ص ۱۰۷)
 کہ جو شخص کسی اچھے راستے پر چلا۔
 اور ایک روایت میں ہے :

من علم علماً فلا اجر من عمل بہ لا ینقص من اجر العامل (ابن ماجہ ص ۱۰۷)
 جس نے کوئی علم سکھلایا تو اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا
 عمل کرنے والے کو اور اس کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔

ان روایات سے اس محل روایت کی تفصیل اور تشریح ہو جاتی ہے کہ سنت اور طریقہ کا جاری کرنا مرد

نہیں ہے بلکہ اس کی طرف دعوت دینا، اس کی تعلیم دینا، اس کو زندہ کرنا اور خود اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کرنا مراد ہے۔ اس سے یہ مطلب سمجھنا اور مراد لینا کہ از خود کسی سنت کو جاری کرنا ہے یقیناً غلط ہے اور ان روایات کی صریح خلاف ورزی ہے۔

و ثالثاً اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا شریعت میں دلائل و اشارہ ثبوت موجود ہو، اس کے اجراء کرنے میں ثواب ہوگا، اور وہ وہی فعل ہوگا جس کا داعیہ اور محرک خیر القرون میں موجود نہ ہو بلکہ بعد کوشش آیا ہو اور اولہ اربعہ میں سے کسی دلیل کے تحت وہ داخل ہو چنانچہ اسی حدیث میں حسنہ کی قید موجود ہے اور اہل سنت کے نزدیک کسی امر شرعی میں حسن یا قبح نہیں پایا جاسکتا جب تک کہ شریعت سے اس کا ثبوت نہ ہو۔ اور بدعات کی تو شریعت نے بڑا کٹ کر رکھ دی ہے، اس سے بھلا ان کا حسن ہونا کہاں سے اور کیسے ثابت ہوگا؟ الغرض اس روایت سے بدعات کے جواز پر استدلال کرنا محض جہالت اور شریعت مطہرہ سے خالص بغاوت ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کی ایک اور غلطی اکثر اہل بدعت ہر قسم کی بدعات کے جواز پر ایک حدیث پیش کیا کرتے ہیں جس کو مفتی احمد یار خان صاحب نے نقل کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

وقال عليه السلام ما رآه المسلمون حسناً
فهو عند الله حسن - (جامع الحقیقۃ)

اچھی ہے۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر وہ جملہ بدعات کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ چونکہ مسلمان ان کو اچھا سمجھتے ہیں، لہذا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوں گی، اور اچھے کام پر تو نہ گرفت ہوتی ہے اور نہ گناہ۔

اس روایت کے متعلق چند ضروری باتیں ہیں جن کو سمجھنا نہایت ہی اہم ہے۔

اول بحث یہ ہے کہ اگرچہ بعض حضرات فقہائے کرام نے اس روایت کو مرفوع بیان کیا ہے لیکن یہ روایت مرفوع نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعود پر موقوف ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین انزلی

الحنفی (المتوفی ۷۱۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

ولم اجده الا موقوفاً علی ابن مسعود۔ میں نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن مسعود پر

(نصب الرایح ۴ ص ۳۳۱) موقوف ہی پایا ہے۔

اور مشہور محدث، علامہ الامام صالح الدین ابوسعید العلانی (المتوفی ۷۸۴ھ) فرماتے ہیں :

لما جده مرفوعاً فی شیء من کتب الحدیث اصلاً ولا بسند ضعیف بعد طول البحث وکثرة الکشف والسوال وادما هو قول ابن مسعود موقوف علیہ (بخاری ۲۹۹۹) بن مسعود کا موقوف قول ہے۔

یہ اس روایت کو بنا وجود طویل بحث و تحیس اور زیادہ کموج اور سوال کے حدیث کی کسی کتاب میں کسی ضعیف سند کے ساتھ بھی مرفوع نہیں پایا، بلکہ یہ حضرت عبداللہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابی کا قول خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے بارگاہ نبوت میں معتد علیہ کا، اپنے مقام پر ایک وزنی دلیل ہے۔ مگر اصول حدیث کے رُوسے مرفوع اور موقوف کا جو فرق ہے وہ ہم نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جو حیثیت حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث کی ہے وہ یقیناً کسی صحابی کے قول کی نہیں ہے، اگرچہ وہ صحیح بھی ہو۔ حافظ ابن کثیرؒ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اس موقوف قول کو پیش کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :

اسناد صحیح - (البدایہ والنہایہ ۱۰ ص ۳۲۸) کہ اس کی سند صحیح ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ المسلمون سے کوئی مسلمان مراد ہیں ؟ اگر الف اور لام اس میں جنس کے لئے ہو تو لازم یہ آئے گا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اُمت کے بہتر فرقے سب کے سب تابعی ہو جائیں کیونکہ ہر ایک فرقہ از راہ تدین اپنے معمول کو حسن ہی سمجھتا ہے اور یہ اس حدیث کے خلاف ہے جو ما انا علیہ واصحابی کے الفاظ سے پیش کی جا چکی ہے۔ اور اگر الف اور لام سے استغراق مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس چیز کو تمام مسلمان اچھا سمجھیں وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوگی، تو اس سے اجماع اُمت مراد ہوگی، اور اجماع کے حسن ہونے میں کیا شک ہے ؟ لیکن اس سے مبتدعین کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ بدعات کا وجود خیر القرون میں برگز نہ تھا۔ لہذا سب مسلمانوں کا ان پر اتفاق و اجماع نہ ہوا۔ اور اگر الف و لام سے عہدِ غارؐ مراد ہو تو اس سے مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ مراد ہوگا کہ مسلمانوں کا وہ

لے علماء اصول کا یہ مسلک ہے کہ اصل الف و لام میں عہدِ غارؐ ہے (دیکھئے تلویح مکتبہ ۱۱ ص ۱۱۱ و غیرہ)

گروہ اور طبقہ جس چیز کو اچھا سمجھ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھی ہوگی اور مسلمانوں کا وہ گروہ اولین درجہ پر
 بقول حدیث ما انا علیہ واصحابی صرف حضرات صحابہ کرام کا گروہ ہی ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے کہ
 جس چیز کو حضرات صحابہ کرام پسند کریں وہ اچھی ہوگی۔ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود کی اس روایت اور
 ان سے مروی دیگر روایات کو سرسری نظر سے دیکھ لیا جائے تو المسلمون سے حضرات صحابہ کرام پر مہکا
 گروہ ہی متعین ہو جاتا ہے۔

پچنانچہ امام ابو داؤد طیالسی (المتوفی ۲۵۵ھ) نے یہ روایت ابن الغضائی سے نقل کی ہے :

ان الله عز وجل نظروني قلوب العباد فاختر
 محمد افعثه برسالاته وانتخبه بعلمه ثم نظر
 في قلوب الناس بعدا فاختر له اصحابه فجعلهم
 انصار دينه ووزراء نبويه صلى الله عليه
 وسلم فما راى المسلمون حسنا فهو عند
 الله حسن وما راى قبيحا فهو عند الله
 قبيح - (طیالسی ص ۳)

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو حضرت محمد صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنے علم کے بموجب رسالت کے لئے پچھا اور
 انتخاب فرمایا۔ پھر آپ کے بعد لوگوں کے دلوں کو دیکھا تو آپ
 کے صحابہ کرام کو انتخاب فرمایا اور ان کو اپنے دین کا مددگار
 اور اپنے نبی کا وزیر بنایا۔ سو جس چیز کو وہ مسلمان اچھا سمجھیں
 تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہوگی اور جس چیز کو
 وہ بُرا سمجھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بُری ہوگی۔

(کم و بیش یہی الفاظ مستم احمد ص ۳ میں بھی مروی ہیں۔ الذہبی ج ۴ ص ۳۳۱ والذہبی ص ۳۳۲)

اور امام ابو عبد اللہ الحاکم (المتوفی ۳۲۱ھ) صحیح سند کے ساتھ (جس کی تصحیح پر امام حاکم اور علامہ ذہبی
 دونوں متفق ہیں) اس روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

ما راى المسلمون حسنا فهو عند الله
 حسن وما راى المسلمون سيئا فهو عند
 الله سيئ وقد رأى الصحابة جميعا ان
 يستخلفوا اياكم

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں تو وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں
 بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو مسلمان بُرا سمجھیں تو وہ اللہ
 بھی بُری ہوگی اور تمام صحابہ کرام نے حضرت ابو بکر کو خلیفہ
 بنایا اور ان کی خلافت کو اچھا سمجھا لہذا ان کی خلافت
 عند اللہ بھی اچھی ہی ہوگی۔

(المستدرک ج ۳ ص ۳۵)

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کے لفظ میں حضرت صحابہ کرامؓ ہی کی طرف اشارہ ہے، بلکہ تصریح کرتے ہیں کہ المسلمون سے حضرت صحابہ کرامؓ کا پاک گروہ ہی مراد ہے۔ یہی نہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود المسلمون سے حضرت صحابہ کرامؓ ہی مراد لیتے ہیں بلکہ اُمت کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ حضرت صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چلیں اور ان کی خلافت و رزی نہ کریں۔ کیونکہ ان کی اتباع ہی میں فلاح ہے۔

وعن ابن مسعود قال من كان مستنًا
فليستن بمن قد مات فان الحى لا تؤمن
عليه الفتنة اولئك اصحاب محمد صلى
الله عليه وسلم كانوا افضل هذه الامة
ابوها قلوبا واعلمها علما واقبلها تكلفا
اختارهم الله لصحبة نبيه ولا قامة دينه
فاعرفوا لهم فضاهم واتبعوهم على اثرهم
وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم
وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم
(رواہ زرین مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۱۷)

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جو شخص سنت پر چلنا چاہتا ہے
تو وہ ان بزرگوں کے قدم پر چلے جو فوت ہو چکے ہیں کیونکہ
زندہ کبھی فتنہ سے مامون نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں جو اس اُمت کی نہایت
افضل لوگ اور نہایت بچلے قلوب والے اور نہایت گہرے
علم والے اور نہایت کم تکلف اور کم بناوٹ والے تھے۔ اللہ
تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کے قائم کرنے
کے لئے انتخاب کیا تھا۔ ان کی فضیلتوں کو پہچانو اور ان کے
نقش قدم پر چلو اور جو حد رہے ان کے اخلاق اور سیرت
کو مشعل راہ بناؤ کیونکہ وہ لوگ ہدایت مستقیمہ پر تھے۔

اس روایت نہایت صراحت اور وضاحت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے نزدیک المسلمون کا مصداق صرف اولئك اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم ہی تھے، اور یہی وہ مفہوم ہے جس کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مانا تھا علیہ وَاَصْحَابِہِ تَعْبِیْرُہِ فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف حضرت عبداللہ بن مسعود نے حضرت صحابہ کرامؓ کی اتباع کی تاکید اور اس کے خلاف ابتداء کی مذمت کی ہے۔

اتبعوا اثارنا ولا تتبدعوا فقد کفیتکم۔ ہمارے نقش قدم کی پیروی کرو اور اپنی طرف سے بدعتیں مت

(الاختصام ۵۴) ایجاد کر دیکر (دین مکمل ہو چکا ہے اور) تم کفایت کے لئے نبوت اور دوسری طرف سختی سے ان لوگوں کی ترویج کی اور ان کو مسجد سے نکال دیا جنہوں نے بل کر بلند آواز سے ذکر کرنے اور درود شریف پڑھنے کو پسند کیا تھا (جس کا ذکر باحاطہ کے لئے گانا شاعر اللہ تعالیٰ) اور ان کے اس فعل کو انہوں نے ہاراً المسلمون حسنا کے تحت حسن اور اچھا دیکھا کیونکہ ان لوگوں کا یہ طریقہ حضرات صحابہ کرامؓ کے طریقہ کے خلاف تھا۔

تیسری بحث یہ ہے کہ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ المسلمون سے حضرات صحابہ کرامؓ کے پاک نفوس مراد ہیں تو اس روایت کا مطلب یہ ہوا کہ جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے اچھا سمجھا تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہی ہوگی اور جس چیز کو حضرات صحابہ کرامؓ نے بُرا اور قبیح سمجھا تو وہ چیز عند اللہ بھی بُری اور قبیح ہی ہوگی۔ اور اہل بدعت حضرات کو اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا کہ بیشتر بلکہ جملہ وہ بدعات جن پر وہ کاربند ہیں حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت نہیں ہیں۔ اگر وہ چیزیں ان کے نزدیک بھلی اور اچھی ہوتیں تو وہ ہرگز ان سے نہ چھوڑتیں۔ اور اگر وہ ان کے نزدیک بُری اور قبیح نہ ہوتیں تو وہ ضرور ان پر عمل کرتے۔ ان کا علم بھی وحی اور عین تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق بھی کامل تھا۔ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت بھی ان میں اعلیٰ درجہ پر تھا لہذا جس چیز کو انہوں نے قبیح سمجھ کر اُس پر عمل نہیں کیا تو یقیناً وہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی قبیح اور بُری ہی ہوگی۔ ہر کیف یہ روایت جملہ بدعات کی ترویج کی دلیل ہے نہ کہ ان کی تائید اور ان کی ترویج اور اشاعت کی۔ مگر اللہ تعالیٰ جس کو مسرت کے سمجھنے کی توفیق دے اور پھر اس پر عمل کی توفیق بخشنے۔ یہ راستہ ہے تو کافی دشوار گزار مگر بحمد اللہ تعالیٰ

ہم خوش ہی خوش ہیں عشق سے گوارا عشق میں
زنجیر و طوق و دار و رسن جا بجا ملے!

باب چہارم

عبادات کے اندر اپنی طرف سے اوقات اور کیفیات کا تعین کرنا بدعت ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ کوئی چیز اصل ہی میں بُری ہو تو وہ بدعت ہوگی بلکہ وہ اہم طاعات اور عباداتِ بتی جن کو شریعت نے مطلق چھوڑا ہے اُن میں اپنی طرف سے قیود لگا دینا یا ان کی کیفیت بدل دینا، یا اپنی طرف سے اوقات کے ساتھ متعین کر دینا، یہ بھی شریعت کی اصطلاح میں بدعت ہوگی، اور شریعتِ اسلامی اس کو پسند نہیں کرے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ (المتوفی ۳۵ھ) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تختصوا
لیلة الجمعة بقیام من بین الیالی ولا تختصوا
یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یكون
فی صوم یصوم احدکم۔
کہ اپنے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے نماز اور قیام کے لئے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کے لئے خاص نہ کرو۔ مگر ہاں اگر کوئی شخص روزے رکھتا ہے اور جمعہ کا دن بھی اس میں آجائے، تو

(مسلم ج ۱ - ص ۳۶) الکتابات ہے۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فضیلت نماز جمعہ کی وجہ سے ہے محض اس فضیلت کے سبب

جمعہ کی رات کو نماز وغیرہ کے لئے اور دن کو روزہ کے لئے خاص کرنا صحیح نہیں ہے۔

علامہ ابراہیم حاکم شافعی بدعات کی تعیین اور تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

اور انہی بدعات میں سے کیفیات مخصوصہ اور ہدایت معینہ کا التزام ہے جیسے کہ ہیئت اجتماع کے ساتھ ایک آواز پر ذکر کرنا (پہراگے فرمایا) اور انہی بدعات میں سے خاص اوقات کے اندر ایسی عبادات معینہ کا التزام کہ لینا بھی ہے جن کے لئے شریعت مطہرہ نے وہ اوقات مقرر نہیں کئے ہیں۔

جب شریعت نے کسی چیز کی ترغیب دی مثلاً ذکر اللہ سو اگر ایک قوم اس کا التزام کرے کہ ایک زبان ہو کر ایک آواز سے وہ ذکر کرتی ہے یا دیگر اوقات کے علاوہ کسی معلوم اور مخصوص وقت کے اندر وہ ذکر کرتی ہے تو شریعت کی ترغیب اس معین تخصیص اور التزام پر ہرگز دلالت نہیں کرتی بلکہ وہ اس کے خلاف دلالت کرتی ہے۔

یعنی یہ خصوصیات وقت یا حال اور ہیئت، اور فعل مخصوص کیساتھ کسی خاص دلیل کی محتاج ہیں جو علی الخصوص ان کے استحباب پر دلالت کئے اور یہی چیز اقرب الی الصواب ہے۔

کہونکہ کسی چیز کے کسی خاص ہیئت کے ساتھ مستحب ہونے پر لازم اور لا بدی ہے کہ دلیل شرعی موجود ہو۔

پہراگے ردافض کی عید غدیر کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

ومنها التزام کیفیات والہیئات المعینۃ كالذكر بهيئة الاجتماع على صوت واحد (الی ان قال) ومنها التزام العبادات المعینۃ فی اوقات معینۃ لم یوجد لها ذلك التعلیل فی الشریعۃ۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۳۲)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں :

فاذا ندب الشرح مثلا الى ذكر الله فالتزم قوم الاجتماع على لسان واحد وبصوت واحد او في وقت معلوم مخصوص عن سائر الاوقات لم يكن في ندب الشرح ما يدل على هذا التخصيص الملتزم بل فيه ما يدل على خلافه۔ (الاعتصام ج ۱ ص ۳۳۵)

حافظ ابن دقین العید لکھتے ہیں کہ :-

ان هذه الخصوصيات بالوقت او بالحال والهيئة والفعل المخصوص يحتاج الى دليل خاص يقتضي استحبابه بخصوصه وهذا اقرب پہراگے لکھتے ہیں :-

لن الحكم باستحبابه على تلك الهيئة الخاصة يحتاج دليلاً شرعياً عليه ولا بد۔

پہراگے ردافض کی عید غدیر کی تردید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

ما احدثته الروافض من عيد ثالث سموه
عيد الغدير وكذلك الاجتماع واقامة شعارة
في وقت مخصوص على شئ مخصوص لم يثبت
شرعا وقريب من ذلك ان تكون العبادة من
جهة الشئ مرتبة على وجه مخصوص فيريد
بعض الناس ان يحدث فيهما امر اخر لم ترد
به الشرع زاعما انه يد رجة تحت عموم
فهذا لا يستقيم لان الغالب على العبادات
التعب وماخذها التوقيف -

(احكام الاحكام ج ۱ ص ۱۵۸)

شیعوں نے جو تیسری عید جس کو وہ عید غدیر کہتے ہیں ایجاد
کی ہے۔ اس کے لئے اجتماع اور اس کے بطور شعائے قائم
کرنے پر جو مخصوص وقت اور خاص ہیئت کے ساتھ کی
جاتی ہے کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اور اسی کے قریب
یہ بات بھی ہے کہ کوئی عبادت شریعت میں کسی خاص طریقہ پر
ثابت ہو، اور بعض لوگ اس کے اندر کچھ تغیر کر دیں اور خیال
یہ کریں کہ یہ بھی عموم کے نیچے داخل ہے تو ان کا ایسا خیال درست
اور صحیح نہ ہوگا کیونکہ عبادات کے اندر تعبدی طریقہ غالب ہے
اور اس کا مانع (جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
اور حضرت صحابہ کرامؓ) اطلاع پائے بغیر عمل نہیں ہو سکتا۔

(احكام الاحكام ج ۱ ص ۱۵۸)

صاحب مجالس الابرار ایک خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ مسجد میں اجتماعی طور پر ذکر کرنے والوں
کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی ایک روایت کا حوالہ دیتے ہوئے (اس روایت کا ذکر اپنے مقام
پر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں :

هكذا يقال بكل من اتى في العبادات البدنية
المحضة بصفة لم تكن في زمن الصحابة
(مجالس الابرار ص ۱۲۱)

کیونکہ اس تغیر ہیئت کی وجہ سے دین بدل جائے گا اور اسی کا نام تحریف دین ہے چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ
صاحب تحریف دین کے اسباب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

ومنها التشدد وحقيقته اختيار عبادات
شاقة لم ياتربها الشاوع كوام الصيام
والقيام والتبتل وترك التزوج وان يلتزم
اور ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ تشدد اختیار کر لیا جائے
اور اسکی حقیقت یہ ہے کہ ایسی مشکل عبادات کو اختیار کر لیا جائے
جن کے متعلق شریعت نے حکم نہیں دیا مثلاً کوئی دوا منی طور پر

السنن والآداب كالإتزام الواجبات (الی ان قال) فاذا كان هذا المتعمق او المتشدد معلوم قوم ورئیسہم ظنوا ان هذا امر الشیخ ورضاه وهذا اداء دھیان الیہود والنصری (حجة الشیخ اصلہ)

روزہ رکے اور قیام کرے اور عزائم کی اختیار کرنے اور کھانے پھوڑنے اور شکاریہ کستنوں اور مستحبات کا ایسا التزام کرنے، جیسے کہ واجبات کا کیا جاتا ہے (پھر فرمایا) جب کوئی ایسا متعمق یا متشدد کسی قوم کا علم یا رئیس بن جاتا ہے تو قوم پر خیال کر لیتی ہے کہ اس کا یہ عمل شرع کا حکم اور اس کا پسندیدہ امر ہے، اور یہی بیماری یہودی تھی یہود اور نصاریٰ کے صوفیوں میں۔

یہی وجہ ہے کہ قانون الہی نے انسانوں کو ان کی اپنی مرضی پر نہیں چھوڑا۔ عبادات و معاملات حتیٰ کہ حکومت اور سلطنت کے احکام میں بھی ان کو پابند کر دیا ہے تاکہ وہ اپنی اہوا و خواہشات کے تحت اللہ تعالیٰ کے دین کا حلیہ نہ بگاڑیں۔ ملا ابن خلدون لکھتے ہیں :

فجاءت الشرائع بحملہم علی ذلك فی جمیع احوالہم من عبادۃ او معاملۃ حتی فی الملک الذی ہو طبعی للاجتماع الانسانی فلجرتہ علی منہاج الدین لیکون الكل محوطا بنظر الشارع۔ (مقدمہ منہ)

شرائع اسلامیہ اسی لئے تو آئی ہیں کہ لوگوں کو تمام حالات میں (غلو و) عبادات میں یا معاملات حتیٰ کہ ملکی انتظام جو لوگوں کے اجتماع کا ایک طبعی امر ہے، دین پر ہی قائم رہنے کی تلقین کریں اور ان کو دین کے طریقہ پر محض اس لئے قائم رہنے کی تلقین کی ہے تاکہ ان کے تمام معاملات شارع کی نگاہ میں ہوں۔

مشہور فقیر ابو حنیفہ ثانی علامہ زین العابدین ابن حکیم المصری الحنفی (المتوفی ۲۴۱ھ) لکھتے ہیں :

لان ذکر اللہ تعالیٰ او قصد بہ التخصیص بوقت دون وقت او بشیء دون شیء لم یکن مشرعا و عا حین لم یرد بہ الشرع لانه خلاف الشرع۔ (بحر الرائق ج ۲ ص ۱۵۹)

اسلئے کہ ذکر اللہ کی جب کسی ایک ہی وقت کے ساتھ تخصیص کا قصد کر لیا گیا اور وہ ضرورت میں وہ نہ ہو یا کسی شے کے ساتھ ذکر اللہ کو مخصوص کر لیا گیا دوسری چیز کے ساتھ وہ خاص نہ کیا گیا تو وہ مشرع نہ ہو گا کیونکہ اس کے متعلق شریعت میں کوئی تخصیص نہیں آئی لہذا وہ خلاف شرع ہو گا۔

علامہ موصوف بھی یہی بتانا چاہتے ہیں کہ گو اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک بڑی عبادت ہے لیکن جب شریعت نے

اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ یا جبر اور انضار یا اجتماع و افراد وغیرہ کسی خاص کیفیت اور ہیئت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تو اس کو اپنی طرف سے کسی خاص وقت یا کسی خاص کیفیت کے ساتھ متعین کر دینا غیر مشروع ہوگا۔ بلکہ تحریفِ دین۔ اس لئے کہ شریعت نے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔

حضرت مجددِ اہلِ ثانیؒ ارشاد فرماتے ہیں :

”و عملِ فقیر نیز برہیں است و بیچِ روزے را بر روزِ
دیگر ترجیح نمی دهد تا آنکہ ترجیح آنها از شارع معلوم
نکند کالمجتہد و رمضان و نحو ہما“
اس فقیر کا عمل بھی اسی پر ہے کہ کسی دن کو کسی دن ترجیح
نہیں دیتا، تا وقتیکہ اُس کی ترجیح شارع سے معلوم نہ
کرے۔ جیسا کہ جمعہ اور رمضان وغیرہ کی ترجیح شارع
(مکتوبات حصہ چہارم ص ۷۱) سے معلوم ہو چکی ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ جب شریعت نے کسی رات یا دن کو کسی عبادت کے لئے مخصوص نہ کیا ہو، اور جب ذکر اللہ وغیرہ عبادات کو کسی خاص ہیئت اور کیفیت کے ساتھ متعین نہ کیا ہو تو اپنی طرف سے وقت اور کیفیت کا متعین کرنا اور اس تعین کا التزام کرنا بدعت بھی ہے اور غیر مشروع بھی۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا ایسی کیفیات اور ہیئت کی تعین سے متعلق کیا فیصلہ ہے؟
خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آئند سے خوش آئند اقوال اور بہتر سے بہتر اشعار ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا، وہ کامل اتباعِ رسول اور عمل ہے۔ انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اُس کے نیک اور معصوم اقوال اور خیالات نہیں، بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے نشہ دینی سے سرمست ہو کر اپنی جان دے دینا آسان ہے مگر پوری عمر ہر چیز میں، ہر حالت میں اور ہر کیفیت میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اتباع کے پُلِ صراط کو اس طرح طے کرنا کہ کسی بات میں سنتِ محمدی سے قدم ادا نہ ہو، سب سے زیادہ مشکل امتحان ہے۔ اس اتباع کے امتحان میں تمام حضرات صحابہ کرامؓ پورے اُترے۔ آپؐ کی زندگی کے آئینہ میں حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگیاں سجائیں اور یہ بولتی چالتی، جیتی جاگتی تصویریں مسلمان کی زندگی کی حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ

بن جاتی ہیں اور اسی اتباع کے صحیح جذبہ نے حضرات تابعین اور تبع تابعین اور بعد کو آنے والوں کا یہ اہم فرض قرار دیا کہ وہ آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا اور ایک ایک جنبش کو معلوم کریں اور کچھوں کو بتائیں تاکہ اپنے اپنے امکان بھر ہر مسلمان اس پر چلنے کی کوشش کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود: حضرت عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن کا گزر مسجد میں ذاکرین کی ایک جماعت پر ہوا جس میں ایک شخص کہتا تھا۔ **سُبْحَانَ اللَّهِ اَکْبَرُ** پڑھو تو علامہ طہیسی لوگ کنکریوں پر سو مرتبہ تجریر کیجئے۔ پھر وہ کہتا۔ **سُبْحَانَ اللَّهِ اَکْبَرُ** پڑھو تو وہ سوا بار تہلیل پڑھتے۔ پھر وہ کہتا، **سُبْحَانَ اللَّهِ اَکْبَرُ** پڑھو تو وہ سنگریزوں پر سو دفعہ تسبیح پڑھتے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ تم ان سنگریزوں اور کنکریوں پر کیا پڑھتے تھے۔ وہ کہنے لگے۔ ہم تجریر و تہلیل تسبیح پڑھتے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

فَقَالَ فَعِدُوا مِنْ سِيئَاتِكُمْ فَاَنَا خَافُ مِنْ اَنْ لَا يَضِيعَ مِنْ حَسَنَاتِكُمْ شَيْءٌ وَيَحْكُمَ بِآيَةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا اسْرَعَ هَلَكُوكُمْ هَؤُلَاءِ مَصَابِيهُ بَيْنَكُمْ مَتَوَافِرُونَ وَهَذِهِ آيَاتُهُ لَمْ تَبْلُغُوا اَنْتُمْ لَمْ تَكْسِرُوا (اَلَيْسَ اَنْ قَالَ) اَوْ مَفْتَحِي بَابِ ضَلَالَةٍ۔ (مسند دارمی ۳/۵۱ قلت بسند صحیح)

تم ان کنکریوں پر اپنے گناہ شمار کیا کرو۔ میں اس کا خائف ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہو گا۔ تعجب ہے تم پر اسے امت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کیا ہی جلدی تم ہلاکت میں پڑ گئے ہو۔ ابھی تک حضرات صحابہ کرام تم میں بکثرت موجود ہیں، اور ابھی تک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کپڑے پڑنے نہیں ہوئے اور ابھی تک آپ کے برتن نہیں ٹوٹے (آگے فرمایا) اندر میں حالات تم بدعت اور گمراہی کا دروازہ کھلتے ہو۔

علامہ قاضی ابراہیم صاحب، حضرت ابن مسعود کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں:

اَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ فَوَالَّذِي لَا إِلَهَ غَيْرُهُ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِنُذْرَةٍ أَوْ لَقَدْ فَتَمْتُكُمْ عَلَى أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (بخاری ۱۱/۱۸۱)

میں عبداللہ بن مسعود ہوں خدائے وحدہ لا شریک کے لڑکے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم نے یہ نہایت تباہی اور سیاہ بدعت ایجاد کی ہے، یا کیا تم علم میں بننا بنبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابہ سے بڑھ گئے ہو؟

اور شیخ الاسلام ابن قیمؒ کی ایک روایت کو ان الفاظ سے نقل کرتے ہیں :

فَقَالَ إِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَاخْبُرُونِي قَالَ فَاخْبُرُونِي
فَأَنَّا هُوَ ابْنُ مَسْعُودٍ مُتَّقِنًا فَقَالَ مِنْ عَرَفَنِي
فَقَدْ عَرَفَنِي وَمَنْ لَمْ يَعْرِفَنِي فَأَنَا عَبْدُ اللَّهِ
ابْنُ مَسْعُودٍ تَعْلَمُونَ إِنَّكُمْ لَا تَهْدُونَ
مَنْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ
أَصْحَابُهُ (إِلَى أَنْ قَالَ) لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِسِدَّةٍ
عَظِيمَةٍ أَوْ لَقَدْ فَضَّلْتُمْ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِلْمًا فَهَذَا ابْنُ
مَسْعُودٍ أَذْكَرَ هَذَا الْفِعْلَ مَعَ أَهْلِكَ
أَدْرَاجَهُ تَحْتَ عَمُومِ فَضِيلَةِ الذِّكْرِ -
(احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۵۷) کے عام دلائل کے تحت اس کا ادراج ممکن تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا مطلب اس سے صرف یہ تھا کہ اگرچہ بحیرہ تبہیل اور تسبیح و تہمید کی بہت کچھ فضیلتیں وارد ہوئی ہیں اور وہ محبوب ترین ذکر ہے لیکن اس کا یہ خاص طرز و طریقہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کا بتایا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ خود تمہارا ایجاد کردہ ہے۔ لہذا یہ دعوت ضلالت بھی ہے اور گمراہی بھی، بدعت غلطی بھی ہے اور بدعت ظلماء بھی اور بقول امام ابن قیمؒ العید اس مخصوص کیفیت کو حضرت عبداللہ بن مسعود نے فضیلت ذکر کی عام دلیلوں کے نیچے داخل نہیں کیا۔

اور اس روایت کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالستیع صاحب لکھتے ہیں :-
"عبداللہ بن مسعود نے جبر سے ایک جماعت ذکر اللہ کرنے والوں کو دھمکایا اور ان کے فعل کو بدعت قرار دیا کتب فقہ اور حدیث میں یہ روایت مذکور ہے" (انوار ساطعہ ص ۲۴۸)۔ اور دوسری جگہ لکھتے ہیں :- "اس روایت میں لفظ قاص ہے۔ یعنی ایک آدمی قصہ گورات کے وقت قصہ کہنے بیٹھا تھا، اور درمیان قصہ گوئی

کے لوگوں کو کہتا جاتا تھا کہ ایسا کہو، ایسا کہو۔ یہ خبر عبداللہ بن مسعود کو پہنچی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور ان کو دھمکایا کہ تم نے یہ بدعت نکالی ہے۔ واضح ہو کہ یہ انکار کناعروض ہیئت جدیدہ کے سبب نہ تھا بلکہ وہ اس کا مجمع کرنا قصہ گوئی کے واسطے یہ خلافِ شریعت تھا، گو ذکر اللہ بھی کبھی کبھی درمیان میں ہوتا ہو، اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصہ گوئوں کو جو بے اصل قصہ بیان کرتے تھے مسجد سے نکال دیا کرتے تھے؟ (انوارِ ساطعہ، بلفظ ۳۸)۔

مولوی عبداللطیف صاحب نے اصولی طور پر یہ روایت تو صحیح تسلیم کر لی ہے۔ ہاں البتہ اسکی تاویل کی ہے کہ یہ مجلس بے اصل قصہ گوئی کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود کو پسند نہ آئی اور اسلئے انہوں نے اس کو بدعت اور ضلالت کہا۔ اور اس کی دلیل لفظ قاص ہے (ایک قصہ گو) اور ذکر اللہ کی یہ توجیہ کی کہ ذکرِ غرضی طور پر کبھی کبھی اُٹھائے قصہ گوئی میں ہوتا رہا۔ مگر صاحب انوارِ ساطعہ کی یہ تاویل نہایت رکیک اور سراسر باطل ہے۔ اَوَّلًا اسلئے کہ جس روایت اور روایت کے جن الفاظ سے ان کو دھوکا ہوا ہے وہ یہ ہیں:

قاص یجلس باللیل ویقول للناس قولوا کہ ایک بیان کرنے والی بات کو میٹھ جاتا اور لوگوں سے کہتا کذا و قولوا کذا۔ (احکام الاحکام ج ۱ ص ۱۵۷) تم یہ کہو اور تم یہ کہو۔

یہ روایت اور اس کے الفاظ صراحت کے ساتھ اس بات کو آشکار کرتے ہیں کہ وہ قاص لوگوں ہی سے کہلاتا تھا، اور ان کو طریقہ بتلاتا تھا کہ تم یہ کہو، تم یہ کہو۔ اس روایت میں کہیں شائبہ بھی اس کا ذکر نہیں کہ وہ بیہودہ اور لالچنی قصہ گوئی کرتا تھا، اور درمیان میں کبھی کبھی لوگوں سے ذکر اللہ بھی کوفایا کرتا تھا۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ جو کچھ وہ کہتا جاتا تھا وہی کچھ جملہ اہل مجلس کہتے جاتے تھے۔ وثانیاً، ہم نے مسند دارمی کی صحیح روایت سے یہ عرض کر دیا ہے کہ وہ سو سو مرتبہ اللہ اکبر، سو سو مرتبہ لا الہ الا اللہ اور سو سو مرتبہ سبحان اللہ وغیرہ ان کو پڑھواتا تھا، اور وہ اس کے پیچھے پیچھے پڑھتے جاتے تھے۔ اور ان کا اس اجتماعی ہنگام میں ذکر کرنا ہی حضرت ابن مسعود کو ناگوار گندا اور اسی کو انہوں نے بدعتِ ضلالہ اور بدعتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ صاحب انوارِ ساطعہ کا یہ کہنا کہ انکار کناعروض ہیئت جدیدہ کے سبب نہ تھا ان کی ذاتی اختراع اور لہجہ باندہ ہے جو کسی صورت میں بھی قابل

التفات نہیں ہے۔ مسند دارمی کا بعض مضمون مکرر ملاحظہ کر لیا جائے۔

فرقت علیہم فقال ما هذا الذي اراكم
تصنعون قالوا يا ابا عبد الرحمن حضا
نعد به التكبير والتهليل والتسبيح
قال فعدوا سيئاتكم۔ (الحديث)

حضرت عبداللہ بن مسعود انکے پاس کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ
یہ کیا معاملہ ہے جو میں تم سے دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا
اے ابو عبد الرحمن (یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی کنیت تھی)
ہم ان سنگریزوں پر اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ
شمار کرتے ہیں۔ فرمایا تو تم ان پر اپنے گناہ شمار کرو۔
(مسند دارمی ص ۳۵)

نور فرمائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صاحب انوارِ ساطعہ کے اقتباس ہی ازہ انصافیہ فرمائیں کہ حضرت
عبداللہ بن مسعود نے قصہ گوئی کو بدعتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے یا سنگریزوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنے کو؟
اور یہ انکار عروضِ بیعتِ جدیدہ کی وجہ سے تھا یا قصہ گوئی کی وجہ سے؟ اور ان لوگوں نے اپنا قصہ پورنگریزوں
اور کنکریوں پر تکبیر و تہلیل اور تسبیح پڑھنا بیان کیا ہے یا قصہ گوئی سُنتا؟ اور حضرت ابن مسعود نے فعدوا
سیئاتکم ارشاد فرما کہ تکبیر و تسبیح وغیرہ کے شمار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس فعل کو بدعت
کہا ہے یا اس سے قصہ گوئی کا کنکریوں پر شمار کرنا مراد ہے؟ الغرض صاحب انوارِ ساطعہ کی تاویل سراسر
مردود ہے۔ حضرت ابن مسعود کا انکار صرف عروضِ بیعتِ جدیدہ کی وجہ سے تھا۔ اسی کی طرف شیخ الاسلام
ابن دینار نے اشارہ کیا ہے اور اسی کو قاضی ابراہیمؒ نے بصفة لم تکن فی زمن الصحابة
سے تعبیر کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ حضرت ابن مسعود کا انکار اس مخصوص بیعت اور خاص کیفیت کے
ساتھ اور متعین صفت کے ساتھ ذکر اللہ پر جمع ہونے کی وجہ سے تھا اور اسی کو انہوں نے بدعتِ ظلماء
اور بدعتِ عظمیٰ اور ضلالت فرمایا ہے۔

وَنَالِشًا لَفْظَ قَاصٍ كَمَعْنَى نَفْتٍ عَرَبِيٍّ فِي بَيَانِ كَرْنِ وَالْأَبِ، عَامٍ اس سے کہ اچھی بات بیان
کے یا بُری۔ ہاں عرف میں قاص قصہ گو کو کہتے ہیں عام اس سے کہ وہ اچھے قصے بیان کرے یا بُرے۔
لفظ قاص سے علیٰ تعین قصہ گو مراد لینا اور قصہ گو سے بے اصل قصہ گو مراد لینا عجیب منطق ہے۔ صاحب انوارِ ساطعہ
قرآن کریم میں يَقْصُ الْحَقُّ يَا قَاصُ الْقِصَصِ اور قَصَّ عَلَيْهِ الْقِصَصِ وغیرہ کی طرف

دھیان کرتے تو ہرگز ٹھوکر نہ کھاتے۔

حضرت ابن مسعودؓ اور باواز بلند مسجد میں مل کر درود شریف پڑھنا | درود شریف کا پڑھنا ایک بہت بڑی عبادت ہے مگر انفرادی طور اور آہستہ۔ چنانچہ مشہور فقیر علامہ محمد بن محمد الخوارزمی المشہور بابرازی الحنفیؒ (المتوفی ۸۲۷ھ) صاحب بزازیر جہر بالذکر کا مسئلہ نقل کرتے ہیں :

عن فتاویٰ القاضی انہ حرام لما صح
عن ابن مسعودؓ انہ اخرج جماعۃ من
المسجد یهللون ویصلون علی التبی
صلی اللہ علیہ وسلم جہراً وقال لہما
اراکما مبتدعین۔ (شامی ج ۲ ص ۲۵)
(فتاویٰ بزازیر ج ۳ ص ۳۷۷ علی هامش الهندیہ)
قاضی صاحب کے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ جہر سے ذکر کرنا
حرام ہے کیونکہ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ صحیح روایت کیا ہے
یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو مسجد سے
محض اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے لا الہ الا اللہ
اور بلند آواز سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود
شریف پڑھتی تھی اور فرمایا کہ میرے تہیں بدعتی نبیؐ کی کتابوں
انقلاب زمانہ دیکھئے کہ آج جو شخص بلند آواز سے جماعت کے ساتھ مل کر درود شریف نہیں پڑھتا،
اہل بدعت اس کو مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ مگر حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ نے بلند آواز کے ساتھ مسجد میں جہر
کے ساتھ درود شریف پڑھنے والوں کو مسجد سے نکال دیا اور فرمایا۔ میرے نزدیک تم بدعتی ہو۔ فریق مخالف کو
اس صحیح روایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔

قاریؒ کی کام نے حضرت ابن مسعودؓ کا فیصلہ تو ملاحظہ کر ہی لیا ہے۔ اب، ذرا مولوی محمد عمر صاحب
اچھروی کی بھی سن لیجئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں: ”فرقہ دہلیہ دیوبندیہ نماز کے بعد بلند آواز سے اجتماعی طور پر
درود شریف پڑھنے کو بدعت کہتے ہیں اور پڑھنے والے کو روکتے ہیں۔ اور احناف کی مساجد میں صلوٰۃ فریضہ
کے بعد درود شریف کو بلند آواز سے لازمی پڑھا جاتا ہے۔ اب تم اپنے عمل سے فیصلہ کرو کہ تم وہابی ہو یا حنفی انتہی
(بلفظ مقیاس خفیت ص ۲۱۹) مولوی محمد عمر صاحب اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر اور گریبان میں منہ ڈال کر خوف
خدا کو دل میں رکھتے ہوئے اور قبر و آخرت کا نقشہ سامنے رکھ کر فیصلہ خود صفا اور فرمایاں کہ حضرت ابن مسعودؓ
اس فیصلہ کے بموجب بدعتی ہیں یا بدعتی؟ اور بلند آواز سے اجتماعی طور پر درود شریف پڑھنے کو ضرور دیندگی

وغیر وہی بدعت کہتے ہیں یا حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی بدعت کہا ہے؟ ہوش میں اگر جواب دیجئے۔
باقی خود کو رہانی طور پر حنفی کہہ دینے سے کوئی حنفی نہیں بن جاتا۔ سچ ہے مگر

نہ ہر کہ سربراہ شد قلندری داند

یہ روایت فریق مخالف کے ہاں بھی صحیح اور مسلم ہے۔ چنانچہ مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں: چنانچہ
حموی میں ہے فی فتاویٰ القاضی الجہر بالذکو حرام وقد صح عن ابن مسعود انه سمع قوما اجتمعوا
فی مسجد یصلون علیہ الصلوٰۃ والسلام جہراً فراح الیہم وقال ما عهدوا ذلک
علیٰ عہدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وما اراکم الا مبتدعین فما زال یدکر ذلک حتی اخرجہم
من المسجد۔ اور روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے ان لوگوں کو فقط احداثِ بیعت
جدیدہ کیلئے نہیں بلکہ یہ سمجھ کر نکالا تھا کہ یہ ذکرِ جہر کرنا ان کا ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہے، اور یہ
ہی ہم کہتے ہیں کہ جو احداثِ مخالف امر شائع کی ہو وہ منع ہے الخ“ (ملقطہ انوار ساطعہ ص ۳۸-۳۹)

الغرض علامہ قاضی، امام بزاز، علامہ شامی اور علامہ حموی سب کے سب بزرگ حضرت ابن مسعود
کی اس روایت کو قد صح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کو صحیح کہتے ہیں اور خود صاحب انوار ساطعہ و قد صح کے الفاظ
سے اس کی تصحیح نقل کرتے ہیں۔ اگر امام سیوطی کو اس کی سند معلوم نہیں ہو سکی، جیسا کہ سباحۃ النکوح ص ۶۸ میں
نقل کیا گیا ہے کہ اس اثر کی سند اور اس کے غرض کا پتہ ہونا چاہیے تاکہ اس کی صحت اور ضعف کا حال کھلے، تو
اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اور صاحب روح البیان نے جو اس روایت کو بلا وجہ بحث
اور افترا کہا ہے (تفسیر روح البیان جلد ۲ ص ۲۴۳) تو ان کا قول سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔ وہ تو
موضوع اور جعلی حدیثوں کو صحیح، اور صحیح احادیث کو ضعیف کہہ جاتے ہیں۔ پھر حدیث کی تصحیح اور تضعیف
اُن کا مقام ہی نہیں ہے۔ یہ مسلم محدثین اور صاحب بصیرت فقہار کا کام ہے۔ صاحب روح البیان تو ایک
صوفی مزاج مفسر ہیں جنہوں نے رطب و یابس سبھی کچھ تفسیر میں جمع کر دیا ہے (دیکھئے اکسیر ص ۵۸) اور انہوں نے
جو یہ کہا ہے کہ یہ احداثِ بیعتِ جدیدہ کے لئے نہیں، یہ توجیہ بھی صحیح نہیں کیونکہ حضرت ابن مسعود اس کی
دلیل یہ بیان کرتے ہیں :-

ما عہد را ذلک علی عہدہ صلی اللہ علیہ کہ یہ طرز و طریقہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ
وسلمہ۔ مبارک میں لوگوں میں معبود نہ تھا۔

ان کا یہ قول نقصِ صریح ہے کہ یہ کیفیت اور احداثِ ہیئت جدیدہ آپ کے زمانہ مبارک میں نہ تھی۔ یہ نہیں
فرمایا کہ اس مخصوص طریقہ سے آپ نے منع فرمایا ہے۔ خود حضرت ابن مسعودؓ کی پیش کردہ دلیل کو چھوڑ کر ذکر
بالجہر سے منع کی عام روایتوں کو اس کی دلیل بنانا جیسا کہ صاحب انوارِ ساطعہ ص ۳۲ میں آیت کہ میرہ،
وَأَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اور حدیث اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا
غائباً کو نقل کر کے لکھتے ہیں؛ اس سے بعض صحابہ سمجھ گئے کہ ذکر جہر منع ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
نے لوگوں کو منع فرمایا تو یہ توجیہ القول بلا لایرضی بہ قائل ہے جو کسی طرح سے مسموع نہیں ہے۔ خیر ہر حال صاحب
انوارِ ساطعہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مسجد میں بلند آواز کے ساتھ مل کر دُعوہ شریف
پڑھنے اور ذکر بالجہر کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف سمجھتے تھے۔ کاش کہ اہل بدعت اس سے
کچھ عبرت حاصل کرتے۔ باقی امام احمد کی کتاب الزہد کے حوالہ سے حضرت ابو دآل تابعیؓ کا جو یہ قول نقل کیا
گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا یہ لوگ گمان کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ذکر کرنے سے منع کرتے تھے میں
تو جب کبھی حضرت عبداللہؓ کی مجلس میں جا کر بیٹھا، ان کو ذکر اللہ کرتے ہوئے ہی پایا (تجوید الرحمن)۔ تو یہ
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی جہر سے مخالفت والی روایت کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ
ذکر اللہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے کا ذکر قرآن کریم، صحیح احادیث اور اجماعِ اہل سنت سے
ثابت ہے اور یہ ایک بہت بڑی عبادت اور طاعت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجتماعی صورت میں، اور
وہ بھی مسجد میں جہر سے ذکر کرنا اور اسی ہیئت کے ساتھ جہر سے دُعوہ شریف پڑھنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ
سے ثابت ہے یا وہ اس کو منع کرتے اور اس کو بدعت کہتے ہیں؟ آپ نے صحیح روایات سے یہ معلوم کر لیا
کہ وہ ان دونوں کو بدعت اور ان پر عمل کرنے والوں کو بدعتی کہتے ہیں اور ان کا وجود تک مسجد میں گوارا نہیں
کرتے اور فوراً ان کو مسجد سے باہر نکال دیتے ہیں۔ فریقِ مخالفت از راہِ دیانت یہ فرماتے کہ مسجدوں میں اجتماعی
ذکر میں جہر سے ذکر اور دُعوہ شریف پڑھنے والوں کو منع کرنے سے ہم ہی دہانی ہوتے ہیں یا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

کہ بھی اس مبارک فتویٰ سے کچھ حصہ نصیب ہو سکتا ہے۔ جواب غور سے دینا ہو گا۔

من نگویم کہ ایں مکن آن کن مصلحت میں و کار آساں کن

حضرت ابن مسعود کا مقام جناب رسول اللہ ﷺ ایہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اُفتابِ نبوت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں - سے اکتسابِ نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ

کرام نجومِ ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے ایسے جزوی فضائل اور مناقب حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ بن مسعود کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ آپ نے ارشاد فرمایا: ”جس چیز کو تمہارے لئے ابن مسعود پسند کرے میں بھی تمہارے لئے اس چیز کو پسند کرتا ہوں اور اس پر راضی ہوں۔“ (مسندک ج ۲ ص ۳۱۱ ص ۳۱۲) اور نیز ارشاد فرمایا کہ ”جس چیز کو تمہارے لئے عبداللہ بن مسعود پسند کرے میں بھی اس چیز کو تمہارے لئے پسند نہیں کرتا۔“ (الاستیعاب ج ۱ ص ۳۵۹)۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود حضرات خلفاء راشدین سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم ج ۲ ص ۲۹۳)

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرات صحابہ کرام میں درجہ اول کے مفسرین جن کو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کُل اعتماد حاصل ہے۔ وہ اس اجتماعی صورت میں ذکر بالجبر کرنے اور مل کر بلند آواز کیساتھ درود شریف پڑھنے والوں کو بدعتی کہتے ہیں اور اس فعل کو پسند نہیں کرتے۔ جب ان کو یہ فعل پسند نہیں تو سابق روایت کے پیش نظر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ فعل ہرگز پسند نہیں۔ اب جس کا جی چاہے ان کی پیروی کرے یا کسی اور کی۔ عہ نبی اپنا اپنا امام اپنا اپنا۔

بالکل تنہائی میں یا تعلیم کی خاطر ذکر بالجبر کا معاملہ الگ ہے۔ راقم نے اس کی پوری تفصیل اپنی کتاب حکم الذکر بالجبر میں کر دی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عمرو بن لؤیؒ دونوں مسجد میں داخل ہوئے :

فان عبد الله بن عمر جالس الى حجرة تودى كما حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عائشہؓ کے حجر کے

عائشۃؓ والناس يصلون الضحیٰ فی المسجد، فسألناه عن صلواتهم فقال بدعة۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۳۸، مسلم ج ۱ ص ۱۸۴)

پاس بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ مسجد میں چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں ہم نے حضرت ابن عمرؓ سے ان لوگوں کی نماز کے پیرہ میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بدعت ہے۔

چاشت کی نماز صبح اسانید کے ساتھ متعدد حضرات صحابہ کرامؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہے لیکن چونکہ آپ کے زمانہ مبارک میں اجتماعی بیعت سے خاص اہتمام اس کے لئے نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ کیفیت ما اتفق جہاں جہاں بھی کوئی ہوتا تھا، وہاں ہی وہ نماز چاشت پڑھ لیتا تھا۔ اور یہ نفل نماز ہے اور نفل نماز کو بجائے مسجد کے گھر میں پڑھنے کی زیادہ فضیلت حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ مگر حضرت ابن عمرؓ نے جب لوگوں کو اس نماز کے لئے مسجدوں میں اجتماع اور خاص اہتمام دیکھا۔ تو ان کے اس فعل کو انہوں نے بدعت قرار دیا۔ چنانچہ اسی روایت کی شرح میں حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں :

مراده ان اظهارها فی المسجد والاجتماع ليعاھو بدعة لا ان اصل صلوة الضحیٰ بدعة۔ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۱۸۴)

حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ ہے کہ چاشت کی نماز کو مسجد میں ظاہر کر کے پڑھنا اور اس کے لئے اجتماع اور اہتمام کرنا یہ بدعت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی یہ مراد یہیں کہ اصل سے چاشت کی نماز ہی بدعت ہے۔

تہجد کی نماز کی بہت بڑی فضیلت حدیثوں میں آئی ہے اور یہ بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جماعت کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر اس کے لئے بھی ضرورت سے نہ اندہ اجتماع کیا گیا تو وہ بھی مکروہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک ایسے ہی فرقہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”نماز تہجد را بجماعت میگزاردند از اطراف و جوارب و در آن وقت مردم از برائے نماز تہجد جمع می گردند و جمعیت تمام ادا مینمایند و این عمل مکروہ است بکراہت تحریمیہ از فقہار کہ تا اسی شرط کراہت اشد اند جواز جماعت نفل را مقید بنا حیۃ مسجد ساخته زیادہ از حد کس

نماز تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں اور اطراف و جوارب اس وقت لوگ نماز تہجد کے لئے جمع ہوتے ہیں اور حاصل اہتمام سے اس کو ادا کرتے ہیں اور یہ عمل مکروہ است اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے حضرت فقہاء کی ایک جماعت تہجد اسی اہتمام کی شرط کو مکروہ کہتی ہے اور نفل نماز کے باجماعت ادا کرنے کو

را باتفاق مکروہ گفتہ اند۔

مسجد کے کوہ کے ساتھ مقید کرتی ہے اور میں سے نماز آدمیوں کے اجتماع کو باتفاق مکروہ کہتی ہے۔

(مکروبات حصہ سوم مثلاً)

امام ابو، وقتی العید فرماتے ہیں کہ :

الاحقری ان ابن عمر قال فی صلاۃ النحی انھا بدعة لہ لم ینبت عندہ فیہا دلیل ولم یر ادراجہا تحت عومات الصلوۃ تخصیصہا بالوقت المخصوص وكذلك قال فی القنوت الذی کان یفعلہ الناس فی عصرہ انہ بدعة ولم یر ادراجہ تحت عومات الدعاء وكذلك روى الترمذی من قول عبد اللہ بن مفضل لا یسنہ فی الجہر بالبسملة ایاك والحدث و لم یر ادراجہ تحت دلیل عامہ

کیا تم نہیں دیکھتے کہ حضرت ابن عمرؓ نے چاشت کی نماز کو بدعت کہا کیونکہ ان کے نزدیک اس کی دلیل ثابت نہ تھی اور انہوں نے اس کو نماز کے اثبات کی عام دلیلوں کے تحت درج نہ کیا اسلئے کہ چاشت کی نماز وقت مخصوص کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی طرح انہوں نے قنوت کے بارے میں جو ان کے نمازیں لوگ پڑھا کرتے تھے بدعت کہا اور اس کو دعا کی عام دلیلوں کے نیچے درج نہ کیا۔ اور اسی طرح امام ترمذیؒ نے حضرت عبد اللہ بن مفضل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ جبرہ بسم اللہ پڑھنے کی بدعت سے گریز کرنا، اور اس کو عام دلیل کے نیچے انہوں نے درج نہ کیا۔

(الحکام الاحکام ج ۱ ص ۵)

یہ معلوم ہے کہ نفس نماز، قنوت اور بسم اللہ کی بڑی فضیلت آئی ہے مگر چونکہ مخصوص بہیت اور کیفیت سے اور خاص اوقات کے اندر ان کا ثبوت نہ تھا، اس لئے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مفضلؓ نے ان کو بجائے عومات کے تحت درج کرنے کے بدعت کہا اور اس سے بچنے کی تلقین کی۔

علامہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ :

کسی چیز کی اصل جب اجمالی درجہ میں ثابت ہو تو اس سے تفصیلی رنگ میں اس کا ثبوت لازم نہیں آتا (مثلاً) جب مطلق نماز ثابت ہو تو اس سے ظہر و عصر اور تہ و نحر کسی خاص نماز کا اثبات نہیں ہوتا تا وقتیکہ خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح نہ ہو

ان الاصل اذا ثبت فی الجملة لا یلزم اثباتہ فی التفصیل فاذا ثبت مطلق الصلوۃ لا یعم منہ اثبات الظہر والعصر او التہ والنحر حاشی نیص علیہ علی الخصوص (الاعتصام ص ۱۸۲)

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں: اتباع وحی باید کہ بسیار امرے محمود کہ در حد ذات فضیلت دار و اما مخصوص مقام وار و نشده و درست نیامه چنانچه مصافحہ بعد از نماز و امثال اُنی۔ (اشعۃ اللمعات)۔ نیز لکھتے ہیں کہ: آنکہ بعضی مردم مصافحہ میکنند بعد از نماز یا بعد از نماز جمعہ چہرے نیست و بدعت است از جهت تخصیص وقت۔ (اشعۃ اللمعات ج ۲ ص ۴۷)۔

اگرچہ اپنے مقام پر مصافحہ اور معانقہ سنت ہے مگر چونکہ ہر نماز کے بعد اور اسی طرح نماز جمعہ کے بعد اس کا ثبوت نہیں، لہذا یہ بدعت ہے۔ معتقد کتاب اہل میں اس مصافحہ کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً التوشیح، للعلامہ طیبی۔ ملقط۔ ایضاً المطالب محلک الطالبین۔ خلاصۃ الفقہ۔ کافی۔ فتاویٰ ابوالہیثم شاہی۔ ناہری۔ حاشیۃ المصابیح۔ مجالس اہل ہزار۔ مدخل اور فتاویٰ ابن حجر وغیرہ (ریختہ الحجۃ منہ ۱۳۱)۔ علامہ طیبی لکھتے ہیں:

یکرمہ المصافحۃ بعد اداء الصلوۃ علی کل حال نماز سے فارغ ہو چکنے کے بعد مصافحہ کرنا برائت میں
لہذا من سنن الروافض وھکذا الحکم فی مکروہ ہے کیونکہ یہ رافضیوں کی سنت ہے اور یہی حکم
المعانقہ۔ (انتہی) بحوالہ الحجۃ ص ۴۷) معانقہ کا ہے۔

باقی امام نووی نے جو کتاب الاذکار میں اس مصافحہ کو لا بائس بہ کہا ہے تو یہ ان کی غلطی ہے چنانچہ
ملا علی القاری اور ابن امیر الحاج نے امام نووی کی شرح و بسط سے تردید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ
یہ مصافحہ بدعت ہے۔ علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

لہ دلیل فی الشرع یدل علی تخصیص تلك شرع میں کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے ان اوقات کے اندر
الاوقات بجا بل ہی مکروہۃ (الاتصام ج ۲ ص ۱۸۷) مصافحہ کی تخصیص ثابت ہوتی ہو بلکہ یہ مصافحہ مکروہ ہے۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات ہرگز صحیح نہیں ہے، تاوفاقیکہ ان کی
تخصیص کے لئے کوئی الگ اور مستقل خاص دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ شریعت کی کسی عام دلیل کو اپنی مرضی سے
خاص کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ مطلق کو اس طرح مقید کر دینا اور عموماً کو اس طرح سے خصوص کے
قالب میں ڈھال دینا، یہی احداث فی الدین اور منصب تشریح پر دست اندازی ہے۔ امام غزالی نے

کیا خوب کہا ہے :

فالتقید فی المطلقات التي لم يثبت بدليل الشَّرع تقید ہا را ئی فی التشريع (الاعتصام ج ۲۸۴) کہ ان طلاقات کو تقید کرنا کہ جن کی تقید شریعت سے ثابت نہیں ہے، شریعت میں اپنی رائے کو دخل دینا ہے۔

دلائل شرعیہ کی موجودگی میں اپنی رائے سے قیاس کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم ہیں خصوصاً جب کہ ان میں اجتہاد اور تفقہ کی صحیح معنوں میں اہلیت ہی موجود نہ ہو۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَقُولُوا بِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا آخِذٌ بِهَذَا آخِرًا يَنْفَعُ زَاوِيَ اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ اللَّهُ يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (۱۵)

اور مت کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بتا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر بہتان باندھو۔

حافظ ابن کثیر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

دیدخل فی هذا کل من ابتغى بدعة ليس له فيها مستند شرعي و دخل شيئاً مما حرم الله و حرّف شيئاً مما أباح الله بمجرّد رأي و تشبه (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۵۹۵)

کہ اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے بلا دلیل شرعی کے کوئی بدعت گھڑی یا محض اپنی رائے اور خواہش سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال یا حرام کی ہوئی چیز کو حلال کر دیا۔

علامہ آؤسٹنی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے معنی کا حامل جیسا کہ امام عسکری نے صراحت کی ہے یہ ہے کہ تم اس چیز کو حلال و حرام مت کہو جس کی حلت و حرمت خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق سے ثابت نہ ہو ورنہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہنے والے ہو جاؤ گے۔

لأن مدار الحلال والحرم ليس بالأحكام المجردة (درر المعانی ج ۳ ص ۲۴۷) کیونکہ حلت و حرمت کی مدار صرف اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے۔

اور یہی حال ہے زمانہ حال کے مبتدعین کا کہ وہ ہر بات کو اپنی نارِ ساعقل سے ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ نصوص قطعیہ اور احادیث صحیحہ کی باطل تاویلات کر کے خود بھی گمراہ ہوتے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور وہ بدعت کو لے کر اس سے سنت کو مٹانے کے درپے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

سبیل اموءکم بعدی رجال یطفون النّسۃ میرٹ بعد کچھ مرد تمہارے امور کے سر پرست بنیں گے۔ وہ

بالبدعة۔ رواہ ابن ماجہ (جامع العلوم والحکم ص ۲۱۱) بدعت سے سنت کو مٹائیں گے۔

اور یہی اہل بدعت کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنی خواہش اور عقل کو ہر مقام پر دخل دیتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا گناہ اور عیب ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس پر انہوں نے مطلقاً غور نہ کیا کہ اگر ایک چیز مطلقاً جائز ہے تو قید لگانے سے شاید وہ جائز نہ ہو۔ دیکھئے قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے مگر بجا لیت رکوع و سجود پڑھنا منع ہے (مسلم شریف ج ۱ ص ۱۹۱ وغیرہ)۔ غیر محرم عورت سے نکاح تو جائز ہے مگر اس صورت میں کہ اس کی بہن یا خالہ یا پوچھی یا بھانجی پہلے نکاح میں موجود نہ ہو۔ اپنی بیوی کے ساتھ جماع تو جائز ہے مگر بقیہ حیض حلال نہیں ہے۔ بکری اور گندم وغیرہ تو حلال ہے مگر بقیہ چوری حرام ہے۔ کہاں تک اس قاعدہ کو لکھا اور بیان کیا جائے الغرض اہل بدعت کی یہی اصولی غلطی ہے کہ وہ احکام عامہ سے امور خاصہ ثابت کرنے کی بجائے جاسعی کرتے ہیں۔

صاحب انوارِ ساطعہ کا ایک مغالطہ | مولوی عبدالستیع صاحب نے زرقانی، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور فتح الباری وغیرہ سے یہ نقل کیا ہے کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر چاشت کی نماز کو بدعتِ حسنہ فرماتے تھے لہذا حضرت ابن عمرؓ کا انکار مانعین کے لئے مفید نہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں:- "پس مدعی بدعت ثابت کرنے والوں کا ثابت اور رد کرنے والوں کا رد ہو گیا" (بلفظ انوارِ ساطعہ ص ۲۱) لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحب انوارِ ساطعہ نے اصل بات پر غور ہی نہیں کیا، ورنہ وہ ہرگز غلطی کا شکار نہ ہوتے۔ حضرت مجاہدؒ کی روایت جو بخاری اور مسلم کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، اس میں سوال چاشت کی نماز کے بارے میں نہیں ہے کہ آیا وہ بدعت ہے یا سنت۔ بدعتِ حسنہ ہے یا سیئہ؟ وہاں یہ مذکور ہے کہ پوچھنے والوں نے حضرت ابن عمرؓ سے یہ پوچھا ہے کہ یہ جو لوگ مسجد میں اجتماعی شکل میں نماز پڑھتے ہیں، ان کی یہ نماز کیسی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابن عمرؓ نے یہ فرمایا کہ یہ بدعت ہے اور اس بدعت کو وہ حسنہ سے متعید نہیں کرتے۔ اور مطلق بدعت سے بدعتِ سیئہ ہی مراد ہوتی ہے۔ ہاں نفسِ چاشت کی نماز کو وہ بدعتِ حسنہ فرماتے ہوں تو جہاں بات ہے۔ الغرض اثبات اور چیز کا ہے اور نفی اور چیز کی ہے۔ صاحب انوارِ ساطعہ کو بھی بالآخر یہ بات کھٹکی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

اور بعض علماء نے یہ خیال کیا ہے کہ اصل نماز پر ان کا انکار نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک بدعت حسنہ، افضل و احسن کام تھا، اس پر کس طرح انکار فرماتے۔ بلکہ اگر انہوں نے انکار کیا ہے تو اس بات پر کیا ہے کہ لوگ اس کو نماز و فرائض کی طرح جمع ہو کر اہتمام سے مسجدوں میں پڑھتے تھے۔ اور یہ بات خلاف اصل تھی۔ (بلفظہ انوار ساطعہ منک)

یہی ہم کہنا چاہتے ہیں کہ جس عبادت کو شریعت مطہرہ نے کسی خاص کیفیت اور مخصوص بہیت کے ساتھ مقید نہیں کیا، اور اس کے لئے کسی خاص اہتمام اور اجتماع کی ترغیب نہیں دی تو یقیناً یہ مخصوص طرز و طریقہ بدعت ہوگا۔

حضرت نافعؓ (المتوفی کاظم) روایت کرتے ہیں کہ :

ان رجلا عطس الى جنب ابن عمر فقال
الحمد لله والصلوة على رسول الله فقال ابن عمر
وانا اقول الحمد لله والصلوة على رسول الله
وليس هكذا علمنا رسول الله صلى الله عليه
وسلم علمنا ان نقول الحمد لله على كل حال
(ترمذی ۲۹۸۰ قلت وسندہ صحیح وشکوة ۲ ملک)

ایک شخص نے حضرت ابن عمرؓ کے پہلو میں چھینک ماری اور اس شخص نے خود کہا۔ الحمد لله والصلوة على رسول الله حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا۔ اس کا تو میں بھی قائل ہوں کہ الحمد لله والصلوة على رسول الله لیکن میں جناب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعلیم نہیں دی۔ ہیں اس موقع پر اس کی تعلیم دی ہے کہ ہم الحمد لله على كل حال کہا کریں۔

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ چھینک مارنے والا الحمد لله کہے۔ مگر اس موقع پر والصلوة على رسول الله کے الفاظ کی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں دی۔ پوچھئے حضرت ابن عمرؓ سے کہ آپ نے درود و سلام سے کیوں منع کیا اور والصلوة على رسول الله کے الفاظ سے آپ کو کیا تکلیف ہوتی ہے؟ کیا جناب رسول الله صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام بھیجنا بھی گناہ ہے؟ بے موقع اور بے محل درود و سلام سے تو ہابی منع کیا کرتے ہیں، آپ اس زمرہ میں کیسے شامل ہو گئے؟ مگر وہ تو سراپا مطیع رسول تھے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حمد و سلام کے موقع اور محل کو بخوبی جانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس سے منع کیا۔

مولوی عبدالستیع صاحب حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کی یوں تاویل کرتے ہیں کہ درمختار کی

کتاب النبیائے میں ہے موطنان لا اذکر فیہما عند العطاس وعند الذبح۔ پس السلام علی رسول اللہ کہنا اُس کا مقابل نہیں ہے واقع ہوا تھا۔ پھر الحاق امر نہی عند کو کس طرح وہ رضی اللہ عنہ منع نہ فرماتے۔ اُمیدِ منہیہ کہ ہم بھی منع کرتے ہیں۔ (بلفظہ۔ انوار ساطعہ ص ۱۵۸)

جواب: قطع نظر اس سے کہ یہ روایت کیسی ہے۔ عرض یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کا یہ جواب برگز نہیں اور یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائم ہے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عطاس (چھینک) کے وقت اپنا نام مبارک لینے سے منع کیا ہے اس لئے میں تجھے اس سے روکتا ہوں۔ بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں اسلئے تمہیں روکتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہمیں صرف الحمد للہ کی تعلیم دی ہے اور والسلام علی رسول اللہ چونکہ اس پر زائد ہے اس لئے میں اس کو جائز نہیں سمجھتا۔ یہ حدیث اس امر کی سند اور دلیل ہے کہ جو امر شرع میں ثابت ہوا ہو، اس پر زیادہ کرنا منع ہے۔ حضرت ابن عمرؓ موطنان لا اذکر الخ سے استدلال نہیں کرتے جیسا کہ مولوی عبد السمیع صاحب نے غلطی کھائی ہے۔

حضرت سالم بن عبید (المتوفی ۸۵ھ) کے پاس ایک شخص نے چھینک ماری اور:

فقال السلام علیک فقال له سالعو علیک و
 علی اقل الا ما قال النبی صلی اللہ علیہ
 وسلم الحدیث

یہ کہا۔ السلام علیکم۔ حضرت سالمؓ نے جواب دیا۔ تم پر اور
 تمہاری ماں پر۔ اس جملہ سے شخص ناراض ہو گیا حضرت
 سالمؓ نے کہا۔ بہر حال میں نے مرفوع ہی کچھ کہہ دیا جو صحابہ
 نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ (مُحْصَلہ)

(ترمذی ج ۲ ص ۹۵ - بروادود ج ۲ ص ۳۷ - مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۷ - موارد الظمان ص ۷۷)

اس روایت کے پیش نظر مولوی عبد السمیع صاحب نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ وہ انکار اسلئے
 تھا کہ وظیفہ معیتہ شرع کا جو الحمد للہ تھا، اُس نے چھوڑ کر تحیت ملاقات کا وظیفہ اُس کی جگہ قائم کیا تھا یہ

علی خان صاحب بریلوی اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ حدیث ثابت نہیں (بلفظہ طغوظات حصہ دوم ص ۱۱۸) اور
 علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، ولا یصح (القول البدیع ص ۱۶۹) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

تشریح جدید اور تبدیل دین ہے“ (بلغم، انوار ساطعہ ص ۱۵۲)۔ بس ہم بھی اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ جو چیز شریعت مطہرہ نے جس جگہ رکھی ہے، اُس کو اُسی جگہ رہنے دو۔ نہ مطلق کو مقید کرو اور نہ مقید کو مطلق۔ نہ عام کو خاص کرو اور نہ خاص کو عام۔ غیر مکلف کو کیفیت اور ہیئت مخصوصہ کی زنجیر میں نہ جکڑو جس کو اجتماعی صورت میں کئے کا حکم نہیں دیا گیا، اس کو مجتمع ہو کر نہ کرو اور جس کو باوازی بلند کرنے کا حکم شریعت نے نہیں دیا، اس کو بلند آواز سے ادا نہ کرو۔ اور غیر عین بالوقت کو کسی وقت کے ساتھ خاص نہ کرو۔ کیونکہ یہ تشریح جدید اور تبدیل دین ہے، جس کا نام بالفاظ دیگر بدعت ہے اور اہل السنۃ و الجماعت کا دامن اس قبیح ترین حرکت سے یقیناً پاک ہے۔

حضرت مجاہد (المتوفی ۱۷۵ھ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے داخل ہوا۔ اذان ہو چکی تھی۔ ایک شخص نے تشویب شروع کر دی (ابن ابی شیبہ، مجاہد کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مؤذن نے اذان کے بعد الصلوۃ الصلوۃ کے الفاظ تشویب کی، اور لوگوں کو نماز کی دعوت دی تو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا: تو پاگل ہے، تیری اذان میں جو دعوت تھی، کیا لوگوں کو بلانے کے لئے وہ ناکافی تھی؟) حضرت ابن عمرؓ نے مجاہد سے فرمایا:

اخرج بنا فان لهذا بدعة (ابو داؤد ج ۱ ص ۱۷۱) مجھے یہاں سے لے چل اس لئے کہ یہ بدعت ہے۔

حضرت ابن عمرؓ اس مسجد سے چلے گئے اور نماز تک وہاں اذان کی۔ چنانچہ دوسری روایت میں ہے:

اخرج بنا من عند هذا المبتدع ولم یصل فیہ (ترمذی ج ۱ ص ۲۱۵) مجھے اس بدعت کے ہاں سے لے چل۔ اور اُس مسجد میں نماز نہ پڑھی۔

حضرت ابن عمرؓ کی آخر عمر میں آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ اس لئے آپ نے اپنے قائد سے یہ فرمایا کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے بدعت اور اہل بدعت سے کیسی نفرت کی کہ انہوں نے ان کی مسجد میں نماز پڑھنی بھی گوارا نہ کی۔ آج کل کا دور ہوتا تو لوگ یہ کہہ دیتے کہ مشتبہ نے کسی کو گالیاں تو نہیں دیں بلکہ وہ نماز جیسی بہترین عبادت کی طرف لوگوں کو بلارہا ہے، اور اللہ ال علی الخیر کفاحلہ یہ تہ اجر کا مستحق ہے، مگر حضرات صحابہ کرامؓ تو رمز شناس رسول تھے، ان کی دور رس نگاہیں بدعات کی

ظاہری چمک میں الجھ کر نہیں رہ جاتی تھیں، وہ ہدایت کے اہل منبع اور سرچشمہ تک رسائی کر لیتی تھیں۔

امام نووی شرح مہذب میں لکھتے ہیں :

روى ان علياً رأى مؤذناً يثوب في العشاء

فقال اخرجوا هذا المبتدع من المسجد

وعن ابن عمر مثله ^{۲۶۱} البكر الاثنى عشر

علاء بن غزالی لکھتے ہیں کہ سلف صالحین نے جن بدلت کا انکار کیا ہے ان میں سے ایک تخریب بھی ہے۔

(الاعتصام ص ۱۳۳) کتب فقہ میں جس تخریب کا ذکر ہے وہ قاضی وغیرہ مشغول حضرات کو آگاہ کرنے اور توجہ دلانے

کے لیے ہے نہ کہ درود و شریف پڑھنا اور مؤذن کی طرح بلند آواز سے چلنا۔

حضرت علیؑ : حضرت علیؑ (المتوفی ۳۵ھ) سے ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔

ان رجلا يوم العيد اراد ان يصلوا قبل صلوة

العيد فنهاه علي فقال الرجل يا امير المؤمنين

اني اعلم ان الله تعالى لا يعذب على الصلوة

فقال علي واني اعلم ان الله تعالى لا يثيب

على فعل حتى يدفعه رسول الله صلى الله عليه

وسلم او يحث عليه فتكون صلاتك عبثا

والعبث حرام فلعنه تعالى يعذبك به

لمخالفتك لرسوله صلى الله عليه وسلم۔

(شرح مجمع البحرين کنز في الجود ص ۱۶۵ و نظم البيان ص ۱۷۱)

حضرت علیؑ کی یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نماز عید سے قبل بے نفل

نماز ثابت نہیں۔ نہ آپ نے فعلاً ادا کی اور نہ قولاً اس کی ترغیب دی۔ اس لیے یہ فعل عبث ہے اور فعل عبث

حرام ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نماز جیسی اہم اور پسندیدہ عبادت پر بھی محض اس لیے نرا دے کہ اس

کے پیارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے یہ ثابت نہیں اور آپ نے اس کی

مخالفت کی وجہ سے نرا دے۔

ترغیب بھی نہیں دی۔ آج کل کے مفتی اُس وقت ہوتے تو خدا ہی بہتر مانتا ہے کہ حضرت علیؑ پر کیسے کیسے فتوے لگاتے کہ وہ نماز جیسی عبادت سے منع کرتے ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

صاحب انوارِ ساطعہ اصولی طور پر اس روایت کو تسلیم کرتے ہیں مگر اپنی عادت کے مطابق اس کی تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: ”واضح ہو کہ یہ منع فرمانا فقط اسی باعث سے نہ تھا کہ نماز اُس وقت میں آپؐ سے منقول نہیں ہے اور جب منقول نہیں تو بدعتِ ٹھہری جیسا کہ فریقِ ثانی مغالطہ میں پڑا ہے۔ بلکہ منع فرمانے حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی ایک دلیل ہے جس پر علماء حنفیہ کا عمل ہے یعنی صریح نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے۔ شرح مجمع میں ہے ردی انہ علیہ السلام قال لا صلوة فی العیدین قبل الاحرام۔ یہ ہی ہمارا دعویٰ ہے کہ احداث اس شے کا منع ہے جو امر و نہی شایع کے مخالف ہو الخ“ (ملقطہ انوارِ ساطعہ ص ۳۹)۔ صاحب انوارِ ساطعہ اتنی بات تو صراحت سے تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے نمازِ عید سے قبل ایک شخص کو نفل نماز پڑھنے سے منع کیا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کے منع کرنے کی جو دلیل شرح مجمع سے نقل کرتے ہیں کہ چونکہ یہ نماز آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح نہیں کے خلاف تھی، اس لئے حضرت علیؑ نے اس سے منع کیا۔ یہ غلط ہے اور توجیہ القول بدالایضی بہ قائلہ کا مصداق ہے۔ سوال یہ نہیں کہ عید سے قبل نفل نماز کی ممانعت پر حضرات فقہاءِ احناف کے پاس کوئی دلیل ہے؟ اور آیا وہ دلیل آپ کا قول ہے یا عدمِ فعل؟ اور وہ اپنے مقام پر کسی صحیح سند سے ثابت ہے یا نہیں؟ اصل سوال یہ ہے کہ خود حضرت علیؑ نے اس شخص کو نمازِ عید سے قبل نفل نماز پڑھنے سے منع کرنے پر کوئی دلیل پیش کی ہے۔ صاحب انوارِ ساطعہ نے اس پر مطلقاً غور نہیں فرمایا۔ حضرت علیؑ نے اس منع کی دلیل صرف یہ پیش کی ہے:

و انی اعلم ان اللہ تعالیٰ لا یثیب علی فعل
 وحلی یفعله رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
 اور میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب
 نہ دیگا جب تک کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو
 سکھایا ہو یا بحث علیہ۔

حضرت علیؑ کا یہ بیان کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ارشاد اس امر کی غیر مبہم اور صاف دلیل

ہے کہ حضرت علیؑ نے اس شخص کو نماز سے اس لئے منع کیا تھا کہ ان کے نزدیک جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عمل سے یہ نماز ثابت نہ تھی اور اس کی ترغیب پر آپ کا کوئی قول بھی موجود نہ تھا۔ صاحب انوار ساطع کا وطیرہ ہی عجیب ہے۔ وہ خود قائل کی اپنی پیش کردہ دلیل کو ملاحظہ نہیں فرماتے اور گھر کی دلیل کو چھوڑ کر پٹوس سے دلائل تلاش کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھر کی مرغی وال برابر مگر یہ تو دلائل کا مقام ہے، خود و نوش کا محل نہیں۔ یہاں غور و فکر اور اس کے ساتھ انصاف درکار ہے۔

ان مسائل میں ہے کچھ ڈرف نگاہی درکار۔ یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت طاؤسؓ کو عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا (اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ یہ نماز ترکعت تھی) تو انہوں نے ان کو منع کیا حضرت طاؤسؓ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے کی بھی روایت کی تاویل پیش کی۔ حضرت عباسؓ نے سخت لہجہ میں ارشاد فرمایا :

ما ادری ایعدب ام یوجزلان اللہ تعالیٰ میں نہیں جانتا کہ اس کو اس نماز پر سزا ملے گی یا جھٹکے گا
یقول وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امر ان یکون لہم الخیرۃ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے کہ کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی (مسئلہ) نکالے قال انما کم واللہ ہی علی شرطہا) فیصلہ کریں تو وہ اپنے خیال کو اس میں جگہ دیں۔

اس روایت میں حضرت ابن عباسؓ نے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح قوی نہیں کی خلاف درزی پر حضرت طاؤسؓ کو تنبیہ فرمائی ہے۔ لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ جیسے آپ کے قول کی مخالفت گناہ ہے اسی طرح آپ کے عدم فعل کی مخالفت میں بھی کوئی ثواب نہیں بلکہ وہ بھی جرم ہی ہے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے خلاف سنت نماز پڑھنے پر بھی طاؤسؓ کو سزا کا مستوجب گردانا ہے۔

حضرت سعید بن المسیبؓ : اس مضمون کی ایک روایت آتی ہے کہ ایک شخص عصر کی نماز کے بعد اکثر دو رکعتیں پڑھا کرتا تھا۔ اُس نے حضرت سعید بن المسیبؓ سے دریافت کیا کہ :

یا ابا محمد ایعدب بنی اللہ علی الصلوۃ قال لا لے ابو محمد! کیا مجھے اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے کی وجہ سے سزا دیگا؟

ولكن يعذبك بخلاف السنة - حضرت سعید بن المسیبؓ نے فرمایا کہ نہیں لیکن تجھے خدا تعالیٰ

(مسند داؤدی ص ۱۷۱) سنت کی مخالفت کی وجہ سے ضرور سزا دے گا۔

حضرت سعید بن المسیبؓ بھی یہی کچھ ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ نفسِ نماز پر اللہ تعالیٰ کسی کو سزا نہیں دیگا کیونکہ وہ ایک عبادت ہے مگر ایسی نماز پر جس میں سنت کی خلاف ورزی ہو اللہ تعالیٰ ضرور سزا دے دیگا۔

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص : حضرت عثمانؓ بن ابی العاص (المتوفی ۳۵ھ) کو کسی فتنہ میں دعوت دی گئی تو انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ جب ان سے اس انکار کی وجہ دریافت کی گئی، تو صاف الفاظ میں یہ جواب ارشاد فرمایا کہ :

انا كنا نأتى الحثان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا ندعى له (مسند احمد ج ۲ ص ۲۱۴) ہم لوگ نماز رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں فتنوں میں اللہ علیہ وسلم ولا ندعی له (مسند احمد ج ۲ ص ۲۱۴) نہیں جایا کرتے تھے اور نہ اس کی جگہ میں دعوت دی جاتی تھی۔

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص بھی اسی قاعدہ سے کام لے رہے ہیں کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فتنوں میں بلائے جانے کا دستور نہ تھا اور نہ لوگوں کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں اس لئے میں بھی اس میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فتنوں میں شریک ہونے سے منع کیا ہے اور اس سے بھی فرمائی ہے لہذا میں شریک نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بن ابی العاص وغیرہ جلیل القدر حضرات صحابہ کرامؓ نے نماز جیسی بہترین عبادت اور ذکر جیسی اعلیٰ قربت اور درود شریف جیسی عمدہ طاعت وغیرہ کو مخصوص کیفیت اور خاص ہیئت اور پابندی وقت کے ساتھ ادا کرنے سے محض اس لئے منع کیا کہ اس طرز و طریقہ سے یہ کام جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہیں کئے اور ان کی ترغیب بھی نہیں دی اور آپ کے عہدِ مبارک میں ایسا نہیں ہوتا تھا، اس لئے یہ امور بدعت ہیں اور معمولی بدعت بھی نہیں، بدعتِ عظمتی اور بدعتِ ظلمات ہیں بلکہ ضلالت بھی ہیں اور گمراہی بھی ہیں اعادنا اللہ تعالیٰ منہا۔ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نزدیک عمل وہی مقبول

ہوگا جو اخلاص اور اتباع سنت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو، اگرچہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہو، اور ایسا عمل بالکل رائیگاں ہوگا جو دیکھنے میں تو بہاڑ جتنا نظر آئے لیکن اس میں اخلاص اور اتباع سنت کی جان اور روح موجود نہ ہو۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر کیا ہی خوب ارشاد فرمایا۔ ایک روایت آئی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمنؓ بن ابی بکرؓ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں کسی بی بی نے کہا۔ اگر عبدالرحمنؓ کے بچہ پیدا ہوتا تو ہم (حقیقتہ میں) ایک اونٹ ذبح کر دیں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ:

لَا يَكُلُ السَّنَّةَ أَفْضَلَ عَنِ الْخِلَامِ شَاتَانِ ۖ
مَكَافِئَتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ مِثْلَةٌ ۖ
(مسندک ۲۳۸۵ قال الحاکم والذہبی صحیح) سے دو بکریاں اور بکری کی طرف سے (حقیقتہ میں) ایک بکری ہی کافی ہے۔

اونٹ اور دو بکریوں کی قیمت اور گوشت کا اگر موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا مگر حضرت عائشہؓ بکریوں کے بجائے اونٹ پر محض ایسے راضی نہیں کہ ان کے نزدیک کچھ مختلف ہے۔ ایسے اگر اس کی قیمت یا گوشت زیادہ ہے تو پھر بھی اسکی چنداں قدر نہیں ہے سنت ہی افضل ہے اور اسکی پابندی لازم ہے جمہور اونٹ اور گائے کا عقیقہ بھی جائز قرار دیتے ہیں حضرت انسؓ کی ہر فروع حدیث الطبرانی فی الصغیر ۴۵۵ میں ہے: یَعْقُ عَنْهُمْ الْإِبِلَ وَالْبَقَرُ وَالْفِئَمَ۔ (دیکھئے فتح الباری ۹۱۳ و نیل الاوطار ۱۳۶)

بدعت کی تردید کے بعض عقلی دلائل | دنیا کی ہر حکومت نے اپنی رعایا کی بہبودی کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں قوانین مرتب کئے ہوتے ہیں اور ان پر ان کا چلنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور اسکی خلاف ورزی کو کوئی حکومت گوارا نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص مملکت پاکستان میں ہندوستان، بھارت اور امریکہ وغیرہ کے نوٹ چلانا چاہے تو یہ ایک جرم ہوگا اور حکومت ایسے شخص پر مقدمہ چلائے گی۔ اگر پاکستانی فوج کا کوئی سپاہی امریکہ وغیرہ کسی غیر ملکی فوج کی وردی اور یونیفارم پہن کر ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہے تو اس کا حشر سب کے سامنے ہے۔ غیر ملکی وردی اور یونیفارم کی قربات ہی جانے دیجئے، اگر یہی فوجی سپاہی ٹکٹ کلکٹر کی وردی میں حاضری دے تو اس کا انجام بھی مخفی نہیں ہے۔ ان فرض جس حکمہ کے سلسلہ جو لباس اور وضع قطع، جو وردی اور یونیفارم حکومت وقت متعین کرے اس کی پابندی لازم ٹھہرائی

کیا مجال کہ کوئی اس کی مخالفت کر سکے۔ اسی طرح کوئی شخص ریوے ٹکٹ کی جگہ چوگنی رقم کا ڈاک خانہ کے ٹکٹ کا منظور شدہ ٹکٹ دے کہ کامیاب نہ ہوگا۔ اور دس پیسے کے کارڈ پر بیس روپے کا ریوے ٹکٹ لگانا بے کار ہوگا۔ پھر کیا غضب ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعین کئے ہوئے طریقِ عبادات میں اپنی طرف سے تغیر روا رکھا جائے اور اس پر گرفت بھی نہ ہو۔ خلائی حکومت نہ ہوتی اندھیر لگی ہوئی (الحیاذ باللہ تعالیٰ)۔ دُور نہ جاتیے ہمارے روزمرہ کے معمولات میں سے ہے کہ درزی اور موچی کو اپنے لباس اور پاپوش کا ناپ اور نمبر دیتے ہیں۔ اگر ایک گزہ اور ایک انچ بھی ہمارے حساب سے اُوپر نیچے ہو جائے تو ہم وہ لباس اور جوتا درزی اور موچی کے سر پر دے مارتے ہیں کہ یہ ہمارے پیمانے پر پورے نہیں اُترتے۔ کپڑا بھی وہی ہو جو ہمیں پسند تھا، اور چمڑا بھی وہی ہو، جو ہمیں مرغوب تھا، مگر ہے وہ ہمارے معیار سے کم یا زیادہ، ہم اس کو کبھی لینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس، وزن اور ماپ وغیرہ میں کسی طرح کمی بیشی ہم گوارا نہیں کرتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اعمال کا ایک معیار، ہمارے افعال کا ایک مقیاس اور ہماری زندگی کا ایک نمونہ بتایا ہے، اور وہ اُسوۂ رسول، سیرتِ رسول اور اتباعِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔ اور حضراتِ صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور تبعِ تابعینؓ اس نمونہ پر صحیح اُترنے والے ہیں۔ اس اسلامی یونیفارم اور اس اتباعِ سنت کی دردی کے خلاف تمام فیشن، جملہ رسوم اور ہر قسم کی بدعات خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کامل و مکمل آئین اور نظام میں مرفوع ہیں اور اُن پر عمل پیرا ہونے والا کوئی بھی شخص کسی طرح حقیقی نجات و فلاح کا مستحق نہیں ہے۔

الحاصل نہ تو کوئی حکومت زندگی کے کسی شعبہ میں رعایا کو اپنی خواہش اور مرضی پر چھوڑتی ہے اور نہ ہم اپنے مزدوروں اور اجیروں کو اُن کی راتے پر چھوڑتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ شریعتِ اسلامی ایسے اعمال اور عبادات ہم سے قبول کرے، جو اُس کے بتلاتے اور متعین کئے ہوئے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

سنت اور بدعت کے مقام اور اس کی صحیح پوزیشن کو سمجھنے والے کے لئے یہ چند حروف بھی

کافی ہیں۔ ہاں البتہ نہ ماننے والے کے لئے دفتر کے دفتر بھی بالکل بے کار ہیں۔ سنت کو (جو آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا قول و عمل ہے) اگر اصلی شکل و صورت میں محفوظ رکھا جائے، تو وہی
قیمتی موتی ہے اور اس کی قیمت دنیا و مافیہا کے خزانے بھی پوری نہیں کر سکتے۔

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ

گہر میں آبِ گہر سے سوا کچھ اور نہیں



باب پنجم

کیا بدعات میں کوئی خوبی اور ان پر لال بھی پیش کئے جاتے ہیں؟

دنیا میں شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس میں اس کی خرابی کے باوجود اس میں کوئی خوبی نہ ہو۔ شراب اور جوئے جیسی بدترین چیز کے بارے میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد یوں ہے :

فِيهِمَا اِنَّهُ كَبِيرٌ وَ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ط ان دونوں میں گناہ بڑا ہے اور لوگوں کیلئے ان میں (پل - بقرہ - رکوع ۲) کچھ منافع بھی ہیں ۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان میں گناہ بہت ہے مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں فی الجملہ منافع کا ذکر بھی کیا ہے لیکن ان قلیل منافع کی وجہ سے ان کو جواز کا درجہ حاصل نہ ہو سکا بلکہ ان کے مضرات اور مفاسد کے پہلو کو غالب قرار دے کر ان کو ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا گیا اور اکبر الکبائر کی مد میں ان کا شمار کیا گیا۔ جب بھی کسی گمراہ فرقہ نے کوئی بد سے بدتر بدعت، دین کے نام پر ایجاد کی ہے تو اُس نے اس میں محاسن اور خوبیوں کا دعویٰ بھی ضرور کیا ہے۔ اور اس کی ترقی اور اشاعت کے لئے خدا اور مذہب کے نام پر، رسول اور اولیائے سے عشق اور محبت کے نام پر کچھ نہ کچھ دلائل بھی تراشے ہیں اور ضرور ایسا پیرایہ اختیار کیا ہے جس سے ایک عام اور سادہ لوح مسلمان خواہ مخواہ مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ مشرکین عرب نے شرک جیسے بدترین اور قبیح ترین فعل کو جائز اور حسن ثابت کرنے کیلئے تقرب الہی کا نام ہی تو لیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ (مشرکوں نے کہا) ہم ان (درمیانی وسائط) کی پوجا نہیں

زُلْفٰی۔ (پہلے - زمر - رکوع ۱) کہتے - صرف اس لئے کہ یہ ہیں خدا تعالیٰ کے قریب کہتے ہیں

اور دوسرے مقام پر ذکر فرمایا کہ مشرکوں نے یہ کہا :

هُؤُلَاءِ شُفَعَاءُنَا عِنْدَ اللَّهِ (پہلے - یونس رکوع ۲) یہ ہمارے وسائل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کہتے ہیں

دیکھا آپ نے کہ مشرکین نے شرک کا اثبات کے لئے تقرب خداوندی کے خوش کن الفاظ سے تسکینِ قلب کا سامان مہیا کیا ، پھر انہی مشرکین نے ملتِ ابراہیمی میں ایک بدترین بدعت ایجاد کی ، کہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے وقت وہ بالکل مادرِ زائونگے ہو جاتے تھے سستی کہ عورتیں بھی ایک معمولی سے چیتھڑے کے علاوہ (جو شرمگاہ کو ڈھانپنے کے لئے بھی کافی نہ ہوتا تھا) تمام لباس اتار کر یہ کہتے ہوئے طواف کرتی تھیں : الیوم یبد و بعضہ اکلہ۔ فما بدا منه فلا اکلہ (مسلم ج ۲ ص ۲۷۱ و سنن الکبریٰ وغیرہ) یعنی آج کے دن اگر میرے بدن کا بعض حصہ یا سارا ظاہر ہے تو میں اس ظاہر شدہ حصہ کو کسی کیلئے حلال نہیں کرتی۔ اور اس قبیح فعل کی توجیہ یوں نقل کی گئی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ کپڑے پہن کر ہم روزِ مَرہ گناہ کرتے ہیں ، پھر انہی کپڑوں میں اللہ تعالیٰ کے پاک گھر کا طواف کیسے کریں ؟ نیز ہم کپڑے پہن کر فی الجملہ دنیا دار ہوتے ہیں اور رب العزت کے گھر کا طواف ہم دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر کیوں نہ کریں ؟ مگر آپ نے دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے (قرآن کریم میں) اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے اس باطل اور بے ہودہ تصوف کی کیسی خبر لی ؟ اور کس طرح مشہور میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایام حج میں یہ اعلان کر دیا ، کہ خبردار آج کے بعد کوئی مشرک یا کوئی برہنہ طواف نہیں کر سکتا۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۷۱ وغیرہ) صدیق کی بدعت اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں ختم کی۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیزؓ نے کیا ہی پتے کی بات ارشاد فرمائی ہے :

اما بعد اوصیک بتقوی اللہ والاقتصاد	اما بعد میں تجھے خدا تعالیٰ سے ڈرنے اور اس کے حکم میں
فی امرہ واتباع سنیۃ نبیہ صلی اللہ علیہ و	میانہ روی اختیار کرنے اور اس کے نبی صلی اللہ تعالیٰ
سلمہ وتبرک ما احدث المحدثون بعد ما جرت	علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کرنے کی وصیت کرنا ہوں

به سنته و كفوا مؤنته فصليك بلزوم
السنة فانها لك باذن الله عصمة ثم
اعلم انه لم يبتدع الناس بدعة
الا قد مضى قبلها ما هو دليل عليها
او عبرة فيها فان السنة انما سننها
من قد علم ما في خلا فها من الخطا
والزلل والحمق والتعمق فارضى
لنفسك ما رضى به القوم لا نفسهم
فانهم على علم وقفوا وبصرونا فذ
كفوا ولهم على كشف الامور كانوا
اقوى وبفضل ما كانوا فيه اولى
فان كان الهدى ما انتم عليه لقد
سبقتموهم اليه -

(ابوداؤد - جلد ۲ - ۲۷۷)

اور یہ وصیت کرتا ہوں کہ اہل بدعت نے جو بدعتیں ایجاد
کی ہیں ان کو ترک کرنا، جبکہ سنت اس سے قبل جاری ہے
اور سنت کی موجودگی میں بدعت کی ایجاد کی کیا مصیبت ہے؟
سنت کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے سنت
حفاظت کا ذریعہ ہے اور جان لے کر لوگوں نے جو بدعت ایجاد
کی ہے اس سے قبل ہی وہ چیز گذر چکی ہے جو اس پر دلیل ہو
سکتی تھی یا اس میں عبرت ہو سکتی تھی کیونکہ سنت ان پاک
نفس کی طرف سے آئی ہے جنہوں نے اس کے خلاف خطا،
لغزش، حماقت اور تعق کو بغور دیکھ لیا تھا اور اس کو اختیار
نہ کیا۔ تو یہی صرف اس چیز پر راضی رہ جس پر قوم راضی ہو
چکی ہے کیونکہ انہوں نے علم پر اطلاع پائی اور دور رس نگاہ
سے دیکھ کر بدعت سے اجتناب کیا اور البتہ وہ معاملات کی
تسلیم پہنچنے پر قوی تر تھے اور جس حالت پر وہ تھے وہ اہل تر
حالت تھی۔ سو اگر ہدایت وہ ہے جس پر تم گامزن ہو تو اس کا
مطلب یہ ہوا کہ تم ان سے فضیلت میں بڑھ گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ارشاد واضح ہے کہ سنت جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ
کے حضرت صحابہ کرام کا بتلایا تھا اور متعین کیا ہوا طریقہ ہے۔ سنت کے خلاف جو بدعت تھی اس طریقہ
پر بھی اُن کی نگاہ اٹھی ہے۔ مگر انہوں نے برگز اس کو اختیار نہیں کیا۔ اور آج جو دلائل اہل بدعت
پیش کرتے ہیں بینہا یہ دلائل اس وقت بھی موجود تھے، مگر نہ تو اُن کو ان دلائل سے بدعت کا جواز
معلوم ہوا اور ان میں ان کے نزدیک کوئی آئینہ کو بھانے والی عبرت ہی نظر آئی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ
آج اُن دلائل سے بدعت کا جواز اور ثبوت بل سکتا ہے اور اُس وقت نہ مل سکا؟ لہذا تم اسی چیز کو

اپنے لئے پسند کرو جس کو وہ پسند کر چکے ہیں۔ وہ بڑی فضیلت کے مالک اور دُور رس نگاہ رکھنے والے تھے اور ہدایتِ مستقیمہ پہنچتے۔ پھر اگر آج یہ بدعات جائز اور کارِ ثواب ہیں تو اس کا یہی مطلب نکالے گا کہ ہم علم و تقویٰ میں دیانت اور ہدایت میں اُن سے سبقت لے گئے ہیں کہ یہ عبادات اور طاعات ان کو باوجود عمدہ ہونے کے دُسو جھیں اور ہمیں دستیاب ہو گئیں (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

علامہ شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں :

انك لا تجد مبتدعاً ممن ينسب الى الملة الا وهو يستشهد على بدعتہ بدليل شرعي فينزلہ على ما وافق عقله وشهوته (الاعتصام ج ۱ ص ۱۸۱)

تم کسی ایسے مبتدع کو نہ پاؤ گے جو ملت سے وابستگی کا مدعی ہو مگر یہ کہ وہ اپنی بدعت پر کسی شرعی دلیل سے ضرور استنباط کرتا اور اس طریق سے وہ اس کو اپنی عقل اور خواہش کے مطابق بنا لیتا ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ ارقام فرماتے ہیں :

”زیرا کہ ہر مبتدع وضال عقائد فاسدہ خود را بزعم فاسد خود از کتاب و سنت اخذ می کند پس ہر معنی از معانی مفہومہ ازینہا معتبر نہ باشد۔ (مکتوبات حصہ سوم ص ۱۹۹ مکتوب ۱۹۹)

کیونکہ ہر بدعتی اور گمراہ اپنے فاسد عقائد کو اپنے فاسد خیال کے مطابق کتاب اور سنت سے اخذ کرتا ہے لیکن ہر معنی معانی مفہومہ میں سے حجت اور معتبر نہیں ہو سکتا۔

ای عبارت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر مبتدع اور گمراہ جو ملتِ اسلام سے وابستگی کا دعویٰ کرتا ہے اپنے باطل اور فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات پر کتاب و سنت سے تسکینِ قلب یا الزامِ محکم کے لئے ضرور دلائل تلاش کرتا ہے اور ان دلائل کو اپنی نارِ ساقِ عقل اور اپنی خواہش کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا قرآن اور حدیث کا نام لے کر خود فریبی میں مبتلا ہونا اور لوگوں کو مغالطہ میں ڈالنا کسی طرح صحیح نہیں نہ اس کی سمجھ درست ہے اور نہ قرآن کی کم اور حدیث شریف سے اس کی پیش کردہ دلیل ہی صحیح ہے۔ کیونکہ یہی دلائل حضراتِ صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے سامنے بھی تھے مگر ان کو یہ فاسد عقائد اور خود تراشیدہ بدعات

اور رسوم ان سے سمجھ نہ سکے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج ان سے یہ عقائد باطلہ اور بدعات فاسدہ ثابت ہوں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے منکرین تقدیر کے ایک مغالطہ کو (کہ قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے تقدیر کی نفی معلوم ہوتی ہے) دُور کرنے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ :

لقد قرؤا منه ما قرأتہ و علموا من
یعنی حضرات صحابہ کرامؓ ذابغینؓ اور سلف صالحینؓ نے
تاویلہ ما جہلتہ و قالوا بعد ذلک
یہ آیتیں بھی پڑھی ہیں جن کو تم پڑھتے ہو لیکن وہ ان کے
مطلب کو سمجھ نہیں سکتے اور تم انہوں نے یہ
کلمہ بکتاب و قدر۔

ابوداؤد ج ۲ (۲۷۵) سب آیات پڑھنے کے باوجود تقدیر کا اقرار کیا ہے۔

مطلب واضح ہے کہ اگر تمہاری طرف سے پیش کردہ آیات کا وہی مفہوم ہوتا جو تم پیش کرتے ہو تو یہ آیات حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل خیر القرون کے سامنے بھی تو مقبول تھیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان آیات سے اُن کو یہ مطلب سمجھ نہ آ سکا، اور تم اس مطلب کو سمجھ گئے، کیسے باور کر لیا جائے کہ تم حق پر ہو اور وہ باطل پرستے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) نے کیا ہی فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے :

”و میزان در معرفت حق و باطل فہم صحابہؓ
و تابعینؓ است چنانچہ اس جماعت از تعلیم
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالانضمام قرآن
حالی و مقالی فہمیدہ اند و ر اں تخطیہ ظاہر
نمودہ واجب القبول است الی ان قال
اگر بر خلاف قرن اول حمل میکند پس در حجت
او ملاحظہ باید نمود اگر مخالفت اد کہ قطعیہ یعنی
نصوص متواترہ و اجماع قطعی است او را
حق اور باطل کے سمجھنے کے لئے میزان اور معیار حضرات
صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ کا فہم ہے جو کچھ اس جماعت نے آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیم سے حالی اور مقالی قرآن
کے انضمام کے ساتھ سمجھا ہے جبکہ اس فہم میں خطا ظاہر
نہ کی گئی ہو تو وہ فہم واجب القبول ہے (پھر آگے فرمایا)
اگر قرن اول کے خلاف کسی بدعتی نے کوئی مفہوم لیا
تو اس کی بدعت کو ملاحظہ کرنا ہوگا اگر اس کا مستند یہ کہ وہ
مفہوم کسی قطعی دلیل مثلاً نصوص متواترہ اور اجماع قطعی

کافر یا یہ شمر اگر مخالفت اولہ ظنیہ قریبہ
 الیقین است مانند اخبار مشہورہ و اجماع
 عرفی گمراہ توان فہمیدہ دون الکفرۃ
 کے خلاف ہے تو ایسے بدعتی کو کافر شمار کرنا چاہیے، اور
 اگر یہ مخالفت ظنی دلائل کی ہے جو یقین کے قریب ہیں۔
 مثلاً اخبار مشہورہ اور اجماع عرفی تو ایسے بدعتی کو گمراہ
 سمجھنا چاہیے نہ کہ کافر۔ (فتاویٰ عربی ص ۱۵۱)

ان عبارات سے چند امور نہایت وضاحت سے ثابت ہوتے ہیں ① یہ کہ کوئی بدعتی اہل
 گمراہ محض دعویٰ کر کے ہی خاموش نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اپنے اس دعویٰ پر دلائل پیش کیا کرتا ہے۔
 ② دلائل بھی محض عقلی نہیں بلکہ قرآن کریم اور احادیث سے وہ اپنے فرعون پر دلائل لاتا ہے ③ مگر
 قرآن کریم اور حدیث سے جو کچھ اس نے سمجھا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ④ اس لئے کہ یہی قرآن
 اور حدیث حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ وغیرہ سلف صالحین کے سامنے بھی تھے مگر انہوں نے ان
 سے یہ مفہوم نہیں سمجھا جو اہل بدعت سمجھے ہیں۔ ⑤ قرآن کریم اور حدیث کا صحیح مفہوم صرف وہی
 ہو گا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ نے سمجھا ہے۔ ⑥ اہل بدعت کا پیش کردہ مفہوم اگر دلائل
 قطعیہ کے خلاف ہے تو کفر ہو گا، اور ظنی دلائل کے خلاف ہے تو بدعت اور گمراہی ہو گا بلکہ حضرت
 شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہے جس میں قرآن کریم نازل
 ہوا تھا اور اسی طرح جو شخص انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور
 تابعینؓ کی منقول تفسیر کو نہیں جانتا تو اس کے لئے فنی تفسیر میں سرے سے دخل دینا ہی
 حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :

اقول يحرم الخوض في التفسير لمن لا يعرف
 اللسان الذي نزل القرآن به والماثور
 عن النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه
 والتابعين من شرح غريب وسبب نزول
 وناسخ ومنسوخ۔
 میں کہتا ہوں کہ جو شخص اس زبان سے ناواقف ہو جس
 میں قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اسی طرح جو شخص غریب
 لفظ اور شانِ نازل اور ناسخ و منسوخ سے بے خبر ہو،
 جو انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ
 اور تابعینؓ سے منقول ہے تو ایسے شخص کے لئے تفسیر میں

(حجة الله البالغة ج ۱ ص ۱۷۱) دخل دینا ہی حرام ہے۔

اور اہل بدعت کی اپنی بدعت کی تائید میں ہر تفسیر نہ صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام و تابعین سے منقول و ماثور ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے بالکل خلاف ہوتی ہے اور لطف یہ کہ وہ بھی محض خود تراشیدہ اور خود ساختہ، اور ایسے ہی لوگوں کی خود تراشیدہ تفاسیر نے اُمت مرحومہ کا شیرازہ بکیر کر انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ سچ ہے عذر
ایں چنین ارکان دولت ملک را ویراں کنند

اور اگر کوئی تفسیر ماثور اور منقول بھی وہ پیش کرتے ہیں تو اس کی بنیاد بھی جعلی موضوع معلول شاذ اور منکر ضعیف وغیرہ روایات اور آثار پر قائم کی جاتی ہے اور صحیح تفسیر سے عمدًا انماض کیا جاتا ہے اور کوئی روایت سند کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے تو اس کا معنی غلط لیا جاتا ہے اور یہی کچھ وہ قرآن کریم سے کرتے ہیں کہ اپنے باطل عقائد اور آراء کو اس میں دخل دیتے ہیں چنانچہ لام سیوطی (المتوفی ۸۱۳ھ) لکھتے ہیں کہ :

مثل طوائف من اهل البدع اعتقدوا مذاہب باطلۃ و عمدوا الی القرآن فتاقلوا علی رأیہم و لیس لہم سلف من الصحابة و التابعین لا فی رأیہم ولا فی تفسیرہم۔

جیسے اہل بدعت کے مختلف گمراہوں نے باطل اعتقادات قائم کر لئے اور قرآن کریم سے اپنی باطل آراء پر استدلال کر کے اپنی مرضی پر اس کو ڈھال لیا حالانکہ حضرات صحابہ کرام و تابعین میں ان کا کوئی بھی پیش رو نہیں نہ رائے میں اور نہ تفسیر میں۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ :

وفي الجملة من عدل عن مذاہب الصحابة و التابعین و تفسیرہم الی ما یخالف ذلك كان مخطئا في ذلك بل مبتدعا لانہم كانوا اعلم بتفسیرہ و معانیہ کما انہم اعلم حاصل کلام یہ ہے کہ جس نے حضرات صحابہ کرام اور تابعین کے مذاہب اور ان کی تفسیر سے اعراض کیا، اور اس کے خلاف کو اختیار کیا تو وہ شخص خطا کار بلکہ مبتدع ہوگا کیونکہ حضرات صحابہ کرام اور تابعین

بالحق الذی بعث اللہ بہ رسولہ۔
 قرآن کریم کی تفسیر اللہ اس کے معانی کو زیادہ جانتے
 تھے جیسا کہ وہ اُس حق کو زیادہ جانتے تھے جو اللہ
 تعالیٰ نے رسولِ برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 ذریعہ بھیجا تھا۔

اور یہی علامت ہے غلط مذہب کی کہ اس کی بنیاد غلط روایت اور بے بنیاد روایت پر رکھی
 جاتی ہے۔ اگر اہل بدعت حضرات صرف اسی اصول کو اچھی طرح سمجھ لیں تو ان کو جملہ محدثات اور بدعات
 پر دُعا از کار و دلائل پیش کرنے سے یقیناً دستگیری حاصل ہو جائے۔

من انچہ شرطِ بطلان است با تو میگویم
 تو خواه ازیں سخنم پند گیر خواه مطلق



باب ششم

جب کسی چیز کے سنت اور بدعت ہونے میں اشتباہ واقع ہو
تو کیا کرنا چاہیے ؟

سابقہ پیش کردہ دلائل سے بجز اللہ تعالیٰ سنت اور بدعت کی حقیقت اور اس کا حکم واضح سے
واضح تر ہو گیا ہے۔ لیکن اگر بالفرض کسی کو ڈمغہ اور غم فہم کو اشتباہ باقی رہے یا عوام الناس جو اس
قسم کے مسائل میں فریقین کے دلائل کا موازنہ کر کے صحیح رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں تو ان کے لئے صحیح
راہ عمل صرف یہی ہے کہ وہ ایسے مشکوک اور مشتبہ کام کے پاس ہی نہ جائیں، اور اگر کسی چیز کے بدعت اور
سنت یا مستحب اور مباح ہونے میں شبہ ہو تو اس سے بچنا ہی ان کے لئے صحیح راہ عمل ہے، اور باتفاق
علماء ان کے لئے یہی طریقہ صحیح رہنمائی کے لئے بالکل کافی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوصہبہ بن معبد (المتوفی
سہ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

والا تخذ ما حاک فی نفسک و تردد گناہ وہ ہے جو تیرے نفس میں کھٹکے اور تیرے دل میں
فی الصدر و ان افتاک الناس۔ تردد واقع ہو، اگرچہ لوگ (اور نام کے مفتی) تجھے
(رداء احمد والدارمی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۲) فتویٰ بھی دے دیں۔

اور حضرت عطیہ السعدی (المتوفی سہ) فرماتے ہیں کہ :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ بندہ

لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى
 پر ہر گاموں کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتا تا وقتیکہ وہ چیزیں
 يدع مالا بأش به حذر لما به بأش۔
 دھچوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ وہ ذریعہ
 (رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۳۲) جلتی ہیں ایسی چیزوں کا جن میں حرج ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کو جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو
 ارشاد فرمایا:

لا تقضين ولا تفصلن الا بما تعلمون وان
 کہ تم بغیر علم کے کوئی حکم اور فیصلہ برگزیدہ صادر نہ کرنا اور اگر تم
 اشكل عليك امر فقف حتى تبيته او
 پر کسی چیز میں اشکال گذرے تو توقف کرنا حتیٰ کہ تم اس
 تكتب الي فيه۔ (ابن ماجہ ص ۱)۔
 کو اچھی طرح روشن پاؤ اور یا میری طرف خط لکھنا۔

حضرت نعمان بن بشیر (المتوفی ۳۸ھ) روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:
 الحلال بين والحرام بين وبينهما مشبهات
 کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ ان دونوں کے درمیان
 لا يعلمها كثير من الناس فمن اتقى الشبهات
 کچھ چیزیں مشتبہ ہیں ان کو بہت سے لوگ نہیں جانتے
 استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات
 سو جو شخص ان مشتبہات سے بچا تو اُس نے اپنا دین اور
 وقع في الحرام كالراعي حول الحمى يوشك
 عزت بکالی اور جو مشتبہات میں جا پڑا تو (گویا) وہ حرام
 ان يوقع فيه۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۳۱، ابن ماجہ ص ۱۳۱)
 میں جا پڑا جیسے چرگاہ کے ارد گرد جانوروں کو چرانے والا
 قریب ہے کہ چرگاہ میں جا پڑے۔

ان روایات سے آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن اُمور میں اشتباہ
 واقع ہو، ان میں اپنے دین اور عزت کو صرف اسی صورت میں محفوظ رکھا جاسکتا ہے کہ ایسے کاموں
 میں انسانی دخل ہی نہ دے اور ان پر عمل پیرا ہو کہ ہرگز اپنی ابدی زندگی کو برباد نہ کرے اور خلی خدا
 کو گمراہ ہونے سے بچائے۔ خصوصاً ایسے کام جو کفر اور شرک و بدعت کا ذریعہ بنتے ہوں اور یہ معاملہ صرف
 یہیں بس نہیں ہو جاتا بلکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تردّد اور اشتباہ والے کاموں
 سے بچنے کا صریح حکم ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت حسن بن علی (المتوفی ۵۷ھ) روایت کرتے ہیں:

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

يقول دع ما يريك الى ما لا يريك فان
الخير طمانينة وان الشر ريبة -
وہ چیز چھوڑ دے جو تجھے تردد اور اشتباہ میں ڈالے
اور ایسی چیز اختیار کر جو تیرے لئے باعث تردد و ہمو

(مسندک ج ۲ ص ۲۷۱ - قال الحاکم والذہبی صحیح)

یہ صریح اور صحیح حدیث بھی اس امر کو روشن کر دیتی ہے کہ جس چیز میں تردد اور اشتباہ ہو، تو
ایسی چیز کو چھوڑنا ہی ضروری ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی روشن ستیتیں زندگی کے
ہر شعبہ میں ہمارے پاس موجود ہیں جن میں کسی قسم کا ادنیٰ سے ادنیٰ شک اور شبہ بھی نہیں ہے اور وہی
روشن ستیتیں طمانینۃ قلب کا کافی سامان مہیا کر دیتی ہیں اور ان کی خلاف ورزی شک اور شبہ کے
تاریک گٹھے میں ڈال دیتی ہے۔ احادیث میں اس کی تصریح آتی ہے کہ (کان النبی صلی اللہ علیہ
وسلم یحب التیامن) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (سرمد لگانے، کپڑا پہننے، وضو کرنے میں حتیٰ کہ
ہر کام میں) داہنے پہلو اور جانب کو ترجیح دیتے تھے۔ معتمد حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ :
قال لا یجعل احدکم للشیطان شیدا من
صلاۃ یرى ان حق علیہ ان لا ینصرف
الا عن یمینہ لقد رايت رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کثیرا ینصرف عن یمارہ -
تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کے لئے کچھ
حقتہ نہ ٹھہرائے بایں طور کہ نماز سے فارغ ہوتے وقت
دہنی طرف ہی پھرنے کو اپنے اوپر لازم سمجھے اس واسطے
کہ میں نے جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بسا اوقات
بائیں طرف ہی مڑتے دیکھا ہے۔
(متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۸)

اس حدیث کی تفسیر اور تشریح میں مشہور متفق علامہ محمد طاہر عفی اللہ عنہ (المتوفی ۱۳۹۹ھ) فرماتے ہیں :

نیہ من اصر علی امر مندوب وجعل
عزما ولم یعمل بالترخصۃ فقد اصاب منه
الشیطان من الاضلال فکیف من اصر
علی بدعۃ او منکر۔ (مجمع البحار ج ۲ ص ۲۷۱)
کہ جس کسی نے کسی مندوب اور مستحب چیز پر اصرار کیا اور اس کو
غزیمت بنالیا اور رخصت پر عمل نہ کیا تو گویا اس کو شیطان
نے گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا۔ کیا حال ہوگا اس شخص کو جو
کسی بدعت اور برائی چیز پر اصرار کرتا ہے۔

اور یہی الفاظ علامہ طیبی (الحنفی المتوفی ۱۳۸۵ھ) شرح مشکوٰۃ میں اور حضرت ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ ۳۵۲ میں تحریر فرمائے ہیں جو اس امر کی واضح ترین دلیل ہے کہ بدعت اور منکر پر اصرار کرنا تو کجیاریا، اگر کوئی شخص امرِ مندوب اور مستحب پر یا رخصت پر بھی اصرار کرے گا تو وہ بھی شیطان کا پیروکار ہوگا اور اُس کے اس فعل میں شیطان کا حصہ ہوگا۔ علامہ برکلی الحنفی (المتوفی ۱۳۸۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اعلم ان فعل البدعة اشد ضررا
من ترك السنة بدليل ان الفقهاء قالوا
اذا تردد الحكم في شيء بين حكمه
سنة وبدعة فنكره لازمه۔ (طريقہ محمدیہ ص)
اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ :

وما تردد بين البدعة والسنة يترك۔
(عالمگیری ج ۱ ص ۱۸۷)

اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں کہ :

اذا تردد الحكم بين سنة وبدعة كان ترك
السنة واجبا على فعل البدعة (شامی ج ۱ ص ۱۸۷)

قاضی ابراہیم صاحب الحنفیؒ فرماتے ہیں :

”جس کام کے بدعت اور سنت ہونے میں شبہ ہو اس کو چھوڑنے کیونکہ بدعت کا چھوڑنا
ضروری ہے اور سنت کا ادا کرنا ضروری نہیں۔“ (نفائس الانوار ترجمہ مجالس الابرار ص ۱۲۹)

اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں :

”وہرچہ دران شبہ بود توقف دران لازم۔“ (مکتوبات حضرت شیخ روبر عاشر
اخبار الاخيار ص ۱۷۱)

بلکہ علامہ ابن نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

و یلزم ان ما تردد بین بدعة و واجب جو چیز بدعت اور واجب اصطلاحی کے درمیان اصطلاحی فائده یقولہ کالسنۃ۔ دائرہ ہو تو لازم ہے کہ اس کو سنت کی طرح ترک (بحر الرائق - ج ۲ ص ۱۶۵) کر دیا جائے۔

یہ عبارات اس امر کا یقین ثبوت ہیں کہ جب کوئی چیز ایسی ہو کہ اس میں سنت کے پہلو کے ادا کرنے سے بدعت لازم آتی ہو تو سنت کے پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کو مطلقاً ترک کرنا ضروری ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ بدعت کا پہلو بھی تو شامل ہے۔ سنت تو خیر پھر سنت ہے اگر کوئی چیز بدعت اور حضرات فقہاء کرام کے اصطلاحی واجب کے درمیان بھی دائرہ ہو تو اس کو بھی ترک کرنا لازم اور ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے فی الجملہ بدعت کی ترویج اور اشاعت کا اندیشہ ہے۔ اور بدعت اتنی قبیح ترین چیز ہے کہ شریعت مطہرہ اس کے وجود نامسعود تک کو گوارا نہیں کرتی، چہ جائیکہ اس کی نشر و اشاعت کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ بدعت کو ختم کرنے کے لئے مستحب، سنت اور حتیٰ کہ واجب تک کی قربانی بھی گوارا کر لی جائے گی مگر بدعت کو ہرگز ہرگز فروغ نہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص استیانہ دانستہ بدعت میں آلودہ ہونا چاہے تو اس کی مرضی۔ ہمارے لئے سنت کافی ہے اور ہمیں محدثات اور مزخرفات میں الجھنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے، وَلِلّٰهِ دَرْءٌ سَه

و خیر اہود الدین ما کان سنۃ

و شرۃ الاہور المحدثات البدائع

قارئین! اگر آپ کو صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ سے لگاؤ اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عشق اور محبت ہے تو اس کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ سنت کی اتباع کریں اور حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور تبع تابعینؓ کے نقش قدم پر چلیں۔ وہی عقائد و اعمال اختیار کریں جو انہوں نے اختیار کئے اور ان تمام عقائد اور اعمال سے احتراز کریں جن سے انہوں نے احتراز کیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے قول (جو درحقیقت مرفوع حدیث میں ہے) کے مطابق مسجدوں میں

بھی اجتماع ہو اور ایمانی سے بھی محرومی ہو۔

قال يأتي على الناس زمان يجتمعون في المساجد ليس فيهم مؤمن - حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ مسجدوں میں اکٹھے تو ہوں گے لیکن ان میں ایک بھی مؤمن نہ ہوگا۔ (مسندک ج ۴ ص ۲۳۳، قال الحاکم والذہبی صحیح)

یہ وہی حضرت ابن عمرؓ ہیں جنہوں نے تشویب جیسی بدعت کی وجہ سے ایک مسجد ہی ترک کر دی تھی۔ الغرض اخلاص اور اتباع سنت کے ساتھ معمولی عبادت بھی مفید ہے اور شرک اور بدعت کو دل میں جگہ دینے سے بڑی سے بڑی عبادت بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عمل اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے۔ صرف اسی کی بارگاہ سے سب کچھ مل سکتا ہے۔
اُسی سے ملنا جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ دولت نہیں سوال کے بعد



باب ہفتم

اس باب میں فرداً فرداً ان تمام بدعات پر بحث ہوگی، جن پر فریق مخالف عمل پیرا ہے اور جن کو وہ بزعم خود شعارِ خفیت قرار دیتا ہے

محفل میلاد

اس میں شک و شبہ کی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و عقیدت اور محبت عین ایمان ہے۔ اور آپ کی ولادت سے ملے کہ وفات تک زندگی کے ہر شعبہ کے صحیح حالات و واقعات اور آپ کے اقوال و افعال کو پیش کرنا باعثِ نزولِ رحمتِ اقدس ہے۔ اور مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے حالات کو معلوم کرے اور ان کو مشعلِ راہ بنائے۔ سال کے ہر مہینہ میں اور مہینہ کے ہر ہفتہ میں اور ہفتہ کے ہر دن میں اور دن کے ہر گھنٹہ اور منٹ میں کوئی وقت ایسا نہیں جس میں آپ کی زندگی کے حالات بیان کرنے اور سننے ممنوع ہوں۔ یہ بات محلِ نزاع نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ربیع الاول کی بارہویں تاریخ کو مقرر کر کے اس میں میلاد منانا، محفل اور مجلس منعقد کرنا، جلوس نکالنا یا اسی دن کو مخصوص کر کے فقرار اور مساکین کو کھانا کھلانا، وغیرہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام اور اہل خیر القرون سے ثابت ہے؟ اگر ثابت ہے تو کسی مسلمان کو اس میں پس و پیش کرنے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کیونکہ جو کچھ انہوں نے فعلاً یا ترکاً کیا، وہی دین ہے اور اس کی مخالفت بے دینی ہے۔ تیس سال آپ بعد از نبوت قوم میں زندہ ہے

اور پھر تیس سال خلافت راشدہ کے گزرے ہیں اور پھر ایک سو دس ہجری تک حضرات صحابہ کرام کا دور رہا ہے۔ کم و بیش دو سو بیس برس تک اتباع تابعین کا زمانہ تھا، عشق ان میں کامل تھا، محبت ان میں زیادہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا احترام و تعظیم ان سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے؟ اگر فریق مخالف ہمت کے ان سے یہ ثابت کر دے تو چشم مار و دل ماشاؤ، کسی مسلمان کو اس سے سروقتلات نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر فریق مخالف خیر القرون سے اس کا ثبوت نہ پیش کر سکے اور تاقیامت نہیں کر سکے گا، تو سوال یہ ہے کہ باوجود محرک اور سبب کے یہ مبارک کام اور کارِ ثواب اُس وقت کیوں نہ ہوا؟ اور آج یہ کیسے کارِ ثواب اور مبارک ہو گیا ہے؟ بس صرف اسی ایک نقطہ پر نگاہ جما کر دو ٹوک فیصلہ کرنا چاہیے۔ وہ تمام فوائد و برکات اور منافع اُس وقت بھی تھے، جن کو آج اہل بدعت حضرات بیان کرتے ہیں، اور خان صاحب بریلوی، مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی، مولوی عبدالستیع صاحب، مولوی محمد صالح صاحب، مفتی احمد یار خان صاحب اور مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے اس کے اثبات پر جو دُور ازکار، بے فائدہ اور لالچین دلائل پیش کر کے صفحات کے صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ اُن کو صرف اور صرف اس مرکزی نقطہ پر منجھانے کی جانی چاہیے تھی کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اور اہل خیر القرون نے کہا اور کیا وہی دین ہے اور بس یہ

بمصطفیٰ برسوں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ یاد رہے کہ محفل میلاد و مجلس میلاد اور چیز ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نفس ذکر ولادت باسعادت اور شے ہے۔ اقل بدعت ہے اور ثانی مندوب و مستحب ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (المتوفی ۱۳۳۳ھ) تحریر فرماتے ہیں:

”نفس ذکر ولادت مندوب ہے اور اس میں کراہت قیود کے سبب سے آئی ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۷۱)۔ نیز لکھتے ہیں: نفس ذکر ولادت فخر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندوب ہے مگر بسبب انفعام ان قیود کے یہ مجلس ممنوع ہو گئی۔“ (ج ۱ ص ۱۷۱)۔

اگر کسی عالی فہم کو نفسِ ذکر و لاوت اور عقدِ مجلس اور محفلِ میلاد کا فرق سمجھ نہ آئے تو اس کا ہمارے پاس کیا علاج ہے؟

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے اس میں بھلا قصور کیا ہے؟ آفتاب کا مجلسِ میلاد کی تاریخ | پوری چھ صدیاں گزر چکی تھیں کہ اس بدعت کا کہیں مسلمانوں میں رواج نہ تھا۔ یہ نہ تو کسی صحابی کو سُوجھی نہ تابعی کو نہ کسی محدث کو اور نہ فقیہ کو، نہ کسی بزرگ کو اور نہ کسی ولی کو۔ یہ بدعت اگر سُوجھی تو ایک مسرف بادشاہ کو اور اس کے ایک رفیق دنیا پرست مولوی کو یہ بدعت ۱۷۷۷ء میں موصل کے شہر میں مظفر الدین کو کریم بن اربل (المتوفی ۱۸۳۷ء) کے حکم سے ایجاد ہوئی جو ایک مسرف اور دین سے بے پروا بادشاہ تھا (دیکھئے ابن خلکان وغیرہ) اور امام احمد بن محمد مصری مالکی (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ :

کان ملکا مسرفا یا مر علماء زمانہ ان وہ ایک مسرف بادشاہ تھا۔ علماء زمانہ سے کہا کرتا تھا
یعملوا باستنباطہم واجتہادہم وان کہ وہ اپنے استنباط اور اجتہاد پر عمل کریں اور غیر کے
لا یتبعوا۔ لہذا یتبعوا حتی مالت الیہ مذہب کی پیروی نہ کریں۔ حتی کہ (دنیا پرست) علماء اور
جماعة من العلماء وطائفة من الفضلاء فضلا کی ایک جماعت اس کی طرف مائل ہو گئی اور وہ
ویحتفل لمولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول میں میلاد منعقد کیا کرتا تھا۔ بادشاہ ہر
فی التریع الاول وهو اول من احدث من میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے۔
الملوک هذا العمل۔ (القول المعتبر فی عمل الملوک)

اور یہ مسرف بادشاہ بیت المال اور رعایا کی لاکھوں کی رقم اس بدعت اور جشن پر صرف کر دیتا تھا اور اس طرح اُس نے رعیت کے قلوب کو اپنی طرف مائل کرنے کا ایک دینی ڈھونگ بچا رکھا تھا اور بیدریغ ملک اور قوم کی رقم کو اس طرح برباد کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ علامہ ذہبی (المتوفی ۷۴۸ھ) نقل کرتے ہیں کہ :

کان ینفق کل سنة علی مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحو ثلاث مائة الف۔ وہ ہر سال میلاد (جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر تقریباً تین لاکھ روپیہ خرچ کیا کرتا تھا۔
(دول الاسلام ج ۲ ص ۱۰۳)

اور جس دُنیا پرست مولوی نے اس جشن کے ولداوہ بادشاہ کے لئے مغل میلاد کے جواز پر مولود اکٹھا کر دیا تھا، اُس کا نام عمر بن وحیہ ابو الخطاب (المتوفی ۳۳۸ھ) تھا، جس کو اس کتاب کے صلیب صاحب اربل اور مسرف بادشاہ نے ایک ہزار پونڈ انعام دیا تھا (دول الاسلام ملتان)۔ اب ذرا اس مولوی کی تعریف بھی ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ حضرت کیسے تھے؟ حافظ ابن حجر عسقلانی مَقتل کرتے ہیں کہ:

کثیر الوقیۃ فی الاثمة و فی السلف من العلماء وہ ائمہ دین اور سلف کی شان میں بہت ہی گستاخی کیا
خبیث اللسان احمق شدید الکبر قليل النظر کرتا تھا۔ گندی زبان کا مالک تھا۔ بڑا احمق اور تکبر تھا۔
فی امور الدین متهاونا۔ (سان المیزان ج ۲ ص ۲۹) دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سُست تھا۔
نیز حافظ موصوف نقل کرتے ہیں کہ:

قال ابن التَّجَار دایت الناس مجتہبین علامہ ابن تجار فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو اس کے
علی کذبہ وضعفہ (سان المیزان ج ۲ ص ۲۹) جھوٹ اور ضعف پر متفق پایا۔

حضرات! آپ نے دیکھا کہ مجلس میلاد کو رائج کرنے والا ایک فریب خوردہ اور مسرف بادشاہ تھا۔ جو علماء کو بجائے سلف صالحین کے مذہب کی اتباع کرنے کے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لینے کا حکم دیا کرتا تھا۔ اور رعایا کی سادگی اور مذہبی شوق سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُس نے اپنی ملکی سیاست کو محفوظ کیا اور حظ نفس کے لئے راستہ ہموار کیا، اور جواز میلاد پر کتاب لکھنے والا وہ دُنیا پرست مولوی اُس کو بل گیا جس کی گندی زبان سے سلف صالحین بھی نہ چھوٹے اور وہ احمق اور تکبر مہنے کے ساتھ دین کے معاملات میں بھی بہت بے پروا اور سُست تھا۔ اور اس چالاک بادشاہ اور ہوشیار مولوی کے ساتھ وہ بے چارے پیر اور صوفی بھی شامل ہو گئے جو دین کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے اور جو سادہ ہونے کی وجہ سے ہر چھلکے اور پوست کو مغز سمجھ لیتے ہیں۔ پھر جب بادشاہ اور ماہر نفسیات مولوی اور سادہ قسم کے صوفیاء اس کام کو دین کا کام بتا کر عوام سے اپیل کریں تو عوام بے چارے اس میں کیوں نہ پھنسیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارک (المتوفی ۳۸۸ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے۔

و هل افسد الدین الا الملوک و احبار سوء و دُہبانہا

اب جس کی مرضی ہے کہ وہ خیر القرون کی اتباع کرتا ہے یا نفس پرست بادشاہ اور زیر پرست مملوئی کی؟ ہم تو خیر القرون کی اقتدار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اسی کی توفیق دے۔ اور اس محفل میلاد کی ہر زمانہ کے اہل حق اور ہر طبقہ کے علماء نے پُر زور تردید کی ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حنبلیؒ نے (اپنے فتاویٰ جلد ۱ ص ۱۸۱) اور امام نصیر الدین شافعیؒ نے (دیکھئے رشاد الاخیار ص ۱۸) اور حضرت محمد و الف ثانی الخفیؒ نے (مکتوبات حصہ ۵ ص ۱۸۱) اور علامہ ابن امیر الحاج مالکیؒ نے پوری صراحت اور وضاحت سے اس کی تردید کی ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ:

ومن جملة ما احدثه من البدع مع اعتقادهم ان ذلك من اكبر العبادات و اظهار الشعائر ما يفعلونه في الشهر السابع الاول من المولد وقد احتوى ذلك على بدع ومحرمات الى ان قال وهذه المفاصد متروكة على فعل المولد اذا عمل بالسمع فان خلا منه وعمل طعما فقط ونوى به المولد ودعا اليه الاخوان وسلم من كل ما تقدم ذكره فهو بدعة بنفس نيتة فقط لان ذلك زيادة في الدين وليس من عمل السلف الماضين و اتباع السلف اولي۔
(مغل ابن الحاج مطبوع مصر ج ۱ ص ۱۸۱)

لوگوں کی ان بدعتوں اور نو ایجاد باتوں میں سے جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو شاعر اسلام کا اظہار کہتے ہیں ایک مجلس میلاد بھی ہے جس کو وہ ماہ ربیع الاول میں کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہے (آخر میں فرماتے ہیں) اور اس مجلس میلاد پر یقیناً اس صورت میں مرتب ہوتے ہیں جبکہ اس میں سماع ہو سو اگر مجلس میلاد سماع سے پاک ہو اور صرف نہایت ملود کھانا تیار کر لیا ہو اور بھائیوں اور دوستوں کو اس کے لئے بلایا جائے اور تمام مذکورہ بالا مفاصد سے محفوظ ہو، تب بھی وہ صرف نہایت (مجلس میلاد) کی وجہ سے بدعت ہے اور دین کے اندر ایک جدید امر کا اضافہ کرتا ہے، جو سلف صالحین کے عمل میں نہ تھا حالانکہ اسلاف کے نقش قدم پر چلنا اور ان کی پیروی کننا ہی زیادہ بہتر ہے۔

اور علامہ عبدالرحمن مغربیؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں کہ:

ان عمل المولد بدعة لم يقل به ولم يفعلہ بتحقيق ميلاد كذا بدعت ہے۔ زوداً حضرت صلی اللہ تعالیٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلفاء
والاثریۃ۔ (کذا فی الشریعۃ اللابیہ)
علیہ وسلم نے اور آپ کے حضرات خلفاء راشدین اور ائمہ
مجتہدین نے خود اس کو کیا اور نہ اس کا حکم دیا۔

اور علامہ امجد بن محمد مصری مالکی لکھتے ہیں کہ:

قد اتفق علماء المذاهب الاربعة بدم
هذا العمل۔ (القول المتعمد)
چاروں مذہب کے علماء اس عمل میلاد کی مذمت پر
متفق ہیں۔

قارئین کرام! آپ ان ٹھوس حوالوں سے اس مسئلہ کی تہ تک، تو پہنچ جائیں گے کہ نیز القرون
میں یہ عمل نہ تھا بلکہ چھٹی صدی کے بعد یہ ایجاد ہوتا تھا، اور اس کے موجدین کا حال بھی معلوم ہو چکا ہے
کہ بادشاہ وقت اس کا سرپرست تھا اور بحسب "الناس علی دین ملوکہم" عوام کا اس سے متاثر ہونا
برگزیدہ از قیاس نہ تھا۔ عوام تو کیا بلکہ بعض خواص بھی اس کے عالمگیر پروپیگنڈا سے متاثر ہوئے بغیر
نہ سکے اور ان مسلمانوں کے اس عمل کے جواز کے لئے شرعی دلائل کی تلاش اور بتو شروع کر دی گئی اور
دور دراز کے قیاسات سے کام لے کر اس کا دعویٰ کو چلانے کی کوشش کی گئی اور امام جلال الدین سیوطی
مصری (متوفی ۹۱۱ھ) جیسے وسیع النظر عالم کو بھی یہ کہنا پڑا کہ:

لیس فیہ نص ولکن فیہ قیاس۔ اس کے جواز پر نص تو کوئی نہیں البتہ قیاس ہے۔
(مسی المتعصنی علی الملک)

اور اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر لیا کہ قرآن کریم، حدیث شریفہ اور اجماع سے کوئی نص اس میلاد
کے جواز پر موجود نہیں ہے، ہاں البتہ قیاس ہے۔ اور قیاس جو پیش کیا وہ بھی فاسد، اور یہ بات بھی
نظر انداز کر دی گئی کہ جس چیز کا سبب اور محرک خیر القرون میں موجود تھا، اس میں قیاس اور اجتہاد
کرنے کی گنجائش ہی کہاں سے پیدا ہو گئی؟ اور مولوی عبدالستیع صاحب (دخیر) جب آئے تو انہوں
نے اپنے دل کی تسکین اور اپنے حواریوں کی تشفی کے لئے تہذیب ناموں کی فہرست بھی دے دی کہ یہ حضرات
عمل مولد کو مستحسن سمجھتے تھے (انوار ساطعہ ص ۲۵۸) مگر اس پر غور نہ کیا کہ حضرات صحابہ کرام اور تابعین کا
نام بھی ان میں ہے یا نہیں؟ حضرات ائمہ مجتہدین اور مستند محدثین کا ذکر بھی ہے یا نہیں؟ پھر اس پر

بھی غور دیکھا کہ ان میں اکثریت صوفیاء کرام کی ہے، جن کا عمل بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ بخت نہیں۔ عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست۔ اور جو بعض محقق عالم ہیں، وہ خود قیاس فاسد کی غلطی کا شکار ہیں، اور بعض وہ بھی ہیں جو اس تاریخ میں فقط فقراء کو کھانا کھلاتے تھے اور بعض نفس ذکر و بلاد کے استحباب کے قائل ہیں اور بعض صرف دل میں خوشی کے اظہار کے قائل ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۸۴ھ) سے بھی محفل میلاد کے اثبات کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اپنے رسالہ ہفت مسئلہ ص ۱۷ میں اس کو جائز اور باعث برکت کہتے ہیں (محصلہ ج ۱ الحق ص ۲۲)۔ مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ رسالہ ہفت مسائل حضرت حاجی صاحب کے قلم کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (المتوفی ۱۳۶۳ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ نفس مضمون حاجی صاحبؒ کا ہے اور عبارت حضرت تھانویؒ کی ہے۔ (دیکھئے ہاشم فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۸۱) اور حضرت تھانویؒ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اس کے جواز کے قائل تھے، پھر رجوع کر لیا تھا۔ اور حضرت حاجی صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ نفس ذکر مندوب اور قیود بدعت ہیں (ہاشم مذکور ص ۱۸۱) پھر وہ مفسد بھی ان کے وقت اور ان کے ذہن میں نہ تھے جو لوگوں میں مروج تھے۔ (دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۸۱) پھر حاجی صاحبؒ کسی شرعی دلیل کا نام نہیں ہے۔ لہذا حاجی صاحبؒ کا ذکر کرنا سوالات شرعیہ میں بے جا ہے (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۸۱) یہ یاد رہے کہ میلاد کا جلوس انگریز کے زمانہ میں ایک خاص مصلحت کے تحت پٹی ضلع لاہور سے دو شخصوں نے ایجاد کیا تھا۔ مولوی عبد المجید صاحب جو فوت ہو چکے ہیں اور جناب حاجی غنی اللہ صاحب جو تادم تحریر لاہور میں بقیہ حیات ہیں۔ بلکہ وہ اس جلوس کے تنہا بانی بننے کے مدعی ہیں۔ مفتی احمد یار خان صاحب کی انوکھی دلیل | وہ لکھتے ہیں کہ حدیث شریفین میں بھی نہایت اہتمام سے یہ مجلس پاک منعقد کی جاتی ہے۔ جس ملک میں بھی جاو مسلمانوں میں یہ عمل پاو گے۔ اویار اللہ و علماء اُمت نے اس کے بڑے بڑے فائدے اور برکات بیان فرمائی ہیں (الی ان قال) لہذا محفل میلاد پاک مستحب ہے (ج ۱ الحق ص ۲۲) اور ص ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ ”استحباب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ

مسلمان اس کو اچھا جانیں۔ (بلفظ)

الجواب : یہی حرمین الشریفین بھی تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور تبع تابعینؓ اور ائمہ مجتہدینؓ جیسے اولیاء اللہ اور علماء اہل بیتؑ بھی تھے، اُن کو یہ فائدے اور برکات کیوں نہ سمجھ آ سکے؟ اور وہ اس مروجہ مجلسِ پاک کے منافع سے کیوں محروم رہے، پھر چھ صدیوں تک جس ملک کے مسلمانوں کو دیکھا، اُن میں یہ عمل نہ پایا گیا۔ نہ معلوم وہ اس کی برکات سے کیوں بہرہ ور نہ ہو سکے؟ بلاشبہ حرمین الشریفین کی نصوص سے بڑی فضیلت اور مرتبہ ثابت ہے۔ لیکن شرعی دلائل صرف چار ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر حرمین الشریفین میں اچھے کام ہوں تو نور علی نور، ورنہ ہرگز محبت نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت ملا علی قاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ :

فی الحرمین الشریفین من شیوع الظلم و
حرمین شریفین میں ظلم شایع ہے، جہالت کثیر ہے
کثرة الجہل وقلة العلم وظهور المنکرات و
علم کم ہے، منکرات کا ظہور ہے، بدعات رائج
فسوح البدع واکل الحرام والشبهات
ہیں۔ حرام کھایا جاتا ہے، دینی شبہات بھی بکثرت
(مرقات ج ۳ - ۲۷۱) ہیں۔

مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ رشک ہے کہ استحباب کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ مسلمان اس کو اچھا جانیں۔ بدعات کی نشرو اشاعت کے لئے کیا چور دروازہ تلاش کیا گیا ہے، اور یہ بھول گئے کہ استحباب تو اونچی چیز ہے، اباحت بھی حکم شرعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر اس کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتا، جس کی پوری تفصیل با دلائل گزر چکی ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :

الندب حکم شرعی لا بد لہ من دلیل (رد المحتار) استحباب شرعی حکم ہے، اس کے لئے دلیل درکار ہے۔
مفتی صاحب تو یوں ہی گلو غلاصی کرنا چاہتے ہیں مگر کون اس طرح ان کو چھوڑتا ہے کلک
کلک مانیز زبانے و بیانے دارد

میلاد میں قیام کرنا کسی بزرگ کے لئے جو بنفس نفیس آئے، بعض حالات میں بشرطیکہ افراد اور

تقریباً ہو، قیام درست ہے اور اس پر حضرت امام نوویؒ وغیرہ نے قوماً الی سیدکم کی حدیث سے استدلال کیا ہے (شرح مسلم ج ۲ ص ۹۵)

بعض دوسرے حضرات اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ زخمی تھے اور آپ نے اُن کو گدے سے اُتارنے کے لئے یہ فرمایا تھا۔ چنانچہ مسند احمد کی روایت میں ہے: قوماً الی سیدکم فانزلوه من الحمار۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قوماً الی سیدکم فرمایا ہے لستیدکم نہیں فرمایا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل اس موقع پر کیا تھا، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس موقع پر کس عمل کو پسند اور کس کو مکروہ سمجھتے تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ:

لم یکن شخص احب الیہم من رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وکانوا اذا رآوه لم یقولوا لہما یعلمون من کراہیتہ لذلک۔ جب وہ آپ کو دیکھتے تھے تو قیام نہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ (رواہ الترمذی ج ۲ ص ۲۱۸) وقال بذہ حدیث حسن صحیح۔ جانتے تھے کہ آپ اس قیام کے عمل کو مکروہ سمجھتے تھے۔

ومشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۱۸ وسند احمد ج ۲ ص ۱۵۱ وادب المفرد ص ۱۳۸

اس صحیح حدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے لئے قیام کو پسند نہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ باوجودیکہ ان کو آپ سے انتہائی محبت تھی، قیام نہ کرتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ جس چیز کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی پسند نہ کرتے ہوں اور کمال محبت کے باوجود حضرات صحابہ کرامؓ بھی اس پر عمل نہ کرتے ہوں (جبکہ بنفس نفیس آپ موجود بھی تھے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو نظر بھی آتے تھے) تو پھر آج جبکہ آپ کا کسی مجلس میلاد میں، آنا کسی شرعی دلیل سے ثابت ہی نہیں (دیکھئے راقم الحروف کی کتاب تبرید التواظل) اور نہ کسی کو نظر آتے ہیں تو پھر کس طرح قیام کو جائز اور مستحب قرار دیا جاتا ہے، بلکہ واجب اور فرض کہا جاتا ہے اور قیام نہ کرنے والے کی تکفیر کی جاتی ہے۔

مولوی عبد السمیع صاحب محمد بن یحییٰ مفتی حنابلہ سے اپنی تائید میں نقل کرتے ہیں کہ :-

حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؑ و ہر چیز کہ برآں ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نباشد اُن فعلِ عبث است و مخالفِ سنتِ سید الانام و مخالفتِ سنتِ حرام است پس ہرگز روا نباشد و اگر دلش خواہ مخفی خیرات کند و ہر روز یکہ باشد تا نمود نشود۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۹)۔
ایک عقل مند اور صاحبِ انصاف کو یہ دلائل پس ہیں۔ نہ ماننے والے کے لئے کوئی دلیل سودمند نہیں ہے۔

عکس کرنا

بندگانِ دین سے حُسنِ عقیدت اور محبتِ الحب فی اللہ کے موافق افضل ترین اعمال میں داخل ہے، اُن کے نقشِ قدم پر چلنا اور ان کی صحیح معنی میں پیروی کرنا باعثِ سعادت ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے لئے شرعی قواعد کے تحت ایصالِ ثواب کرنا اور ان کے رفیع درجات کے لئے دعا کرنا، ایک پسندیدہ عمل ہے۔ اگر کسی بزرگ کی قبر قریب ہو تو اُس پر حاضر ہو کر دعا کرنا اور سنت کے مطابق سلام کہنا، سب درست اور جائز ہے۔ ہاں البتہ دور دراز کی مسافت طے کر کے زیارتِ قبور کے لئے جانا، اہل سنت میں مختلف فیہ امر ہے اور منع کرنے والے حضرات حدیث لا تشد المرحال الا الی ثلاثۃ مساجد (الحدیث) سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ طور سے واپس آئے، تو اس حدیث کے راوی حضرت بصرہ بن ابی بصرہ الغفاریؓ (المتوفی ۳۳ھ) نے اسی حدیث سے طور کا سفر اختیار کرنے کی ممانعت ثابت کی اور فرمایا۔ اے ابو ہریرہؓ! اگر میں آپ سے آپ کے طور پر جانے سے پہلے ملاقات کر لیتا تو اس حدیث کے تحت میں آپ کو ہرگز وہاں نہ جانے دیتا۔ (نسائی ج ۱ ص ۱۹۱) حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حق میرے نزدیک یہ ہے کہ قبر اور اولیاء اللہ میں سے کسی ولی کی عبادت کا محل اور طُور سب کے سب اس نہی میں برابر ہیں (حجتہ اللہ بالغرض ص ۱۹۱) بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص اجمیر میں حضرت خواجہ چشتیؒ کی قبر پر یا حضرت سالار مسعود غازیؒ کی قبر یا ان کی مانند کسی اور قبر پر اس لئے گیا کہ وہاں کوئی حاجت

طلب کرے تو اُس نے ایسا گناہ کیا کہ جو قتل اور زنا سے بھی بدترین گناہ ہے (تفہیمات البیہیؑ مطہم) لیکن قبروں کی زیارت کے لئے دن مقرر کرنا اور معین دن میں اجتماع کرنا ہرگز شریعت سے ثابت نہیں ہے اور خصوصاً سال کے بعد جو دن مقرر کیا جاتا ہے جس کو عرس کہتے ہیں، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :

لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا (نسائی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۷) تم میری قبر کو عید نہ بناؤ۔

شرح حدیث نے اس کے متعدد معانی اور مطالب بیان کئے ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ :-
لَا تَجْتَمِعُوا لِلزِّيَارَةِ اجتماعاً للعید۔ تم زیارت کے لئے ایسے مجمع ہو جیسے کہ تم عید کیلئے مجمع ہوتے ہو۔

اور یہی اجتماع عرس میں ہوتا ہے جس سے آپ نے منع کیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے :-
المعاد الحث علی كثرة الزيارة ای کہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو کثرت زیارت پر آمادہ
لَا تَجْعَلُوا بِالْعِيدِ الَّذِي لَا يَأْتِي فِي السَّنَةِ کیا گیا ہے کہ تم میری قبر کو عید کی طرح نہ بناؤ جو سال
الامرة۔ (ذکرہ فی المقات، ما مش مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۷) میں صرف ایک ہی مرتبہ آتی ہے۔

اور عرس بھی مقرر طور پر سال میں صرف ایک ہی دفعہ کیا جاتا ہے، اور ایسا کرنا اس حدیث کے خلاف ہے
جب آپ کی قبر پر عرس کرنا اور میل لگانا درست نہ ہوا تو کسی اور کی قبر پر کیسے صحیح اور درست ہوگا ؟
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں :

لَا تَجْعَلُوا زِيَارَةَ قَبْرِي عِيدًا اقول هذا میں کہتا ہوں کہ آپ نے جو یہ فرمایا کہ میری قبر کی زیارت
اشارة الى سدّ مدخل التحريف كما کو عید نہ بناؤ، اس میں اشارہ ہے کہ تحریف کا دروازہ
فعل اليهود والنصارى بقبور انبياءهم بند کر دیا جائے کیونکہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے حضرات
وجعلوها عيدا وموسما بمنزلة الحج۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کو حج کی طرح
(حجۃ البالیغ ج ۲ ص ۲۷، طبع مصر) عید اور موسم بنا دیا تھا۔

تو جیسے حج کے لئے آیام کی تخصیص اور خاص اہتمام کیا جاتا ہے بعینہ اسی طرح یہود اور نصاریٰ

نے قبور حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ کیا اور ماشاء اللہ تعالیٰ نام کے مسلمانوں نے حضرت
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں کے علاوہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں (بلکہ مصنوعی قبروں) سے
بھی وہ کچھ کیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ بھی شرمایا جائیں۔ نیز تحریر فرماتے ہیں کہ :

ومن اعظم البدع ما اخترعوا فی امر القبور بڑی بدعتوں میں سے یہ ہے کہ لوگوں نے قبور کے بائیں میں
واتخذوا ہا عیاداً (تہنیت الہیہ ج ۲ ص ۶۱) بہت کچھ اختراع کیا ہے اور قبروں کو میلہ گاہ بنا لیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں :

سوال : برائے زیارتِ قبور روز معین نمودن یا روز عرس ایساں کہ معین است رفتن

درست است یا نہ ؟

جواب : "برائے زیارتِ قبور روز معین نمودن بدعت است، اصل زیارت جائز و تعیین
وقت درست نبود و ایں بدعت ازال قبیل است کہ اصلش جائز است و خصوصیتِ وقت بدعت ماند
مصافحہ بعد العصر کہ در ملک توران وغیرہ رائج است و روز عرس بلئے یاد دہانیدن وقتِ دعا بلئے میت
اگر باشد مضائقہ ندارد لیکن التزام اُن نیز بدعت است از ہاں قبیل کہ گوشت"۔ (فتاویٰ غرزی ج ۱ ص ۸۹)
جناب قاضی ثناء اللہ صاحب الحنفیؒ لکھتے ہیں :

لا یجوز ما یفعلہ الجہال بقبور الاولیاء کہ جاہل لوگ حضرات اولیاء و شہداء کے مزارات کے
والشہداء من التجدد والطواف حولہا ساتھ جو معاملات کرتے ہیں وہ سب کے سب ناجائز ہیں
واتخاذ السرج والمسجد الیہا ومن یعنی ان کو سجدہ کرنا اور ان کے گرد طواف کرنا اور اُن پر
الاجتماع بعد الحول کالاعیاد ویسمونہ چرغاں کرنا اور اُن کی طرف سجدے کرنا اور ہر سال میلوں
عرساً۔ (تفسیر منظرہ ج ۲ ص ۶۵) کی طرح اُن پر جمع ہونا جس کا نام عرس ہے۔

اور ارشاد الطاہرین ص ۲۱ میں لکھتے ہیں :

"قبور اولیاء بلند کردن و گنبد بر آں ساختن و عرس و امثال اُن و چراغاں کردن ہمہ بدعت است
بعض ازال ہرام است و بعض مکرمہ پیغمبر خدا بر شمع افروزان نزد قبر و سجدہ کنندگان را لعنت گفتہ"

اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ :

مقرر ساختن روزِ عرس جائز نیست (مسائل الیقین ص ۳۸) عرس کا دی مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے اور لوگ جمع ہو کر قرآن خوانی، کلمہ طیبہ، درود پاک وغیرہ پڑھتے ہیں، ہیئت کی سہولیات جمع ہو جاتی ہیں (جوار الحق ص ۲)۔ تو یہ صرف سرے سے قابل انتفاع ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ایشیاء علی متقی الحنفیؒ لکھتے ہیں :

الاجتماع لقراءة القرآن علی المیت کہ تخصیص کے ساتھ قبرستان میں یا مسجد میں یا گھر بالتخصیص فی المقبرة او المسجد میں میت کے لئے قرأت قرآن کے لئے اجتماع کرنا او البیت بدعة مذمومة (رسالہ رد بدعات) بدعت مذمومہ ہے۔

جب یہ اجتماع ہی بدعت مذمومہ ہے تو لوگوں کے قرآن خوانی کے لئے جمع ہونے کا کیا معنی؟ رہا مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا ان روایات سے استدلال کرنا، جن میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سال کے بعد شہداء کی قبروں پر السلام علیکم الخ کے الفاظ سے دُعا کیا کرتے تھے اور اسی طرح آپ کے بعد حضرات خلفاء راشدین بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے، تو ان سے ان کا استدلال غامض ہے۔ اولاً اس لیے کہ یہ روایتیں کتب حدیث کے اس طبقہ کی ہیں جن میں بجز باند اور صحاح احادیث کے جن پر انت کا تعامل ہے اکثر احادیث کو محدثین ہرگز قبول نہیں کرتے۔ نہ حقیقہ میں اور نہ عمل میں۔ (دیکھئے ہاناغہ ص ۱۰۷) وثانیاً ان روایتوں میں اجتماع کا کہیں ذکر نہیں اور نہ قرآن خوانی اور مجلس وعظ منعقد کرنے کا کہیں ذکر ہے۔ الغرض کوئی صحیح نقلی یا عقلی دلیل عرس کے جواز پر ہرگز دلالت نہیں کرتی۔

مفتی احمد یار خان صاحبؒ لکھتے ہیں : فتاویٰ رشیدیہ جلد اولیٰ کتب الخطر والاباحۃ ص ۱۸ میں ہے۔ زیارتِ بندگان کے لئے سفر کے جانا علماء اہل سنت میں مختلف ہے۔ بعض درست کہتے ہیں اور بعض ناجائز، دونوں اہل سنت کے علماء ہیں مسئلہ مختلف ہے اس میں تکرار درست نہیں۔ اور فیصلہ بھی ہم مقلدوں سے محال ہے۔ رشید احمد عفی عنہ۔ اب کسی دیوبندی کو حق نہیں کہ سفر عرس سے کسی کو منع

کرے، کیونکہ مولوی رشید احمد صاحب تکرار سے منع فرماتے ہیں اور اس کا فیصلہ نہیں فرما سکتے (جاء الحج ۳۱۵)
حضرت مولانا گنگوہی کی اس عبارت سے سفر عرس کے جواز پر استدلال کرنا مفتی احمد یار خان
صاحب کی محض خوش فہمی ہے۔ مولانا گنگوہی نے خود یہ مسئلہ یوں حل کیا ہے۔

الجواب؛ قبور بزرگان کی زیارت کو سفر کر کے جانا مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء درست لکھتے
ہیں اور بعض منع کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف ہے، اس میں نزاع تکرار نہیں چاہیے مگر ہاں عرس کے دن
زیارت کو جانا حرام ہے فقط۔ (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم ص ۲۹)

اب فرمائیے کہ کسی دیوبندی کو سفر عرس سے منع کرنے کا حق ہے یا نہیں؟

اور پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور قاضی ثناء اللہ صاحب کی عبارتیں نقل کی جا چکی
ہیں کہ زیارت قبور کے لئے دل مقرر کرنا اور عرس کرنا بدعت ہے اور قاضی صاحب نے بعض اٹاں حرام
و بعض مکروہ لکھا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دیگر عبارتیں حضرت مولانا گنگوہی کا آخذ ہیں۔ مولوی احمد رضا
خان صاحب بریلوی کے پیرانی پر حضرت شاہ حمزہ صاحب مارہروی (المتوفی ۱۱۶۵ھ) نے یہ وصیت کی
مئی کہ فاتحہ برسی بالکل ذکریں کہ حکم اسی طرح سے ہے (انوار العارفین ص ۴۶۹)۔ لیجئے اقبال اس منع میں
بریلویوں کا پیر بھی شریک ہو گیا۔

ذکر بالجہر

اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک عمدہ ترین عبادت ہے اور دُعا کرنا بھی ایک اعلیٰ ترین نیکی اور قربت ہے۔ مگر
اسی طریقہ سے جس سے شریعتِ حق نے راہنمائی کی ہے۔ جس موقع پر جہر کے ساتھ ذکر کرنے کا حکم ہے مثلاً
عرفہ کی فجر سے لے کر آخرِ ایام تشریق تک، اور حج کے دنوں میں تطبیہ وغیرہ تو دہاں جہر کرنا سنت ہے۔
اور جہاں جہر کا حکم نہیں دیا وہاں آہستہ ذکر کرنا بہتر ہوگا۔ اور اسی صورت میں شریعت کی مُراد پوری
ہوگی۔ اور یہی حکم ہے دعا۔ اگرچہ حضراتِ صاحبین (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) نے اور ان کے علاوہ
بعض مقامات میں امام ابن حزمؒ اور اکثر صوفیاء کرامؒ نے اکثر مقامات پر جہر سے ذکر کرنے کو صرف پسند

کیا ہے لیکن نہ کرنے والوں کو نہ تو ملامت کی اور نہ وہابی کہا۔ مگر دلائل پر نگاہ ڈالنے سے یہی بات صریح معلوم ہوتی ہے کہ ذکر اور دعا آہستہ طریقہ سے بہتر ہے اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمدؒ کا مسلک ہے۔ جب حضرت آئمہ اربعہ کا ایک مسئلہ پر اتفاق ہو جائے تو یہی لامید رکھنی چاہیے کہ حق ان کے ساتھ ہے اور پھر آج اگر صرف ذکر بالجہر کو پسند ہی کیا جاتا اور دوسرے پہلو کے بارے میں سکوت اختیار کیا جاتا، تب بھی ایک بات ہوتی مگر غضب تو یہ ہے کہ آج ذکر بالجہر نہ کرنے والے کو وہابی وغیرہ کہہ کر اُسے ملامت کی جاتی اور محل طعن بنایا جاتا ہے، اور آج مسلمان اور اہل سنت ہونے کی یہ علامت قرار دی جا رہی ہے، کہ اگر ذکر بالجہر کرتا ہو تو سُستی ورنہ وہابی۔ اس لئے اس مسئلہ پر غور کی ضرورت ہے۔ مختصر طریق پر دلائل عرض ہیں۔ غور فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

وَ اذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرَّعًا وَ خَفِيَّةً وَ
دُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (الایہ مطہ، اعراف ۷)

اور ڈرتے ہوئے اور جہر سے کم آواز میں۔

اور فرمایا کہ :

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرَّعًا وَ خَفِيَّةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ
الْمُعْتَدِينَ ﴿٧﴾ (پہ۔ اعراف، رکوع ۷)

پیارو اپنے رب کو عاجزی کرتے ہوئے اور چپکے، بیشک وہ محبت نہیں کرتا حد سے بڑھے والوں کے ساتھ۔

اس آیت کریمہ میں فکر اور دعا کرنے کے لئے دو قیدیں لگائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ذکر اور دعا نہایت اخلاص، عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہو، اور دوسری یہ کہ آہستہ اور چپکے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تجاؤز کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرامؓ نے ایک موقع پر بلند آواز سے ذکر کیا تو آپ نے ان کو منع کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ :

سے حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں والاختار ان الامام والمأموم يخفيان الذكرا لا ان احتيج الى التعليم
(فتح الباری ج ۲ ص ۱۷۱) کہ مختار بات صرف یہی ہے کہ امام اور متمدی دونوں ذکر آہستہ کریں۔ ہاں مگر جب تعلیم کی ضرورت محسوس ہو تو آنگ بات ہے۔

ایہا الناس اذبحوا علی انفسکم انکم لیس تدعون
اے لوگو! اپنی جان پر زخمی کرو، تم اس ذات کو نہیں پکار
اصم ولا غائباً وانکم تدعون سیمعاً قریباً و
سبے جو بہری اور غائب ہو۔ تم تو سمیع اور قریب ذات
ہو معکم۔ (بخاری ج ۱ ص ۵۶ و مسلم ج ۱ ص ۳۷۳ واللفظ)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے روکتے ہوئے آہستہ ذکر کرنے کو
پسند کیا ہے۔ چنانچہ امام نووی کہتے ہیں :

ففیہ الذنب الی خفض الصوت بالذکر اذا
کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آہستہ ذکر
لہ تدع حاجة الی رفعہ۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۷۳)
کرنا بہتر ہے جبکہ کوئی داعیہ رفع صوت کا پیش نہ آئے۔
حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ امام ابن حزم ظاہری (المتوفی ۵۴۰ھ) وغیرہ نے نمازوں کے بعد بلند آواز
سے ذکر کرنے کو مستحب کہا ہے لیکن :

وقال ابن بطال المذاہب الاربعہ علی
محدث ابن بطال فرماتے ہیں کہ چاروں مذاہب اس
عدم استحبابہ (البایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۰۲)
پر متفق ہیں کہ جہر سے ذکر کرنا مستحب نہیں ہے۔
مشکوٰۃ فی ما مش بخاری ج ۱ ص ۳۷۳

امام ابن حزم وغیرہ کا استدلال اس روایت سے ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس
یہ فرماتے ہیں :

ان رفع الصوت بالذکر حین ینصرف
کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں
الناس من المکتوبة مکان علی عهد
نمائندہ فارغ ہونے کے بعد لوگ بلند آواز سے ذکر
النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مسلم ج ۱ ص ۳۷۳)
کرتے تھے۔

حضرت امام نووی اس حدیث کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ :

ونقل ابن بطال واخرون ان اصحاب
امام ابن بطال وغیرہ طائفتیہ بات نقل کی ہے کہ مائتہ
المذاہب المتبوعۃ وغیرہ متفقون علی
مذاہب جن کی (اکثر) لوگ اتباع کرتے ہیں (یعنی ائمہ اربعہ)
عدم استحباب رفع الصوت بالذکر والکثیر
اور اسی طرح دیگر ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ بلند آواز سے

وحمل الشافعی هذا الحدیث علی انه
جسروقتا یسیرا حتی یعلمهم صفة الذکر
لا اقمم جسر وادائم۔
ذکر کرنا اور تجسیم کرنا مستحب نہیں ہے اور حدیث ابی جابر
کی اس روایت کا مطلب امام شافعی نے یہ بیان کیا ہے
کہ کچھ عورت تک لوگوں کو تسلیم دینے کی غرض سے ذکر بالجبر

(شرح مسلم ج ۱ ص ۲۱۷)
ہوتا رہا، نہ یہ کہ انہوں نے اس پر دوام کیا۔

اور یہی بات قرین قیاس و انصاف ہے۔ ورنہ ضرور ذکر بالجبر پر حضرات صحابہ کرام کا عمل ہوتا اور حضرت
ابن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی ہرگز ذکر بالجبر اور بلند آواز سے درود و شریف پڑھنے والوں کو یہ فرماتے ہوتے
مسجد سے نکال دیتے کہ تم نے صحابہ کی موجودگی میں تاریک بدعت لٹکادی ہے؛ جس طرح جہر سے برائے
تعلیم بسم اللہ پڑھنا آپ سے ثابت ہے لیکن اس پر دوام کرنا بدعت ہے جیسا کہ حضرت ابن منفل سے نقل
ہو چکا ہے، اسی طرح ذکر بالجبر کا مسئلہ ہے۔ علامہ حلبی حنفی لکھتے ہیں کہ :

ولابی حنیفة ان رفع الصوت بالذکر
بدعة مخالفة للإمامی، قوله تعالى
أَدْعُوا زُبَكْرَةَ الْاٰیَةِ (کبیری ص ۱۵۵)
حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ بلند آواز کے ساتھ
ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے
خلاف ہے کہ تم اپنے رب کو عاجزی سے اور ہچکچے سے پکارو

اس عبارت سے بصرحت یہ معلوم ہوا کہ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنا امام اعظم صاحب کے نزدیک
اللہ تعالیٰ کے مذکور ارشاد کے مخالف بھی ہے اور بدعت بھی ہے۔ فریق مخالف کی اتم ظریفی ملاحظہ ہو کہ
وہ ذکر بالجبر نہ کرنے والوں کو وہابی کہتا ہے اور ذکر بالجبر کو اہل سنت کی علامت قرار دیتا ہے
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔

حضرت ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ :

وقد نص بعض علمائنا بان رفع الصوت في
المسجد ولو بالذکر حرام (مرقات علی الحکمة ص ۱۸۸)
ہمارے بعض علماء نے صریحت سے یہ حکم بیان کیا ہے کہ مسجد
میں آواز بلند کرنا اگرچہ ذکر کے ساتھ ہو، حرام ہے۔
آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ حضرت امام اعظم ذکر بالجبر کو بدعت فرماتے ہیں اور حضرت ملا علی قاری اس
کا حرام ہونا نقل کرتے ہیں مگر مفتی احمد یار خان صاحب کہتے ہیں کہ ”مخالفین اس کو حرام کہتے ہیں، اللہ

طرح طرح کے حیلوں سے اس کو روکنا چاہتے ہیں۔ ایک حیلہ یہ ہے کہ ذکر بالجہر بدعت ہے، اصولِ حنفیہ کے خلاف ہے الخ (جاء الحق ص ۳۱۹)۔ انصاف سے فرمائیں کہ یہ حرام اور بدعت کس نے کہا ہے؟ کیا امامِ اعظمؒ اور ملا علی قاریؒ بھی آپ کے مخالفین کی فہرست میں شامل ہیں؟ اور کیا وہ بھی طرح طرح کے حیلوں سے اس کو منع کرنے والوں میں ہیں؟ خوب ہوش میں آکر جواب دینا، بیٹنوا توجروا۔
امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

اما الدعاء فيسره بلا خلاف (شرح سلم ص ۳۱۱) اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ دعا آہستہ کنی چاہیے۔
امام سراج الدین الحنفیؒ اور ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

يُستحب في الدعاء الانخفاض ورفع الصوت بالدعاء کہ مستحب یہ ہے کہ دعا آہستہ کی جائے اور بلند آواز سے بدعتہ (مقاویٰ سراجیہ ص ۱۷۷) و موضوعات کبریٰ ص ۱۷۷۔ دعا کرنا بدعت ہے۔

یہ تمام عبارات اپنے مفہوم میں بالکل نص صریح اور واضح ہیں اور یہی پہلو بہتر اور واضح شریعت کے قریب تر ہے۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا بحوالہ شامی یہ نقل کرنا کہ ”متقدمین اور متاخرین نے اس پر اتفاق کیا کہ مسجدوں میں جماعتوں کا بلند آواز سے ذکر کرنا مستحب ہے، مگر یہ کہ اُن کے جہر سے کسی سونے والے یا نمازی یا قاری کو پریشان نہ ہو۔“ (جاء الحق ص ۳۲۱) تو یہ ہرگز قابلِ التفات نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب قرآنِ کریم اور حدیث شریف میں آہستہ ذکر کرنے کا حکم ہے تو اس کے خلاف کسی کا عمل کس طرح حجت ہو سکتا ہے؟ وثانیاً حضراتِ ائمہ اربعہؒ جہر سے ذکر کرنے کو غیر مستحب کہتے ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ اس کو بدعت کہتے ہیں۔ نیز تصریح کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مخالف ہے۔ جب حضراتِ ائمہ اربعہؒ کا ذکر بالجہر کے خلاف اتفاق ہے تو ذکر بالجہر کے جواز پر اتفاق کیسے ہوا؟ اور کیا حضراتِ ائمہ اربعہؒ متقدمین میں نہ تھے؟ وثالثاً علماء متاخرین بھی ذکر بالجہر کے مستحب ہونے پر ہرگز متفق نہیں ہیں۔ ہر مسلک کے علماء نے اس کی تردید کی ہے۔ حتیٰ کہ حضراتِ صوفیاء کرام بھی اس پر متفق نہیں ہیں دیکھئے مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ۔ اسی طرح دیگر علماء اور فقہاء و محدثین کی کتابیں بخور ملاحظہ کیجئے۔ محض اتفاق کے خوش کن لفظ سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ باقی مفتی احمد یار خان

صاحب کار سالہ دلائل الاذکار ملکہ معتنفہ شیخ محمد صاحب تھانوی کے حوالہ سے یہ نقل کرنا کہ - "حضور علیہ السلام نماز کے بعد صحابہ کرام کے ساتھ تسبیح و تہلیل بلند آواز سے پڑھتے تھے" (جاء الحق منک ۳۳) تو یہ دلیل بھی چنداں دینی نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ جب تک اصول حدیث کے مطابق اس کا صحیح ہونا ثابت نہ ہو جائے اس سے استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ وثانیاً اگر یہ حدیث صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب بھی وہی ہوگا جو حضرت ابن عباس کی حدیث کا حضرت امام شافعی نے پیش کیا ہے کہ کسی وقت تعلیم کے لئے آپ نے ایسا کیا تھا، بعد کو چھوڑ دیا، دوام اس پر برگز نہ ہوتا تھا۔ اگر دوام ہوتا تو حضرات ائمہ اربعہ کبھی ذکر بالجہر کو غیر مستحب نہ کہتے۔ یہ ایک ایسی تین حقیقت ہے جس کا ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ذکر بالجہر اور آہستہ ذکر کی بے مالا مزید علیہ بحث راقم کی مستقل کتاب حکم الذکر بالجہر اور انظار الذکر میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں گنجائش نہیں ہے کہ اس کے مبسوط حوالے عرض کیے جاسکیں۔ واللہ الموفق۔

مزاراتِ حضراتِ اولیاءِ کرام کو پختہ کرنا اور ان پر گنبد بنانا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ حتی المقدور قبور کی توہین نہ کی جائے یعنی قبور پر بیٹھنا، ان کو روندنا، وہاں پیشاب و پاخانہ کئے جانے اور قبور کی شکل و صورت کو بگاڑنا وغیرہ سب امور شریعت میں ممنوع ہیں۔ قبر مسلمان کی عالم برزخ میں ایک رہائش گاہ ہے، اس کا احترام کرنا ضروری ہے اور اس کی توہین برگز درست نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ قبروں کو پختہ بنانا یا ان پر گنبد وغیرہ بنانا بھی کیا اس احترام میں داخل ہے؟ تو اس کا جواب ایک مسلمان ائمہ شیعہ کے لئے بالکل آسان ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ قبور پر گنبد وغیرہ بنانے میں احترام نہیں اور نہ بنانے میں برگز توہین نہیں ہے کیونکہ اگر قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر گنبد وغیرہ تعمیر کرنے میں احترام ہوتا اور اس میں کوئی بھی شرعی فائدہ اور دینی مصلحت ہوتی تو سرورِ دو جہاں رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم برگز اس سے منع نہ کرتے۔ اگر آج مولوی احمد رضا خان اور مولوی عبدالستیع صاحب اور مولوی محمد عمر اور

مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کو اس میں دینی مصلحتیں اور شرعی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ یہ سب کچھ جائز کہتے اور اس کو کارِ ثواب اور کم از کم مستحب سمجھتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کیوں اس سے منع کیا اور ان دینی فوائد اور مصالح سے کیوں اُمت کو محروم رکھا؟ غرضیکہ یہ تمام تر فوائد اور مصالح خود تراشیدہ اور ایجاد بندہ ہونے کی وجہ سے مردود اور باطل ہیں اور ان کا مقام صرف یہ ہے کہ عذر اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ :

قال نبي رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يجصص القبور وان يبنى عليها وان يقعد عليه - (مسلم ۳۱۲ مشکوٰۃ ۱۲۸۸ و ترمذی ۱۲۵)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر بیٹھنے سے منع کیا ہے۔

جب سرور دو جہاں امام الانبیاء سید الرسل اور خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے تو کون ماں کا لالہ ہے جو آپ کی منع کی ہوئی چیز میں کوئی مصلحت اور فائدہ ثابت کر سکے۔ مُنہ کے ساتھ بات بنانے اور قلمِ خواہش کے ساتھ کچھ لکھ دینے کا نام ثبوت نہیں ہوتا۔ حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

والبناء عليه فان كان في ملك الباني فمكروه وان كان في مقبرة مسبله فحرام نص عليه الشافعي والا صحاب قال الشافعي في الامم و رأيت الاثمة بمسكة يأمرؤن بهدم ما يبنى ويؤيد الهدم قوله ولا قبورا مشرقا الا سويته -

قبر پر عمارت بنانا اگر (وہ جگہ) عمارت بنانے والے کی ملک میں ہے تو مکروہ ہے اور اگر عام مقبرہ میں ہے تو حرام ہے۔ حضرت امام شافعیؒ اور دیگر اصحابِ ملت سے اس کو بیان کیا ہے اور امام شافعیؒ نے کتاب الامم میں تحریر فرمایا ہے کہ میں نے مکہ مکرمہ میں اماموں کو قبر پر عمارت کو ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا ہے، اور ولا قبورا مشرقا والی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۲)

مفتی احمد یار خان صاحب سے پوچھے کہ حضرت امام شافعیؒ نے جو محلہ مکہ میں حضرات ائمہ کے قبروں پر عبادت ڈھانے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا تھا، یہ کون امام تھے؟ اور کیا یہ نجد میں اور مدینہ کے امام تھے جو محلہ مکہ جیسی پاک سرزمین پر اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں اور حضرات اولیاء کرام کی قبروں کی حضرت امام شافعیؒ کے زمانہ میں یوں توہین کرتے تھے؟ مفتی احمد یار خان صاحب تو یوں لب کشائی کرتے ہیں: نوٹ ضروری: اس حدیث کو اکڑنا کہ نجدی وہابیوں نے صحابہ کرام اور اہل بیت کے مزارات کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیا۔ (بلفظ جارا الحق ملک ۲)

حضرت امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) فرماتے ہیں کہ:

ولا نرى ان يزاد على ما خرج منه و
نكروا ان يخصص او يطعن الى ان قال
ان التبي صلى الله عليه وسلم نهى
عن تدبير القبور وتخصيصها قال
محمد به فأنخذ وهو قول ابى حنيفة
(كتاب الآثار امام محمد ۹۱ ص ۹۱)
ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلی ہے اس
زیادہ اس پر ڈالی جائے اور ہم مکروہ سمجھتے ہیں کہ قبر
پختہ بنائی جائے یا اس پر پانی کی جائے (آگے فرمایا)
اس لئے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
قبر کو مربع بنانے سے اور اس کو پختہ بنانے سے منع
کیا ہے یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی حضرت امام ابوحنیفہؒ
کا قول ہے۔

حضرات کیا کسی مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح
اور صریح حدیث کو رد کر دے؟ اور کیا کسی مفتی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا قول اور
ان کا فتویٰ جس کی بنیاد صحیح حدیث پر ہو ترک کر دے اور پھر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے مفتی کا مفتی بنا
رہے۔ یاد رہے کہ یہ قول حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ان کے بلا واسطہ شاگرد حضرت امام محمدؒ نقل کرتے ہیں اور اپنا
مذہب بھی یہی بتاتے ہیں۔ مفتی احمد یار خان صاحب کی خیانت یا جہالت ملاحظہ کیجئے، کہ وہ امام
شعرائیؒ (المتوفی ۳۱۷ھ) کے حالات سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ قبروں پر گچ کرنا
اور گنبد بنانا اور قبروں کو پختہ کرنا ناجائز ہے، اور پھر آگے اس قلعہ کو فتح کرتے ہوئے مفتی احمد یار خان

صاحب یوں ارقام فرماتے ہیں: اب تو رجسٹری ہو گئی کہ خود امام مذہب امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا فرمان مل گیا کہ قبر پر قبۃ وغیرہ بنانا جائز ہے (بلفظہ جابر الحق ملکی)۔ سبحان اللہ تعالیٰ! دسویں صدی کے ایک صوفی کی بے سند نقل اور بے سرو پا روایت سے (جو نقل مذاہب میں سینکڑوں غلطیاں کہ جاتے ہیں) حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں قبوں کے جواز پر رجسٹری ہو گئی اور حضرت امام محمدؒ کی نقل سے جو امام اسی کے بلا واسطہ شاگرد اور نقل مذاہب میں بڑے محتاط اور محترم ہیں ان کے قول اور فتویٰ سے قبوں کے عدم جواز پر رجسٹری نہ ہوئی؟ ع

اس کار از تو آید و مرداں چنین کنند

صریح حدیث اور حضرت امام صاحبؒ کے قول کے بعد ضرورت تو نہیں، مگر تکمیل فائدہ کیلئے حضرات فقہاء احنافؒ کی چند عبارتیں اور ملاحظہ کر لیجئے تاکہ اصلی حقیقت بالکل بے نقاب ہو جائے۔ علامہ علی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ویکوة تجصيص القبور و تطيینة و به قالت الاثمة الثلاثة الى ان قال وعنى ابی حنیفة انه یكوه ان یبنى علیه بناء من بیت او قبّة او نحو ذلك لما مر من الحديث آنفا۔ (کبریٰ ص ۵۹۹) کی دلیل ہے۔

امام سراج الدین اودمی الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۵۸۵ھ) لکھتے ہیں کہ:

ویکوة البناء علی القبور (متاویٰ سراجیہ ص ۲۴) قبور پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔ امام قاضی خان الحنفیؒ (المتوفی ۸۱۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا یجوز تجصيص القبور لما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه فی عن التجصيص والتفضيض وعن البناء فوق القبور (قاضی خان ج ۱ ص ۹۱) قبور کو پختہ نہ بنایا جائے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبر کے پختہ بنانے اور چاندی کے پانی سے جڑاؤ کرنے اور قبر پر عمارت بنانے سے منع کیا ہے۔

حافظ ابن ہمام الحنفی (المتوفی ۸۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ :

ان التبی صلی اللہ علیہ وسلم فی عن تبریع القبور وتجصیصھا (فتح القدیر ج ۲ ص ۱۶۷)
انحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبروں کے مربع (چوڑے) بنانے اور ان کو پختہ بنانے سے منع کیا ہے۔
فتاویٰ عالمگیری میں ہے :

ویسمن القبر قدر الشبر ولا یریع ولا یجصیص
ویکوه ان یدنی علی القبر۔

(عالمگیری مصری ج ۱ ص ۱۶۷)
علامہ ابن عابدین الحنفی لکھتے ہیں کہ :

اما البناء فلم ار من اختار جوازا۔
مجموعہ معلوم نہیں کہ کسی نے عمارت بنانے کے جواز کو پسند کیا ہو۔ (شامی ج ۱ ص ۱۶۷)

نوٹ : مطلق مکروہ حضرت امام اعظم اور دیگر سلف صالحین کی اصطلاح میں مکروہ تحریمی پر اطلاق ہوتا ہے چنانچہ علامہ ابوالکارم الحنفی (المتوفی ۸۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ :
المکروه التحريم عند الامام (ابوالکارم ج ۲ ص ۱۵۹) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مکروہ سے مراد حرام ہے۔
اور نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں :

حافظ ابن القیم در اعلام الموقعین تصریح کرده کہ حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں تصریح کی ہے
است بائکہ استعمال کراہت در محاورہ سلف و کہ حضرات سلف کے محاورہ میں کراہت کا اطلاق و
تحریم بود۔ (الدلیل الطالب ص ۱۵۰) استعمال تحریم پر ہوتا تھا۔

حضرت ملا علی نقاریؒ حدیث من ابدع بدعة ضلالة کی شرح میں ارقام فرماتے ہیں کہ :

وہی ما انکوه ائمة المسلمين كالبناء
علی القبور وتجصیصھا۔ (مرقات ج ۱ ص ۲۳۶)

لہ تصریح حاشیہ تلوک ص ۲ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ دونوں سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ مکروہ سے کراہت تحریم مراد ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ مسلمین نے قبر پر عمارت بنانے اور ان کو پختہ کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے اور اس کو بدعتِ ضلالت کہتے ہوئے انکار کیا ہے۔

قاضی ثناء اللہ صاحب الخفئیؒ (المتوفی ۱۲۲۵ھ) لکھتے ہیں :

آنچه بر قبور اولیاء عمارت ہائے رفیع بنا میکنند وہ جو کچھ کہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر کیا جاتا ہے
و چراغاں روشن می کنند و ازین قبیل ہرچہ میکنند کہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں اور چراغ روشن کرتے
حرام است۔ (مالا بد منہ ۹۵) اور اس قسم کی جو چیز بھی کرتے ہیں، حرام ہے۔

ایک منصف مزاج اور حق کے متلاشی کے لئے یہ وزنی اور ٹھوس دلائل بالکل کافی ہیں البتہ معاند اور سرکش کے لئے دلائل کا انبار بھی نا کافی ہے۔ مولوی عبد الباقی صاحب اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ نے شیخ عبد الغنی نابلسیؒ، صاحب روح البیان اور امام خفئیؒ اور طحاویؒ وغیرہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مشائخ، علماء اور سادات کی قبروں پر عمارت اور گنبد بنانا جائز ہے، اور اس کو کم از کم مستحب اور ہوا المختار کہا ہے تو یہ سراسر باطل اور مردود ہے۔ اس کا مختصر اور پورا جواب صرف اتنا ہی کافی ہے کہ یہ تو یہ حضرات معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر جناب نبی معصوم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور امام مجتہد کے صریح ارشاد کے مقابلہ میں ان کی بات کون سنتا ہے؟ رہا مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا یہ ارشاد کہ حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت محمد بن الحنفیہؓ سے قبروں پر نیسے لگانے کا ثبوت ہے اور اس پر روایتیں نقل کی ہیں تو اولاً اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بے اصل اور بے سند روایتیں ہیں ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔ وثانیاً اگر یہ سند صحیح بھی ہوں تب بھی جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صریح اور صریح حدیث کے مقابلہ میں ان کی کوئی پوزیشن ہی نہیں ہے۔

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ نقل کیا ہے کہ امام زین العابدینؓ کی بیوی نے اپنے خاوند کی قبر پر خیمہ لگایا تھا، اس میں بھی مفتی صاحب نے خیانت کی ہے۔ اگر پوری روایت نقل کر دیتے تو خود بخود معاملہ حل ہو جاتا۔ اس روایت میں اس کی تصریح ہے کہ مکالمہ کے طور پر صدائے غیبی (بالغی) نے اس فعل کی ناپسندیدگی کا صاف اعلان کر دیا تھا (مشکوٰۃ ج ۱۵۲)۔ باقی حضرت عثمانؓ بن مظعون

کثیراً — بل یرفع نحو شبور۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۱۱) صرف ایک باشت کے اندازہ کی اونچی جو۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اونچی قبروں کو گرانے کا حکم فرمایا تھا اور ابوالسادات (حضرت علی) کو اس کام کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ پھر حضرت علیؓ نے اپنی خلافت میں یہ کام اپنے ایک فوجی افسر سے لیا جس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذموم عمارتیں شریعت کی روح کے سراسر خلاف ہیں، اور ان کے دھجھ کو شریعت کو اوارا نہیں کرتی اور یہ ممانعت شرعی حکم کے تحت تھی، نہ جیسا کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے لکھا ہے کہ یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا (جابر الحی ص ۲۱)۔ اگر بالفرض یہ حکم زہد اور تقویٰ کے تحت تھا تو متین یہ زہد اور تقویٰ کیوں راس نہیں آتا؟ علامہ ابن حجر مکی شافعی (المتوفی ۸۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ :-

تجب المبادرة الى هدمها وهدم القباب ان اونچی قبروں کو اور ان قبروں پر جو تھے اور گنبد بنائے
التي عليها۔ (کتاب الزواجر ص ۱۲۳) گئے ہیں ان کو گرا دینا واجب ہے۔

اور حضرت ملا علی قاری نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ:

ويجب الهدم وان كان مسجداً (مرقاة ص ۲۲ ص ۲۱) گرا نا واجب ہے، اگرچہ مسجد ہی کیوں نہ ہو۔
یعنی اگرچہ کسی چالاک اور ہوشیار نے قبروں کے پاس مسجد کا نام نہ لکھا تھے اور گنبد تعمیر کئے ہوں تو
ان کو بھی گرا نا واجب ہے کیونکہ مسجد ضرار بھی آخر مسجد کے نام سے تعمیر کی گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھنے والے اس
کے حشر سے آگاہ ہیں۔ علامہ سیّد محمود آلوسی الحنفی (المتوفی ۱۲۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

ثم اجماعا فان اعظم المحرمات واسباب الشرك اس پرجامع ہے کہ حرام ترین اور اسباب شرک کی چیزوں
القبوة عندها واتخاذها مساجداً وبنائها میں سے قبروں کے پاس نماز پڑھنا ہے یا ان پر مسجد بنانا
عليه وتجب المبادرة الى هدمها وهدم الذباب التي على القبور اذ هي اضر من
مسجد الضرر لا فيها اُسست على معصية رسول الله صلى الله عليه وسلم وتجب
ازالة كل قنديل او سراج على قبر ولا يجوز
اس پرجامع ہے کہ حرام ترین اور اسباب شرک کی چیزوں میں سے قبروں کے پاس نماز پڑھنا ہے یا ان پر مسجد بنانا
یہ عمارتیں تعمیر کرنا ہے، واجب ہے کہ اونچی قبروں کو اور جو ان پر تھے ہیں ان کو گرا دیا جائے کیونکہ یہ مسجد ضرار سے
بھی زیادہ نقصان دہ ہیں یا اس وجہ کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ اپنے
تو اونچی قبروں کو ڈھانے کا حکم دیا ہے اور واجب ہے کہ

وقفہ و نذرۃ۔ (روح المعانی ج ۱۵ ص ۲۱۱) قبروں پر جو بھی قبیل یا چراغ ہو، اس کو دگر دیا جائے اور اس کا وقف کرنا اور تدبیر بھی ناجائز ہے۔

حافظ ابن القیم حنبلیؒ (المتوفی ۷۵۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

لا يجوز ابقائها ويجب هدمها (زاد المعاد ص ۲۸) ان کا چھوڑنا جائز نہیں ہے اور ان کا گڑا واجب ہے۔ اور اسی کے قریب الفاظ شیخ الحنابلہ حافظ ابن تیمیہؒ کے ہیں (ملاحظہ ہو تلخیص کتاب الاستغاثہ ص ۲۸)۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ کیا حنفیؒ اور کیا شافعیؒ اور کیا حنبلیؒ سب اُچھی قبروں اور اُن پر تعمیر شدہ قبور کو گرانے کا حکم دیتے اور اس کو واجب کہتے ہیں۔

نوٹ : اکثر اہل بدعت حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ کی رفیع شان میں بہت ہی گستاخی کیا کرتے ہیں مگر حضرت ملا علی القاری الحنفیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں :

كانا من اكابر اهل السنة والجماعة ومن كره حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ دونوں اہل سنت و جماعت اولیاء هذه الامة۔ (جمع الوسائل ج ۲ ص ۲۰۸ طبع مصر) کے اکابر میں اور اس اُمت کے اولیاء میں تھے۔

اور حافظ ابن القیمؒ کی تعریف کرتے کرتے امام جلال الدین سیوطیؒ المتوفی ۹۱۱ھ پھولے نہیں سلتے۔ (بغیۃ الوعاة)

قارئین کرام ! آپ نے ملاحظہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے تحت حضرت علیؑ نے اُچھی قبروں کو گرایا اور پھر گرا دینے کا حکم صادر فرمایا ہے اور حضرات علماء کرام اور خصوصاً ملا علی القاری الحنفیؒ اور سید محمود آوسی الحنفیؒ وغیرہ نے قبروں پر قبور اور گنبدوں کے گرانے کو جواب کہا ہے۔ مگر مفتی احمد یار خان صاحب کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”اگر ان کی قبریں پختہ ہی گئی ہوں تو ان کو گرانا حرام ہے۔“ (جوار الحق ص ۲۱۹ بنقطہ)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت علیؑ نے ایک حرام کام کیا اور کرایا، اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حرام کام کا حکم دیا (العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

اور کیا اسی حرام کا فتویٰ حضرات فقہاء کرام نے دیا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ المتوفی ۱۳۳۳ھ نے کیا خوب اور انصاف کی بات ارشاد فرمائی ہے :

سوال : قبور کا پختہ بنانا اور ان پر عمارات و قبۃ و روشنی و فرش فروش وغیرہ جو کچھ کہ لوگ کرتے ہیں الخ۔ الجواب : ہر گاہ کہ احادیث میں ممانعت ان امور کی وارد ہے پھر کسی کے فعل سے وہ جائز نہیں ہو سکتے۔ اور اعتبار قرآن و حدیث و اقوال مجتہدین کا ہے، نہ افعال مخالفین شرع کا۔ اگر عرب اور حریمین میں امور غیر مشروع خلاف کتاب و سنت رائج ہو گئے تو جواز ان کا نہیں ہو سکتا۔ اور جو مال ان بدعات کو کوئی منع نہ کر سکے تو یہ حجت جواز کی نہیں ہو سکتی، اس پر سکوت کی کوئی وجہ نہیں، کتاب و سنت سے روکنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم، رشید احمد عفی عنہ۔ (فتاویٰ رشیدیہ جلد اول ضل)

فریق مخالف کا اعتراض مفتی احمد یار خان صاحب نے اس حدیث کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث کہ قبروں کو مٹا دو اور گرا دو، مشرکین کی قبروں کے متعلق ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکوں کی قبروں کو اکھاڑنے کا حکم دیا، اور کہتے ہیں کہ شیخ ابن حجر مکی، فتح الباری جلد ۲ ص ۲۶۱ میں تحریر فرماتے ہیں (عربی عبارت کا ترجمہ خود مفتی صاحب کی زبانی یہ ہے) کیا جاہلیت کے مشرکین کی قبریں اکھیڑ دی جائیں (باب) فرماتے ہیں یعنی ماسوا انبیاء اور ان کے متبعین کے، کیونکہ ان کی قبریں ڈھانے میں ان کی امانت ہے (جاء الحق ضل ۲۸) دوسرے اس لئے کہ اس میں قبر کے ساتھ فوٹو کا کیوں ذکر ہے، مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ کفار کی قبریں مراد ہیں کیونکہ ان کی قبروں پر میت کا فوٹو بھی ہوتا ہے۔ تیسرے اس لئے کہ فرماتے ہیں کہ اونچی قبر کو زمین کے برابر کر دو اور مسلمان کی قبر کے لئے سنت ہے کہ زمین سے ایک ٹانہ اونچی رہے (بلفظ جبار الحق ضل ۲۸)

الجواب : یہ سب باتیں مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور علم سے بے خبری کا نتیجہ ہیں اولاً اس لئے کہ فتح الباری کا مصنف وہ ابن حجر مکی کو قرار دیتے ہیں، حالانکہ فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی کی تصنیف ہے جو ابن حجر مکی سے اقدم بھی ہیں اور علم بھی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس چودھویں صدی میں ایسے لوگ مفتی بن گئے ہیں جن کو فتح الباری جیسی کتاب کے مولف کا صحیح علم

نہیں ہے۔ حیرت ہے ایسے مفتی پر۔ وثائقاً مفتی صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ بنش قبور الگ چیز ہے جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مشرکین کی قبروں کو اٹھاڑنے کا حکم دیا تھا۔ اور مفتی صاحب کے قول کے مطابق شیخ ابن حجر مکیؒ نے فتح الباری میں اس کی شرح کی ہے۔ اور سوہ قبور اور چیز ہے۔ دونوں میں زمیں و آسمان کا فرق ہے۔ وثائقاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ فادہ ہے کہ قبر کے ساتھ فوٹو کا ذکر ہے اور مسلمان کی قبر پر فوٹو کہاں؟ سبحان اللہ تعالیٰ! اگر مفتی صاحب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فوٹو اور قبر ایک ساتھ ہوں، حالانکہ قبروں کو ڈھانے کا حکم الگ ہے اور تصویریں کو مٹانے کا حکم جدا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوں ان کو مٹانا چاہیے۔ چنانچہ نسائی شریف ج ۱ ص ۲۲۱ میں اسی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں ولا صورة فی بیت، کسی گھر میں کوئی تصویر نہ چھوڑنا۔ مفتی صاحب ہی فرمائیں کیا آج کل مسلمانوں کے گھروں میں بھی فوٹو اور تصویریں ہوتی ہیں یا نہیں؟ ورنہ اُجھاڑنا یہ بھی مفتی صاحب نے خوب کہی کہ اُوچی قبر کو زمین کے برابر کر دو۔ حالانکہ ہم علامہ مارینیؒ کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں کہ زمین کے ساتھ برابر کرنا مراد نہیں ہے بلکہ معتاد قبروں کے ساتھ برابر کرنا مراد ہے۔ و خاصاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق بھی قابلِ فادہ ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اُوچی رہے۔ نہ معلوم یہ کس حدیث کا ترجمہ ہے کہ قبر زمین سے ایک ہاتھ اُوچی ہو۔ یہ بلیونی تحقیق بھی بہت ہی نرالی ہے۔ پہلے سنن ابی داؤد علیگری کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ قبر صرف ایک شبر (بالمشت) کے قریب اُوچی ہونی چاہیے غنیۃ الطالبین ص ۲۴۸ رکن الدین ص ۲۸، فتاویٰ رضویہ ص ۲۴۸ اور مخطوطات حتمیہ ص ۳۲۸ میں بھی قبر کی اونچائی ایک بالشت لکھی ہے۔ و سادہ سادہ ایسے ہم ایک صحیح روایت میں کہتے ہیں جس سے مفتی محمد یار خاں اور اسی طرح اُن حضرات کی بخوبی توجید ہوجاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ حدیث مشرکوں کی قبروں سے تعلق ہے چنانچہ مشہور و معروف تابعی حضرت ثمامہ بن ثقی (المتوفی ۸۵ھ) روایت کرتے ہیں کہ:

قال کنا مع فضالة بن عبید بارض الترم
برودس فتویٰ صاحب لنا فامر فضالة
بقبر فوسوی ثم قال سمعت رسول
الله صلی اللہ علیہ وسلم یاہر بتسویتهما
ہم حضرت فضالہ بن عبید (المتوفی ۸۵ھ) کے ساتھ روم
کی سرزمین رودس کے مقام پر تھے کہ ہمارا ایک ساتھی فوت
ہو گیا حضرت فضالہ نے ان کی قبر کو (عام قبروں کے ساتھ)
برابر کرنے کا حکم دیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ میں نے جناب

(مسلم ج ۱، مسند ۱، نسائی ج ۱، مسند ۲، ابوداؤد ج ۲) نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منسوب ہے کہ اپنے قبوروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔

یہی روایت اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ امام بیہقی نے یوں نقل کی ہے :

عن شمامہ بن شفیق قال خرجنا غزاة زمن معاویة الى هذه الدروب وعلینا فضالة بن عبید فتوفی ابن عم لی یقال له نافع بن عبد قال فقام فضالة فی حفرة فلما دفناه قال خففوا عنه التراب فان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یا مونا بتسوية القبور۔

ثم بن شفیق کہتے ہیں کہ ہم حضرت امیر معاویہ کے عہد حکومت میں ان پہاڑی قلعوں میں جہاد کرنے کی غرض سے نکلے۔ ہم پر حضرت فضالہ بن عبید سالار مقرر تھے۔ میرا چچا زاد بھائی جس کا نام نافع بن عبد تھا وہ فوت ہو گیا۔ حضرت فضالہ ان کی قبر میں کھڑے ہوئے۔ جب ہم ان کو دفن کر چکے تو حضرت فضالہ نے فرمایا۔ قبر پر سے مٹی تھوڑی اور ہلکی کر دو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں

قبوروں کو برابر کرنے کا حکم دیا ہے۔ (سنن الکبریٰ ج ۳، مسند ۴)

یہ صحیح روایت اس بات کی روشن اور واضح دلیل ہے کہ تسویۂ قبور کا حکم مشرکوں کی قبور کے ساتھ خاص نہ تھا۔ ورنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور رفیق کے سپہ سالار ایک مسلمان کی قبر کے تسویہ کا حکم ہرگز نہ دیتے اور اس پر دلیل یہ نہ پیش کرتے کہ میں نے خود اپنے کانوں سے یہ مسئلہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرت صحابہ کرام کا دور تھا اور حضرت امیر معاویہ (المتوفی سنہ ۴۰) کی حکومت تھی۔ کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ حضرت فضالہ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں، تسویۂ قبور کا حکم تو مشرکوں کی قبور کے متعلق ہے۔

ان فرض حضرات صحابہ کرام سے بلا تکلیف یہ امر ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی یہ حکم عام تھا۔ مشرکوں کی قبور سے اس کی تخصیص کی ہرگز کوئی وجہ ان کے نزدیک نہ تھی۔

باقی عام قبوروں کو اور قبور پر عمارت کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر قیام کرنا درست نہیں ہے اس لئے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو :

فقال ناس يدفن عند المنبر وقال اخرون
يدفن بالبقيع فجاء ابو بكر بن الصديق
فقال سمعت رسول الله صلى الله عليه
وسلم يقول ما دفن نبي قط الا في مكانه
الذي توفي فيه فحفوله فيه -

(وسطا امام مالک ص ۸۷ وشمائل ترمذی ص ۲۸۵)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات حضرت عائشہ کے حجرہ میں ہوئی تھی، لہذا اس حدیث کے رو سے آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ باقی حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کو بالبقع وہاں دفن ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ اگر وہ اُس جگہ سے باہر کہیں دفن ہوتے تو ہرگز ان کی قبروں پر حضرات صحابہ کرامؓ عمارت تعمیر نہ کرتے۔ جیسے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر بزرگوں کی تعداد میں حضرات صحابہ کرامؓ تھے مگر کسی کی قبر پر نہ تو گنبد بنائے گئے اور نہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ کئی صدیوں کے بعد ترکوں نے اپنے شاہانہ ٹھاٹھ یاٹھ کے پیش نظر متعدد قبروں پر گنبد تعمیر کئے۔ مگر ان کا یہ فعل شرعاً کوئی حجت نہیں ہے۔

کیونکہ پہلے صحیح اور صریح روایت گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے جو کام آپ نے منع کیا ہو وہ کسی کے کرنے سے جائز نہیں ہو جاتا۔ الغرض یوں نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک پہلے ہو اور اس پر عمارت بعد کو تعمیر کی گئی ہو۔ بلکہ چونکہ آپ کی وفات ہی اس حجرہ میں ہوئی تھی اس لئے اس سابق حدیث کے پیش نظر آپ کو وہاں ہی دفن کیا گیا۔ پھر حسب تحقیق شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی وغیرہ ایک خاص المناک واقعہ پیش کیا جس کے تحت ۷۷۷ھ میں سلطان تورالدین شہید محمود بن زنگیؒ نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے ارد گرد نہایت گہری دیوار میں سیسہ اور راتگ گلا کر اس کو بھریا اور مضبوط دیوار قائم کی۔ (دیکھئے جذب القلوب الی دیار المحبوب ص ۸۷) اور پھر ۸۷۷ھ میں سلطان قلاؤن صالحیؒ نے یہ گنبد سبز جو اب تک موجود ہے، بنوایا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو اس کا اقرار ہے (دیکھئے جامع الغنی ص ۸۷)

نوٹ ضروری : قبروں پر قبُور اور گنبدوں کا گناہ صحیح احادیث اور اقوال حضرات فقہاء کرام سے ثابت ہے۔ مگر یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کام سلطان اسلام اور اسلامی حکومت کا ہے۔ انفرادی طور پر افراد کا یہ کام نہیں ہے۔ اس لئے عوام کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

قبروں پر چراغ روشن کرنا

قبور پر چراغ و قندیل اور موم بتی وغیرہ جلانے کی شریعت اسلامی میں کوئی اصل نہیں ہے اور شریعت حقہ اس قبیح حرکت سے نہایت ہی سخت بیزار ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ :

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زائراً القبور والمتخذین علیہا المساجد والسج (ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۱۵۵، موارد الطمان صفحہ ۲، نسائی ج ۲۲۲، طرابلسی صفحہ ۳۵۵، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۷۷)۔ لعنت کی ہے۔

اور اسی مضمون کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی مرفوعاً مروی ہے۔ (ملاحظہ ہو، موارد الطمان ج ۲ سنن الکبریٰ ج ۲ صفحہ ۷۸)۔

اور ظاہر ہے کہ جس کام پر سرورِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو، وہ کسی وقت اور کسی حیثیت سے جائز اور مستحب نہیں ہو سکتا، اور نہ اُس کے اندر کوئی فائدہ اور خوبی ہو سکتی ہے، اور نہ ضرورت اور غیر ضرورت کے مصنوعی پیوند اس میں لگ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب یا کوئی اور بدعت پسند اس میں خاندان ساز فوائد اور منافع بتانا شروع کر دے۔ یہ صرف ان کے مُنہ کی بات ہے، اور جن علماء سے انہوں نے جواز اور استحباب نقل کیا ہے وہ نہ تو معصوم ہیں اور نہ مجتہد۔ پھر نہ معلوم جس کام پر آقائے نامدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو

وہ ان کے کہنے سے کیسے مستحب اور جائز و کارِ ثواب ہو سکتے ہیں؟ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ولی اور غیر ولی، عالم اور جاہل کی قبر کا کوئی فرق نہیں کیا۔ جس سے صاف طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہر ایک قبر پر چراغ روشن کرنا باعثِ لعنت ہے۔ پھر یہ کہنا کہ علی کے معنی اُوپر کے ہیں، لہذا قبر کے اُوپر چراغ جلانا درست نہیں اور اگر اُس پاس ہو تو جائز ہے، یہ بھی نرمی جہالت ہے۔ علی کے معنی میں یہ دونوں مفہوم داخل ہیں۔ اَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَبْرِهِ كَمَا مَعْنَى كَيْفَا مَفْتًی احمدیہ خان صاحب یہ کہیں گے کہ حضرت عَزَّیْرُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اُس بستی میں لوگوں کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھتے ہوئے گزرے تھے؟ حدیث معراج میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

فَمَوْرَتْ عَلٰی هَوَسًی - (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۵ ص ۵۲۸) میرا گزر حضرت موسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر ہوا۔

الغرض نطق علی ارد گرد اور اُس پاس کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِیْ - اور آپ نہ کھڑے ہوں کسی منافق کی قبر پر۔

کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ منافق کی قبر کے اُوپر چڑھ کر تو نہ کھڑے ہوں، مگر دعا کے لئے ارد گرد اور اُس پاس کھڑے ہو جائیں۔ ایک روایت یوں آتی ہے کہ ایک بی بی کی ایامِ زوجگی میں وفات ہو گئی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے :

فَقَامَ عَلَیْہَا لِلصَّلٰوۃِ (ابوداؤد ج ۲ ص ۲۸۱) اس پر کھڑے ہو کر جنازہ کی نماز پڑھائی۔

مفتی صاحب اس کا کیا مطلب لیتے ہیں، یہ ان کی صواب دید پر موقوف ہے۔ غرضیکہ اگر چراغ قبر کے اُوپر جلایا جائے، تب بھی ناجائز ہے، اور اگر اُس پاس روشن کیا جائے تب بھی باعثِ لعنت ہے۔ بلکہ دوسری صورت لوگوں میں زیادہ رائج تھی اور اب بھی ہے۔ کیونکہ یہ کسی نے گوارا نہیں کیا کہ کسی بزرگ کی قبر کے تعویذ پر چراغ جلایا جائے۔ لوگ تو بزرگ خود حضرات اولیاءِ کرام کی عزت کے لئے چراغاں کرتے ہیں، اور یہ صورت ان کے خیال میں سراسر توہین کی ہے، پھر بھلا وہ اس کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟ اس لئے قرین قیاس یہی بات ہے کہ قبر کے ارد گرد چراغ جلانا زیادہ مذموم ہے۔

رباضفیٰ محاسبہ کا یہ ارشاد کہ اس صورت میں تو حقیقت اور مجاز کا اجتماع لازم ہوگا اور یہ منع ہے۔
(جاء الحق ص ۱۹) تو یہ ان کی بے خبری کا نتیجہ ہے کیونکہ اس صورت میں جمع بین الحقیقتہ والمجاز بہلین ہے
جو ناجائز ہے، بلکہ یہ عموم مجاز ہے جو جائز ہے۔ اصول فقہ کی کتابیں ملاحظہ کیجئے۔

جلیل القدر صحابی حضرت عمرو بن العاص (المتوفی ۳۷ھ) فاتح مصر نے یہ وصیت کی تھی کہ:
فاذا انا مت فلا تصحبنی فائحة ولا جب میری وفات ہو جائے تو نہ میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے
نار۔ (مسلم ج ۱ ص ۱۷۷) والی عورت جائے اور نہ میرے ساتھ آگ ہو۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ (المتوفی ۳۷ھ) نے بھی یہ وصیت کی تھی کہ:
ولا تتبعونی بنار (موطا امام مالک ص ۱۷۷) میرے ساتھ آگ نہ لے جانا۔

حضرت امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ:

واما اتباع المیت بالنار فمکروہ للحدیث واما اتباع المیت بالنار فمکروہ للحدیث
ثم قیل سبب الکراهة کونه من شعاع الجاهلیة وقال ابن حبیب المالکی کراهة
میت کے ساتھ آگ لے جانا حدیث کی رو سے مکروہ ہے۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کراہت شعاع جاہلیت ہونے کی وجہ
سے ہے اور امام ابن حبیب مالکیؒ کہتے ہیں کہ آگ بد قالی
اور بد شگون کی وجہ سے مکروہ ہے (کہ کہیں اس کا تعلق
تقاء لا بالنار۔

(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۷۷) آگ سے ہی نہ ہو جائے۔

غور کیجئے کہ حضرات سیدہ کرامؓ وفات کے وقت کس طرح وصیت کرتے ہیں کہ وفات کے بعد
آگ ہمارے قریب نہ آئے دینا۔ مگر غضب ہے کہ آج قبروں پر خوب ٹھکا کر چراغ روشن کئے جاتے ہیں
اور یہ منطق پیش کی جاتی ہے کہ اس میں حضرات اولیاء کرامؓ کی عظمت ہے، راستہ پر چلنے والوں کیلئے سہولت
ہے۔ قرآن کریم پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر حضرات اولیاء کرامؓ کی تعظیم و توقیر حضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کی خلاف ورزی سے ہوتی ہے اور اگر ان کی محبت لعنت کا کام کرنے
سے ہوتی ہے تو ہم بہانہ دہلہ کہتے ہیں کہ یہ تعظیم مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کے ساتھیوں کو بھی نصیب
ہو۔ ہمارے نزدیک خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد کے آگے

تسلیم خم کرنے سے ہی حضرات ادیباء کرام اور بزرگان دین کی تعظیم ہوتی ہے مگر

تیس کس کن ز گلستان من بہار مرا

حافظ ابن القیم کہتے ہیں کہ :

نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن اتخاذ القبور مساجد و ایقاد السروج علیہا (زاد المعاد ص ۱۳۶)

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبور کو سجدہ گاہ بنانے اور ان پر چراغ روشن کرنے سے منع کیا ہے۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ :

و ایقاد النوا علی القبور من رسوم الجاہلیۃ

قبور پر آگ جلانا جاہلیت کی رسم ہے۔

(عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۸)

اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بغض ترین

وہ شخص ہے جو اسلام میں جاہلیت کی رسمیں تلاش کرے۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۱ عن البخاری)

علامہ سید محمود آلوسی حنفیؒ کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح قاضی شتار اللہ صاحبؒ کا

یہ حوالہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر چراغ افروزان نزد قبر و سجدہ کنندگان لعنت

گفتہ (ارشاد الطالین ص ۲۲)۔ اور مفتی احمد یار خان صاحبؒ بھی اس کو نقل کرتے ہیں اور نیز لکھتے ہیں

کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بھی قبور پر چراغ روشن کرنے کو بدعتِ شنیعہ کہتے ہیں (جبار الحق ص ۲۸۸-۲۸۹)۔

اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحبؒ لکھتے ہیں :

و اما از کتاب مجرمات از روشنی کردن چراغہا و

یعنی حرام چیزوں کا از کتاب کن مثلاً قبور پر چراغ جلانا

ملبوس ساختن قبور و سرودہا و نواختن معازف

اور ان پر چادریں چڑھانا اور سرودہا گانے بجانے کے

بدعاتِ شنیعہ اند و حضور چشیں مجالس ممنوع۔

آلات استعمال کرنا بدعاتِ شنیعہ میں سے ہے اور ایسی

(فتاویٰ شاہ رفیع الدین ص ۱۷۱)

مجالس میں حاضر ہونا ممنوع ہے۔

حضرات آپ نے ملاحظہ کیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لے کر اس وقت کے علماء و حق

تک قبور پر چراغ روشنی کرنے کو باعثِ لعنت حرام، مکروہ، بدعت اور بدعتِ شنیعہ سے تعبیر کرتے ہیں پھر

بھلا اس مذموم فعل میں بھلائی اور خوبی آئے تو کہاں سے آئے؟ مگر پتہ مرنے کے بعد چلے گا۔
 بوقت صبح شود، پھر روزِ معلومت کہ با کہ باختہ معشوق در شب دیوہ
مفتی احمد یار خان صاحب کی تجنٹ | مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ "حضرت شاہ عبدالعزیز
 صاحب وقاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جابے شک بزرگ ہستیاں ہیں لیکن یہ حضرات
 مجتہد نہیں تاکہ کراہتِ تحریمی و حرمت فقط ان کے قول سے ثابت ہو، اس کے لئے مستقل دلیل شرعی
 کی ضرورت ہے۔" (بلفظہ ج۱ الحق ص ۲۹)۔ مفتی صاحب کی یہ بات قابلِ صد تحسین ہے کہ انہوں نے
 ایک حق بات تو زبان سے نکالی ہے اور اس کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ دلیل شرعی کے مقابلہ میں
 بزرگ سے بزرگ ہستیاں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ یہی تو ہمارا اور اہل بدعت کا اصولی جھگڑا ہے
 کہ ہم قرآن کریم اور حدیث شریف اور حضرات صحابہ کرام اور اجماع اُمت جیسی شرعی دلیل کے مقابلہ
 میں کسی بھی بزرگ ہستی کی بات کو محبت نہیں تسلیم کرتے، اور اہل بدعت نے انہی بعض بزرگ ہستیوں
 کی لغزشوں کو چُٹن چُٹن کر دین بنا رکھا ہے۔ اور شرعی دلیل کی طرف مطلقاً دھیان ہی نہیں کرتے۔
 کاش کہ وہ انصاف اور دیانت کے ساتھ اس اصول پر کاربند ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق عطا
 فرمائے۔ آمین ثم آمین!

مگر اس عبارت میں چند وجوہ سے بحث ہے۔ اولاً کیا جن حضرات سے مفتی صاحب اور ان
 کے ہم نوا بزرگ استدلال و احتجاج کیا کرتے ہیں وہ سب کے سب مجتہد ہیں؟ اگر ہیں تو چشم مارو شن
 دل ماشاء! اگر نہیں تو اُس وقت یہ قاعدہ کہاں جاتا ہے؟ وثانیاً مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جس
 کام پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے کیا اس میں بھی کراہتِ تحریمی اور حرمت ہوتی
 ہے یا نہیں؟ ان دونوں حضرات کا یہ فتویٰ اپنا ذاتی نہیں، یہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ
 وسلم کی حدیثِ سابق سے ماخوذ ہے۔ اور قاضی ثناء اللہ صاحب باقاعدہ اپنی عبارت میں اس حدیث
 کا حوالہ دے رہے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چراغِ جلائے والوں پر لعنت کی ہے
 اور حضرت شاہ صاحب لفظِ محرمات میں اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بلا شک اگر یہ فتویٰ اور قول

ان کا اپنی طرف سے ہوتا تو دلیل شرعی کے مقابلہ میں حجت نہ ہوتا۔ مگر یہاں تو ان کا فتویٰ دلیل شرعی پر مبنی ہے، پھر یہ کیسے رد ہوا؟ وثالثاً مفتی صاحب کی یہ تحقیق اور تقسیم بھی قابلِ داد ہے کہ کراہت تحریمی اور حرمت تو بزرگ ہستیوں کے قول سے ثابت نہیں ہو سکتی مگر استحباب اور جواز ان کے قول سے ثابت ہو سکتا ہے؟ کیا استحباب ایک شرعی حکم نہیں ہے؟ پہلے باحوالہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ استحباب و ندب بھی ایک شرعی حکم ہے، اور اس پر بھی دلیل دے کار ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی مباح کی اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔

نوٹ: اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کسی میت کو رات کے وقت دفن کرنے کی ذہبت آئے اور روشنی کی ضرورت پیش آئے تو کتب حدیث میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت موجود ہے۔ یہ چیز محلِ نزاع سے بالکل خارج ہے۔

قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول وغیرہ چڑھانا

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین اور خیر القرون سے اس کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں کہ حضرات اولیاء کرامؓ کی قبروں پر چادریں ڈالی گئی ہوں یا ان پر پھول وغیرہ چڑھائے گئے ہوں۔ حضرات اولیاء کرامؓ کی قبریں بھی ہوتی تھیں، پھول اور چادریں بھی ہوتی تھیں، اور ڈالنے والے بھی ہوتے تھے، اور ان میں عشق و محبت کا اعلیٰ جذبہ بھی تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے نہ تو پھول چڑھائے اور نہ چادریں ڈالیں، اور آج یہ کام جائز ہو گئے اور کارِ ثواب بھی، اور اہل سنت کی علامت بھی قرار پائی اور شعار بھی۔

باقی مولوی نسیم الدین صاحب مراد آبادی اور مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ اہل بدعت نے حضرت ابن عباسؓ کی جس روایت سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو قبروں پر کھجور کی ٹہنیاں گاڑ دی تھیں۔ ایک شخص پیشاب کی پھینٹوں سے اجتناب نہیں کیا کرتا تھا (اور اُس صورت میں ناپاک بدن اور کپڑوں سے جو نماز پڑھی گئی وہ کالعدم رہی تو اصل عذاب ترکِ صلوٰۃ پر ہوا۔ نووی ج ۱ ص ۱۳۱)۔ اور دوسرا چھٹی کیا کرتا تھا۔

اور آپ نے فرمایا کہ جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی، شاید ان سے سزا میں تخفیف ہو جائے (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۷۱)۔ تو اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔

اُقلًا اس لئے کہ تخفیفِ عذاب کا سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت اور نشانی مقرر ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :

انی مورت بقبرین یعد بان فاجبت کرمیں دو قبروں کے پاس سے گزرا۔ ان میں دونوں مردوں کو بشفاعتی ان یوقہ ذلک عنہما ما دام الغصنان وطیین۔ (مسلم ج ۲ ص ۴۱۸)

اگرچہ اپنی جگہ قرآن کریم تہیات اور ٹہنیاں (بہرِ خشک) بھی تخفیفِ عذاب کا سبب ہیں مگر اس واقعہ میں تخفیفِ عذاب کا اصل سبب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت تھی۔ ٹہنیاں تو صرف اس کی علامت قرار دی گئی تھی مفتی احمد یار خان صاحب کی غلطی ہے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ ”عذابِ قبر کی کمی بزرے کی تسبیح کی برکت سے نہ کہ محض حضور علیہ السلام کی دعائے۔ اگر محض دعائے کمی ہوتی تو حدیث میں خشک ہونے کی کیوں قید لگائی جاتی۔ لہذا اگر ہم بھی آج پھول وغیرہ رکھیں تو بھی انشاء اللہ میت کو فائدہ ہوگا (جاء الحق ص ۲۸۴)۔ مفتی صاحب اگر ٹہنیوں کی تسبیح کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہوئی تو بزرے کی قید کیوں لگائی؟ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے خشک ہو یا تر۔ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ۔

نوٹ : حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابرؓ کی دونوں روایتوں میں واقعہ دراصل ایک ہی ہے۔

البتہ راویوں کی تعبیر کا ضرور فرق ہے، اور علمِ حدیث میں ایسا بعض اوقات ہو ہی جاتا ہے۔ امام نوویؒ اور علامہ خطابیؒ (المتوفی ۷۲۸ھ) وغیرہ اس واقعہ کے اتحاد ہی کے قائل ہیں اگر یہ دو واقعات بھی ہوں جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۷۱) لکھتے ہیں تب بھی کوئی حرج نہیں۔ جس روایت میں آپ کی شفاعت کا ذکر ہے وہ اس روایت کی تفسیر ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ تو اصل علت اور سبب شفاعت ہی ہے۔ والحدیث یفسر بعضہ بعضاً۔ لہذا مولوی نعیم الدین

صاحب مراد آبادی (المتوفی ۱۳۶۷ھ) نے اپنے سالہ (فوائد النور ۱۲۰۲) میں جو اس پر زور دیا ہے

کہ دو واقعے الگ الگ ہیں، اُن کو چنداں منہیہ نہیں ہے۔

و ثانیاً یہ ٹہنیاں عام درختوں سے نہ کاٹی گئی تھیں بلکہ مسلم ۱۵۵ھ کی روایت میں اس کی تصریح ہے

کہ یہ ان دو درختوں کی ٹہنیاں تھیں جو بطور حجرہ آپ کے پاس چل کر آئے تھے، اور پھر اپنے اپنے مقام پر پھٹ گئے تھے۔

و ثالثاً اس روایت سے اگر ثبوت ہے ہی تو صرف تر ٹہنیوں کا، پھولوں اور چادروں کا ثبوت

کہاں سے ہوا؟

و رابعاً اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اصل سبب تخفیف عذاب کا ٹہنیوں کا سبز ہونا تھا، اور یہ

علت پھول وغیرہ میں پائی جاتی ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ گناہ گاروں اور فاسقوں کی قبروں

پر پھول وغیرہ ڈالنے چاہئیں۔ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر اس کا ثبوت کیسے ہوا؟ کیونکہ آپ نے

گناہ گاروں کی قبروں پر ٹہنیاں رکھی تھیں نہ کہ حضرات اولیاء کرام کی قبروں پر (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۵۷)

و خامساً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور خیر القرون سے ہر گز اس کا

ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے کسی ولی اور بزرگ کی قبر پر سبز ٹہنی رکھی ہو اور پھول ڈالے ہوں۔ — یہی

حضرت بریدہ بن الحصیب کی وصیت کہ میری قبر پر تر ٹہنی رکھ دینا (بخاری ص ۱۸۱) جو حضرت مصعب بن عمیر

کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ انہوں نے انکار ہی سے اپنے کو گناہگار سمجھ کر یہ وصیت کی ہو۔ اور سوال یہ ہے کہ کیا

خیر القرون میں کسی نے کسی کو ولی اور بزرگ سمجھ کر اس کی قبر پر ٹہنیاں رکھی ہیں؟ اور کیا ان سے چادریں

ڈالنے کا ثبوت ہے؟ اسی جرد میں اختلاف ہے اور بس

سخن شناس نہ دہرا خطا ایجا است

منہی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ مولوی اشرف علی صاحب نے اصلاح الرسوم میں لکھا،

کہ پھول وغیرہ فاسقوں، فاجروں کی قبروں پر ڈالنا چاہیے نہ کہ قبور اولیاء پر۔ ان کے مزارات میں

عذاب ہے ہی نہیں جس سے پھول وغیرہ سے تخفیف کی جائے۔ مگر خیال رہے کہ جو اعمال گناہ کار کہتے

دفعِ مصیبت کرتے ہیں وہ صالحین کے لئے بلندی درجات کا فائدہ دیتے ہیں۔ (جاء الحق ص ۲۸۴)
 مفتی صاحب کو یہ نسخہ تو بہت ہی اکسیر ہاتھ آیا ہے، مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ یہ مسئلہ جناب
 نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم تھا۔ پھر انہوں نے صالحین کی قبروں
 پر پھول کیوں نہ ڈالے؟ اور صالحین کو رفعِ درجات کے فائدہ سے کیوں محروم رکھا؟ عذر
 کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟

اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس بھی مردود اور باطل ہے کہ ایک تر پھول میں
 زندگی ہے، اس لئے وہ تسبیح و تہلیل کرتا ہے جس سے میت کو ثواب پہنچتا ہے یا اس کے عذاب میں
 کمی ہوتی ہے، زائرین کو خوشبو حاصل ہوتی ہے۔ لہذا ہر مسلمان کا قبر پر ڈالنا جائز ہے (جاء الحق ص ۲۸۴ بقلم)
 فی الجملہ ادراک و شعور اور تسبیح و تہلیل تو ہر ایک چیز سے شرعاً ثابت ہے اور قرآن کریم اس
 پر ناطق ہے پھر خشک و تر کا فرق کیوں؟ علاوہ بریں یہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور
 حضرات صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم تھا مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ مزید براں چادروں میں کونسی ترمی،
 سبزی اور زندگی ہے جو اس حدیث سے وہ بھی قبروں پر ڈالنی جائز ہو گئیں؟ باقی کسی غیر معصوم اور
 غیر مجتہد کی بات حجت نہیں ہے۔ رہا امام شافعیؒ وغیرہ کا یہ قول کہ قبور پر ستور درست ہیں کیونکہ اس
 میں صاحبِ قبر کی تعظیم ہے وغیرہ وغیرہ، تو قابلِ اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ یہ غیر مجتہد کا قول ہونے
 کے علاوہ بلا دلیل بھی ہے۔ اور قبر اور تعظیم قبر کوئی نیا واقع نہیں کہ ہم اس میں متاخرین کے قیاس کو
 بھی تسلیم کر لیں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین و تبع تابعین کے
 زمانہ میں قبریں بھی ہوتی تھیں مگر چادروں کا کوئی دستور نہ تھا (اور اسی پر ان کا عمل اور اتفاق رہا ہے
 یہ الگ بات ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی جہالت کا یوں ثبوت دیا ہے، اُن کے قبور پر
 سبز یا پھول ڈالنا بالاتفاق جائز ہے۔ جاء الحق ص ۲۸۴۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ)۔ لہذا ہمیں مصنوعی
 تعظیم اور احترام کی ضرورت نہیں ہے۔ جو انہوں نے کیا سوہیں بھی کرنا چاہیے۔

رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ قیاس کہ ”چادریں اصل یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک

میں بھی کعبہ معظمہ پر غلاف تھا کہ اس کو منع نہ فرمایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے روضہ پاک پر غلاف بزرگیشی چڑھا ہوا ہے جو کہ نہایت قیمتی ہے۔ آج تک کسی نے اس کو منع نہ کیا۔ مقام ابراہیم یعنی وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت خلیلؑ نے کعبہ معظمہ بنایا، اس پر بھی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ (ملفوظ جلد ۱ ص ۲۸۵)۔ تو یہ قیاس مع الفارق ہے جو مسموع نہیں ہے۔ اس لئے کہ کعبہ کا غلاف تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی موجودگی میں چڑھتا تھا، اور اس میں آپؐ نے تغیر نہیں کیا۔ لہذا وہ عین سنت ہے (دیکھئے بخاری جلد ۲ ص ۱۱۰ وغیرہ)۔ اسی طرح مقام ابراہیم کا غلاف بھی اگر ثابت ہو، تو بظاہر خیر القرون کا ہوگا، ان پر قبور کے غلاف کو قیاس کنا قیاس مع الفارق ہے۔ بعد اللہ تعالیٰ راقم ایٹم دو مرتبہ حج کے شرف سے مشرف ہوا ہے لیکن مقام ابراہیم پر کوئی غلاف نہیں دیکھا۔ اس وقت یہ مبارک پتھر ایک دبیز شیشے کے مینار میں رکھا ہوا ہے۔ باقی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کا غلاف، تو اگر یہ کسی معتبر دلیل سے ثابت ہو تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غسل، دفن اور قبر وغیرہ کے متعلق چند اور خصوصیات بھی تحقیق ممکن ہے یہ بھی اُن ہی میں سے ہو۔ لہذا اس پر عام قبروں کو قیاس کرنا باطل ہے۔ اور پہلے حضرت شاہ رفیع الدین صاحب سے اور بقول مفتی احمد یار خان صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ قبر کو ملبوس کرنا یعنی اس پر چادریں وغیرہ ڈالنا بدعتِ شنیعہ ہے۔ لہذا عام حکم یہی ہے۔

مفتی صاحب کا مفتیانہ استدلال | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ

اور ان کے مزارات شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ یعنی اللہ کے دین کی نشانیوں کی تعظیم کرنے کا قرآنی حکم ہے وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ اس تعظیم میں کوئی قید نہیں۔ ہر ٹکے ہر رسے، جس ملک اور جس زمانہ میں جو بھی جائز تعظیم مروج ہے وہ کرنا جائز ہے۔ اُن کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا، چراغاں کرنا، سب میں ان کی تعظیم ہے لہذا جائز ہے (ملفوظ جلد ۱ ص ۲۸۵) داد دیجئے مفتی صاحب کی اس تحقیق کی کہ حضرات اولیاء اللہ کے مزارات بھی شعائر اللہ ہیں

داخل میں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے معظم شعائر اللہ تو جابر بتائے ہیں۔ قرآن، کعبہ نبی اور نماز (حجۃ اللہ ج امک)۔ وہاں قبور کا ذکر نہیں ہے، اور کسی امام سے بھی قبور کا شمار اللہ ہوا منقول نہیں۔ مگر مفتی صاحب کی تحقیق سے مزارات، بھی شعائر اللہ ٹھہرے۔ علماء عقائد نے صراحت سے لکھا ہے کہ قبر کے خاتمہ بالآخر ہونے کی خبر اللہ تعالیٰ نے اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ددی ہو، ہم صرف اس کے متعلق حسن ظن ہی رکھ سکتے ہیں، قطعیت سے کچھ نہیں کہہ سکتے، تو یقین کے ساتھ کسی کو ولی کیسے کہہ سکتے ہیں؟ اور پھر ان کی قبر کو شعائر اللہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ اور پھر مفتی صاحب کے نزدیک ان شعائر اللہ کی تعظیم یوں ہے کہ اُن کی قبروں پر پھول ڈالنا، چادریں چڑھانا اور چراغاں کرنا۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ نے کسی نیک کی قبر پر شاخیں نہیں رکھیں۔ حضرت بریدہؓ کا معاملہ ہی الگ ہے، بلکہ گناہ گار کی قبر پر رکھی تھیں۔ یہ عجیب شعائر اللہ اور نرے ولی ہوتے کہ ہم پہلے ان کو گناہ گار تصور کریں اور پھر ان کی قبروں پر پھول وغیرہ چڑھائیں۔ (النیاذ باللہ تعالیٰ)۔ اور کیا شعائر اللہ کی تعظیم چراغاں جیسے کام سے ہوگی، جس پر سردارِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! عجیب حکمہ افتار مفتی احمد یار خان صاحب کے ہاتھ آیا ہے اور پھر یہ سب کچھ ان کے نزدیک قرآن کریم کی مذکورہ آیت سے ثابت ہے معاذ اللہ تعالیٰ ثم معاذ اللہ تعالیٰ۔ نہ تعظیم کا یہ پہلو اس آیت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو معلوم ہو سکا اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ کو۔ اگر معلوم ہوتا تو قبر پر چراغاں کرنے پر آپ لعنت نہ کرتے اور حضرت عمرو بن العاص وغیرہ اس کے خلاف وصیت نہ کرتے۔ مگر کیا کیا جاتے، اہل بدعت کا باوا آدم ہی نرالا ہے ان کے نزدیک ہر ممنوع چیز مستحب اور کارِ ثواب ہے۔

نیا انکشاف | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں خود زندہ لوگوں کو پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی۔ ایک صحابیؓ نے پختہ مکان بنایا تو حضور علیہ السلام ناراض ہوئے۔ یہاں تک کہ اُن کے سلام کا جواب نہ دیا۔ جب اُس کو گرا دیا تب جواب سلام دیا۔ (دیکھو مشکوٰۃ، کتاب الرقاق فصل ثانی)۔ جابر الحق بلفظہ ۲۷۵۔

اس کا ثبوت تو مفتی احمد یار خان صاحب کے ذمہ ہے کہ وہ کونسی حدیث ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں پختہ مکان بنانے کی ممانعت تھی؟ ذرا اُس حدیث کو نقل تو کیجئے اور اس کی سند اور اس کی تصحیح کا بھی ضرور خیال کیجئے۔ باقی جس روایت کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے کیا اچھا ہوتا کہ اس کو بلفظ نقل کر دیتے تاکہ عامۃ المسلمین کو معلوم ہو جائے کہ حدیث کیسے کہتی ہے اور مفتی صاحب کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابی کے لئے جواب سلام اس لئے ترک نہ کیا تھا کہ اُس نے مکان پختہ بنایا تھا، بلکہ اس لئے آپ نے ان کو سلام کا جواب نہ دیا تھا کہ اُس نے گنبد اور قبۃ بنایا تھا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مزاج اور آپ کی طبیعت کو یہ اتنا ناگوار گزرا کہ آپ نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ حضرت اسس روایت کرتے ہیں کہ:

إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا وَفَضَحَ مَعَهُ فِرَاشِي قُبَّةٍ مَشْرُوقَةٍ فَقَالَ مَا هَذَا
 آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک دن باہر نکلے، اور ہم بھی ساتھ تھے۔ آپ نے ایک اونچا گنبد اور قبۃ دیکھا۔ فرمایا
 (المحدث) ابوداؤد ج ۲، ۳۵۵ - مشکوٰۃ ج ۲، ۴۳۱ - یہ کیا ہے الخ

اسی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ جب اُس شخص نے وہ قبۃ اور گنبد گرا دیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس سے راضی ہوئے۔ غور کیجئے کہ یہ روایت تو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے زندوں کیلئے بھی قبۃ کی شکل کو پسند نہیں کیا، چہ جائیکہ مردوں کے لئے اس کو پسند کرتے۔ خصوصاً جبکہ آپ نے قبروں پر مطلق عمارت ہی کو پسند نہیں کیا۔ مگر آج نہ صرف قبروں پر عمارت کا جواز پیش کیا جاتا ہے بلکہ گنبد اور قبۃ جیسی شکل پر زور دیا جاتا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سرے سے پسند ہی نہیں فرمایا۔

پہ پختہ قبریں بنانے کا ایک اور فائدہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے وطن میں دیکھا کہ دو قبرستان تھے۔ ایک میں کچھ قبریں پختہ تھیں اور دوسرے پختہ قبروں سے خالی تھے۔ فقیروں نے مخفیہ طور پر وہ قبرستان فروخت کر دیئے۔ مقدمہ چلا تو جس قبرستان میں پختہ قبریں تھیں ان کو حکام نے اس کو سفیدہ مانا اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے وہ نکل گیا۔ جس میں پختہ قبریں تھیں وہ حصہ مسلمانوں کے

پاس رہا (مخلصہ) پھر اگے لکھتے ہیں کہ "اس سے مجھے پتہ لگا کہ اب ہندوستان میں کچھ قبریں پختہ ضرور بنوانی چاہئیں کیونکہ یہ بقار وقت کا ذریعہ ہیں جیسے مسجد کے لئے مینارے۔ (بلفظہ جوار الحق ص ۲۱۲)۔

کیا خوب؟ سوال یہ ہے کہ وقت کو محفوظ رکھنے کے اس طریقہ کا پتہ حضرات صحابہ کرام کو کیوں نہ لگا بلکہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بقار وقت کا یہ طریقہ کیوں معلوم نہ ہوا؟ اور آپؐ نے کیوں قبریں پختہ بنانے سے منع کیا؟ اور پھر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ اور دیگر ائمہ اسلام کو یہ طریقہ کیوں نہ سوجھا۔ اور انہوں نے کیوں پختہ قبروں اور ان پر حمارتوں کو ڈھلنے کی مہم شروع رکھی؟ مفتی صاحب کو تو اس سے پتہ لگا مگر ان کو نہ لگا کیوں؟ یہ نہ پوچھتے۔ باقی جس قبرستان میں پختہ قبریں نہ تھیں، اس کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانا اس پر مبنی نہیں کہ وہاں قبریں پختہ نہ تھیں بلکہ اس میں ایک تو مسلمانوں کی غفلت اور بے پروائی شامل ہے۔ اور دوسری یہ بات ہے کہ قبروں پر فقیروں اور مجاوروں کا وجود نامسعود (جو سراسر اسلام کے خلاف ہے) اس کی علت ہے۔ اصل سبب اور علت کو سوچنے کی کوشش نہیں کی، اور غیر علت کو علت اور سبب بنانے کا مفتی احمد یار خان صاحب کو پتہ لگ گیا۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔

قبروں پر مجاور بننا

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں "مجاور بننا تو جانتے ہیں۔ مجاور اسی کو تو کہتے ہیں جو کہ قبر کا انتظام رکھے۔ کھولے، بند کرنے کی چابی اپنے پاس رکھے وغیرہ وغیرہ، یہ صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ مسلمانوں کی والدہ حضور علیہ السلام کی قبر انور کی منتظر اور چابی والی تھیں جب صحابہ کرام کو زیارت کرنی ہوتی تو ان سے ہی کھولا کر زیارت کرتے (دیکھو مشکوٰۃ باب الدفن، بلفظہ جوار الحق ص ۲۱۲) لیجئے ہم نے مشکوٰۃ شریف بھی دیکھ لی۔ اور مشکوٰۃ میں جہاں سے یہ روایت نقل کی ہے وہ اصل کتاب بھی دیکھ لی مگر مفتی صاحب کے اس غلط اور بے بنیاد دعویٰ کی دلیل وہاں نہ مل سکی۔ روایت ملاحظہ کریں۔

عن القسم بن محمد قال دخلت علی حضرت قاسم بن محمد (بن ابی بکر) فرماتے ہیں کہ میں حضرت

عائشۃ فقلت یا احماء اکشفی لی عن قبر
النبی صلی اللہ علیہ وسلم و صاحبیہ
فکشفتم لی عن ثلاثة قبور لا مشرقیہ
بالا طئۃ مطبوخة ببطحاء العرصة
الحمراء۔ (رواہ ابوداؤد ص ۱۱۸، مشکوٰۃ ص ۱۲۱)
عائشہ کے پاس گیا اور میں نے کہا۔ اے میری اماں جان مجھے
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے دو ساتھیوں
کی قبریں کھول کر دکھائیں تو انہوں نے تین قبریں کھول
کر مجھے بتائیں۔ یہ تودو قبریں اونچی تھیں اور نہ بالکل
زمین کے ساتھ پیوستہ مگر تمام کے سرخ رنگ کے سنگریزے
ان پر بچھائے ہوئے تھے۔

حضرت قاسم بن محمد تابعی اور حضرت عائشہ کے حقیقی بھتیجے ہیں اور بالکل نو عمر۔ انہوں نے اپنی پھوپھی
صاحبہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ (اپنے دادا کی) اور حضرت عمرؓ کی قبر دیکھنے کے
شوق کا اظہار کیا اور پھوپھی صاحبہ نے ان کو وہ تینوں قبریں دکھا دیں۔ اس میں نہ تو چابی کا کہیں ذکر
ہے اور نہ اس کا ذکر ہے کہ مستقل طور پر کھولنے اور بند کرنے کا انتظام حضرت عائشہؓ کے سپرد تھا، اور نہ
اس کا ذکر ہے کہ جب حضرات صحابہ کرامؓ کو زیارت کرنی ہوتی تو ان سے کھلو اگر زیارت کہتے۔ حضرات
صحابہ کرامؓ کو ان قبروں کی شناخت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انہوں نے تو اپنے ہاتھوں سے ان بزرگوں کو
دفن کیا تھا۔ ہاں البتہ حضرات تابعین کو علی التبعین آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ
کی قبریں معلوم کرنے کا شوق تھا، اور ہر مسلمان کو بیٹھا چاہیے۔ اسی جذبہ کے تحت حضرت قاسم بن محمدؓ نے
اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ کے ذریعہ شوق پیدا کیا، نہ یہ کہ حضرت عائشہؓ وہاں کی مجاور تھیں (العیاذ
باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ)۔

نماز جنازہ کے بعد دُعا

کسی مسلمان کی وفات کے بعد اُس کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب اس کو جو بہترین شخصہ
بیج سکتے ہیں اور اس کے ساتھ جو حسن سلوک کر سکتے ہیں، وہ اس کے حق میں دُعا کرنا ہے۔ انفرادی طور
پر جس وقت بھی کوئی چاہے اُس کی وفات کے بعد نازلیست اس کے لئے دعا کرے۔ اس میں کوئی قہریت

اور خرابی نہیں ہے اور نصوص شرعیہ سے اس کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ لیکن بصورت اجتماع میت کے لئے دعا کرنے کا ثبوت صرف نماز جنازہ کی صورت میں اور قبر پر یقین شرعی کی شکل میں ہے۔ اس کے علاوہ جہاں شریعت نے اجتماعی صورت میں دعا کا طریقہ نہیں بتلایا، وہ درست نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؓ اور اتباع تابعینؓ نے ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں جنازے پڑھے اور پڑھائے مگر کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے فوراً بعد اجتماعی رنگ میں دعا مانگی ہو۔ باقی میت کے لئے مطلق دعائے، بل کہ اجتماعی شکل میں یا نماز جنازہ کے متصل بعد ثابت کرنا، افسوس ناک مغالطہ یا قلت تدبر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے۔ اس کی تفصیل گذر چکی ہے کہ احکام عامر سے امور خاصہ کا اثبات درست نہیں ہے بلکہ یہ ایک عیبارانہ مغالطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء، احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادہم نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنے سے منع کیا ہے اور اس کو مکروہ کہا ہے۔ چنانچہ امام ابو بکر بن حامد الحنفی (معاصر ابوالحسن البکیر المتوفی ۲۶۲ھ) فرماتے ہیں کہ:

ان اللہ عابد صلوة الجنائز مکروہ (محیط البیان) نماز جنازہ کے بعد دعا مکروہ ہے۔

امام ابو بکر بن حامد کا حوالہ ہم نے فقہیہ سے نقل نہیں کیا تا کہ مفتی احمد یار عثمان صاحب اپنے اعلیٰ حضرت کی تقلید کرتے ہوئے یہ نہ کہہ دیں کہ فقہیہ غیر معتبر کتاب ہے، فقہیہ والا بد مذہب اور معتزلی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ (دیکھئے جلاء الحق ص ۲۶۸ محصلہ)۔ ملحوظ رہے کہ ہم نے یہ حوالہ محیط سے نقل کیا ہے جو فقہ حنفی کی معتبر اور مشہور کتاب ہے۔ محیط مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور (انڈیا) کے کتب خانہ میں موجود ہے (مذکرہ تحلیل ص ۲۹۱) اور محیط کا یہ حوالہ امام ابو بکر بن حامد کا نام لئے بغیر دلیل الخیرات (۴۵) مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب (میں بھی مذکور ہے اور دلیل الخیرات ص ۱۹ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (المتوفی ۱۳۶۲ھ) نے اپنے تصدیقی بیان میں بحوالہ محیط امام ابو بکر بن حامد کے حوالہ سے یہ عبارت نقل کی ہے جنہوں نے مدینہ منورہ سے محیط برطانی کی آٹھ جلدیں خرید کر مدرسہ کے کتب خانہ کو وقف کر دی تھیں۔ علاوہ بریں فقہ اتنی غیر معتبر بھی نہیں ہے جتنی کہ اعلیٰ حضرت بریلوی نے سمجھ

رکھی ہے۔ فنیہ کا صرف وہ حوالہ غیر معتبر ہوگا جس کی تائید دوسرے حضرات فقہار سے نہ ہوتی ہو۔
 (دیکھئے فوائد بہار، ہفت روزہ سالہ رضوان لاہور، بابت ۱۴۲۱ھ، ص ۱۹۵۲، مشکلم میں ہے فنیہ وغیرہ متبرکاتوں میں تھابتے الخ
 امام شمس اللہ حلوئی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۸۵ھ) اور بخاری کے منشی قاضی شیخ الاسلام علامہ سعدی
 الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۸۵ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم الرجل بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنائزۃ (قنیہ ص ۵۶۱)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے کوئی آدمی نہ ٹھہرے۔
 امام طاہر بن احمد البخاری الحنفیؒ (المتوفی ۵۲۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء فی قراءۃ القرآن لاجل المیت۔ نماز جنازہ کے بعد اور اسی طرح اس سے قبل میت کیلئے
 بعد صلوٰۃ الجنائزۃ وقبلہا (خلاصۃ الفتاویٰ ص ۱۲۸)۔ قرآن پڑھ کر دعا نہ کی جائے۔
 علامہ سرین الدین اودی الحنفیؒ (المتوفی فی حدود ۱۲۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

اذا فرغ من الصلوٰۃ لا یقوم بالدعاء (فتاویٰ سرنجیہ ص ۲۶)۔ جب نماز جنازہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کیلئے نہ ٹھہرے۔
 امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردی الحنفیؒ (المتوفی ۸۲۷ھ) فرماتے ہیں کہ:

لا یقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنائزۃ لانه دعاء موق۔ (فتاویٰ جزیریہ ج ۱ ص ۲۵۳)۔
 ایک مرتبہ دعا کر لی ہے (یعنی نماز جنازہ کے اندر)۔

امام شمس الدین محمد خراسانی کو بستانی الحنفیؒ (المتوفی ۱۲۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ:
 ولا یقوم داعیالہ (جامع الرموز ص ۱۲)۔ اور میت کے حق میں دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔
 اور علامہ قہامہ ابو حنیفہ ثانی ابن نجیم الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا بعد التسلیم (محرم الآثار ج ۲ ص ۱۸)۔ سلام پھیر لینے کے بعد دعا نہ کرے۔
 اور مفتی محمد نصیر الدین الحنفیؒ (المتوفی ۱۳۰۰ھ) لکھتے ہیں کہ:

وبعد ایستادہ نماز برائے دعا (فتاویٰ برہنہ ص ۳)۔ نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔
 اور حضرت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ:

ولا یدعوا للمیت بعد صلوٰۃ الجنائزۃ لانه یشبه نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے کیونکہ یہ نماز

الزیادة فی صلوة الجنائز (برقات ج ۲ ص ۲۱۹) جنازہ میں زیادتی کے مشابہ ہے۔

اور فقہ کی مشہور کتاب مجموعہ خانی میں ہے :

دعا بخاند و فتویٰ بریں قول است (مجموعہ خانی قلمی ص ۳۲۹) یعنی دعا کرے اور فتویٰ اس قول پر ہے۔

اور منتہی سعد اللہ صاحب الحنفی (المتوفی ۱۲۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ :

خالی از کراہت نیست زیرا کہ اکثر فقہا بوجہ زیادہ یعنی یہ کراہت سے خالی نہیں ہے کیونکہ اکثر حضرات فقہار

بودن بر امر مسنون منع میکنند (فتاویٰ سعید ص ۱۳۱) کرام اس کو امر مسنون پر زائد ہونے کی وجہ سے منع کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

”بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے۔“ (نفع المفتی و السائل ص ۱۷۱)

اور علامہ برجندی الحنفی نے بھی دعا بعد نماز جنازہ کو مکروہ کہا ہے۔ (برجندی حاشیہ شرح فقاریہ)

اس کے علاوہ بھی متعدد حضرات فقہار کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعا مانگنے کو منع کہا ہے مثلاً دیکھئے

مدخل ج ۳ ص ۲۲ لابن امیر الحاج، مظاہر حق ج ۲ ص ۵۷۱ نواب قطب الدین خان صاحب وغیرہ۔

حضرات فقہار احناف کی یہ عباتیں بھی ملاحظہ کیجئے اور مولوی محمد عمر صاحب کا فیصلہ بھی دیکھ لیجئے کہ :

”احناف نماز جنازہ کے بعد دعا مانگتے ہیں، وہ بانی بڑا جانتے ہیں، دیوبندی بھی منکر ہیں۔ اب

تم فیصلہ کرو کہ دعا کا اٹکار کرتے ہو، تم کون ہو؟“ (بلغفہ مقیاس الحنفیت ص ۵۲۹)

یہ فیصلہ مولوی محمد عمر صاحب کو خود کرنا چاہیئے کہ وہ کون ہیں؟ حنفی یا غیر حنفی؟ ذرا مولوی صاحب

ہمت کر کے دوچار حضرات فقہار کرام کی عبارتیں تو نقل کر دیں جن سے ان کا مسلک ثابت ہوتا

ہے۔ دیدہ یابد۔

رہا امام فضلیؒ کے لاہ یا اس بلست استدلال کرنا تو بے کار ہے۔ اولاً اس لئے کہ جمہور حضرات

فقہار احناف کے مقابلہ میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہو سکتی۔ وثانیاً علامہ شامی (ج ۱ ص ۱۷۱) وغیرہ

نے اس کی تصریح کی ہے کہ لاہ یا اس بہ میں کراہت تنزیہی پائی جا سکتی ہے، اور لاہ یا اس بہ غیر مستحب

پر بھی اطلاق ہوتا ہے (ج ۱ ص ۱۷۱)۔ لہذا یہ بھی ان کو سود مند نہیں ہے۔ حضرت مولانا مفتی کنایت اللہ صاحب

(المتوفی ۱۳۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ اور چونکہ لفظ لا بائیں اکثر خلافِ اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے، اس لئے ایک صاف اور واضح تطبیق تو امام محمد بن الفضل اور امام ابو بکر بن حامد کے کلام میں یہ ہو سکتی ہے کہ اول الذکر مکروہ تنزیہی اور نہ تحریر الذکر مکروہ تحریمی فرماتے ہیں۔ اور ظاہر یہی ہے کیونکہ اکثر کتب فقہ و فتاویٰ میں اول اصل مذہب یہی بیان کیا ہے کہ دعائے کرے یا دعا مکروہ ہے۔ اور کراہتِ مطلقہ سے اکثری طور پر تحریمی ہی مراد ہوتی ہے اور امام محمد بن الفضل سے اس کے خلاف جو قول نقل کیا اس کو لا بائیں سے تعبیر کیا جو اصل معنی کے لحاظ سے کراہتِ تنزیہی یا کم از کم خلافِ اولیٰ میں مستعمل ہوتا ہے۔ (دلیل الخیرات فی ترک المنکرات ص ۴۹)

مولوی محمد عمر صاحب کا ایک اور کمال ملاحظہ ہو، وہ ایک عبارت کے مطلب کو نہ سمجھتے ہوئے یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "جو دُعائے رو کے وہ تمام زمانے سے زیادہ اہم ہے۔" (مقیاس مسئلہ ۵۳۷)

مولوی محمد عمر صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جن حضرات فقہاءِ احناف کے حوالے ہم نے ذکر کئے ہیں وہ تو تمام اس دُعائے منع کرتے ہیں، کیا وہ بھی تمام زمانے سے زیادہ اہم ہیں؟ سوچ کر اور ہوش میں آکر جواب دینا۔ قارئین کرام! غور فرمائیے کہ اکابرینِ علماء احناف جنانہ کے بعد کی دُعا کو مکروہ بھی کہتے ہیں اور اس سے محض اس لئے منع کرتے ہیں کہ یہ امرِ مسنون پر زیادتی ہے۔ اگر خیر اقوال میں یہ دُعا ہوتی تو یہ اکابر ہرگز اس کو خلافِ مسنون اور مکروہ کہنے کی جرأت نہ کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ آج مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت نواز پارٹی اس خلافِ مسنون اور مکروہ کلام کو جائز اور مستحب سمجھتے ہیں، اور اس کے اثبات کے دہپے ہیں، اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو حنفی کہتے ہوئے حضراتِ فقہاءِ احناف کی صریح مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ:

و مکروہ راستن دانستن از عظم جنایات است، چہ مکروہ کو اچھا سمجھنا بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ حرام کو حرام رامباح دانستن منجر بکفر است و مکروہ را حسن مباح سمجھنا کفر تک نہایت بیجا و تباہی ہے اور مکروہ پنداشتن یک مرتبہ از ان پامایاں است شلوعت این فعل کو اچھا جاننا اُس سے ایک مرتبہ خود تر ہے۔ اس رائیک ملاحظہ باید نمود۔ (مکتوبات حصہ پنجم ص ۷۷)

فعل کی قباح کو اچھی طرح ملاحظہ کرنا چاہیے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان عبارات پر فریق مخالف کی طرف سے جو اعتراضات (یا بزم خود جو جوابات) پیش کئے گئے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

اعتراف: مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ ”اس اعتراض کے (کہ حضرات فقہاء کرام کی عبارات میں دعا بعد الجنازہ کی مانعت آئی ہے) دو جواب ہیں۔ ایک اجمالی دوسرا تفصیلی۔ اجمالی جواب تو یہ ہے کہ اس دعا سے مانعت کی تین وجہیں ہیں۔ اولاً یہ کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہو۔ دوم یہ کہ دعائیں زیادہ لمبی نہ ہوں جس سے کہ دفن میں بہت زیادہ تاخیر ہو، اسی لئے نماز جمعہ کے انتظار میں دفن میں تاخیر کرنا منع ہے۔ تیسرے یہ کہ اسی طرح صف بستہ بہیت نماز کی جاوے کہ دیکھنے والا سمجھے کہ نماز ہو رہی ہے کہ یہ زیادتی کے مشابہ ہے۔ لہذا اگر بعد سلام بیٹھ کر یا صفیں توڑ کر، تھوڑی دیر دعا کی جاوے تو بلا کر اہمیت جائز ہے۔ یہ وجوہ اس لئے نکالے گئے ہیں کہ فقہاء کی عبارات میں آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ اقوال احادیث مذکورہ اور صحابہ کرام کے قول و عمل کے خلاف نہ ہوں۔ تفصیلی جواب یہ ہے کہ عبارات میں سے جامع الرموز، ذخیرہ، محیط، کشف الظہار کی عبارتوں میں تو دعا سے مانعت ہے ہی نہیں۔ بلکہ کھڑے ہو کر دعا کرنے سے منع فرمایا ہے، وہ ہم بھی منع کرتے ہیں مرقات اور جامع الرموز میں یہ بھی ہے لافہ یشبہ الزیادۃ، یہ زیادتی کے مشابہ ہے۔ یعنی اس دعا سے دھوکا ہوتا ہے کہ نماز جنازہ زیادہ ہو گئی الخ (بہار الحق ص ۲۶۵)“

جواب: یہ جملہ اعتراضات یا بزم خود جو جوابات مفتی احمد یار خان صاحب کی جہالت اور بے خبری کا نتیجہ ہیں اور کئی وجوہ سے یہ قابل التفات ہی نہیں ہیں :

اولاً اس لئے کہ اگرچہ حضرات فقہاء احناف اور شوافع کا اس میں اختلاف ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے قبل دعا کرنا درست ہے یا نہیں، حضرات احناف اس کے منکر اور حضرات شوافع اس کے قائل ہیں۔ مگر حضرات فقہاء کرام کی وہ عبارتیں جو ہم نے پیش کی ہیں (بلکہ وہ عبارتیں بھی جو مفتی احمد یار خان صاحب نے پیش کی ہیں بجز ایک عبارت کے) ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے پہلے کے متعلق حضرات فقہاء کرام یہ فرما رہے ہیں۔ وہ تو اس امر کی صریحت کرتے

ہیں کہ نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد دُعا مانگی جائے۔ بعد صلوة الجنائزۃ - اذا فرغ من الصلوة کی قید لگاتے ہیں۔ اس سے بھلا سلام سے قبل کی دُعا کیسے مراد ہو سکتی ہے؟ اور کمال اللہ کی یہ عبارت تھی لا یدعوا بعد التسلیم، سلام پھیرنے کے بعد دُعا کی جائے۔ الغرض حضرات فقہاء احناف کی ان عبارات کا مطلب یہ بیان کرنا کہ جو تھی تبکیر کے بعد سلام سے پہلے کے متعلق ہیں ان کی خالص تحریف ہے محض کچھ نہ کچھ لکھ دینے کا نام جواب نہیں ہوتا۔

و ثانیاً کسی مستند اور معتبر فقیہ سے یہ ثابت نہیں کہ ممانعت لمبی لمبی دعائیں نہ پڑھنے سے ہے، اور مختصر قسم کی دُعا جائز ہے۔ یہ مفتی صاحب کی خود تراشیدہ منطق ہے حضرات فقہاء کرام تو لا یدعوا وغیرہ جملہ سے بالکل اس کی نفی کرتے ہیں۔ جملہ فعلیہ نکرہ کے معنی میں ہوتا ہے اور نکرہ جب سیاق نفی میں آئے تو اس سے عموم ہی مراد ہوتی ہے، اَللّٰہ یہ کہ کوئی مخصوص دلیل ہو اور یہاں کوئی مخصوص دلیل موجود نہیں ہے محض اشتراعات سے تخصیص ہرگز نہیں ہو سکتی۔

و ثالثاً مفتی صاحب اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ لا یقوم بالداء کا یہ معنی ہے کہ صفت بستہ کھڑے ہو کر دُعا کی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو نماز کا شبہ نہ ہو، بلکہ صفوں کو ٹوٹ کر اور بیٹھ کر دُعا کی جائے جو جائز ہے۔ مگر اس پر غور نہیں کیا کہ یہاں صرف یقوم ہی نہیں بلکہ یقوم بالداء ہے۔ یعنی یہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد وہ دُعا کو قائم نہ کرے اور دُعا کے لئے نہ ٹھہرے بالفاظ دیگر دُعا مانگے۔ مفتی صاحب لغت کی کتابوں میں قائم یا ہو کذا کے معنی دیکھ لیں کہ کیا ہوتے ہیں انکو سمجھ آجائے گی۔ خود ان کے اہل حرکت بذل الجواز میں قیام کا معنی ظہور بھی کیا ہے تعجب ہے کہ بعض دیوبندی حضرات کو بھی یہاں مغالطہ ہوا ہے اور بعض نے اس سلسل میں قائم سے خط و کتابت بھی کی ہے انکی تسلی کیلئے ہم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا حوالہ دے کر لے رہے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ”بعض فقہاء نے فرمایا کہ کھڑا کر دُعا نہ کرے چونکہ نماز جنازہ کے بعد اسی حالت پر کھڑا رہنا اور دُعا کرنا خاص طور سے اجتماع و اہتمام کو ثابت کرتا ہے اس لئے اس طرح تعبیر فرمادیا مطلب یہی ہے کہ اجتماع و اہتمام سے دُعا نہ کرے یعنی اگر کوئی ایک شخص نماز جنازہ کے بعد اتفاقی طور پر اپنی جگہ کھڑا رہا اور اُس نے کوئی دُعا اپنے دل میں میت کیلئے مانگ

لی۔ تو اگرچہ اُس نے کھڑے ہو کر یہ دُعا کی ہے مگر مکروہ نہیں ہوگی کیونکہ کراہت کی اصلی علت (اجتماع و اجتماع) موجود نہیں۔ اور نفس قیامِ عِلّت کراہت نہیں۔ انتہی بلفظ (دلیل الخیرات مک و مک) اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ کراہت کی علت اجتماع و اجتماع ہے۔ اس لئے اگر صفیں توڑ کر یا بیٹھ کر اجتماعی صورت میں دُعا کی جائے تب بھی مکروہ اور ممنوع ہے۔

وَابْعَاً اگر بالفرض لا یقوم بالذّعاء کا یہ مطلب لے لیا جائے کہ کھڑے ہو کر دُعا نہ کی جائے تو بحر الائق کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا کہ لا یدعو بعد التسلیم (کہ سلام کے بعد دُعا نہ کرے) اس میں تو لا یقوم کا ذکر ہی نہیں۔ اور مجموعہ خانی کے یہ لفظ تھے "ودعا نخواند و فتویٰ یرس قول است۔" ان میں تو مطلقاً دُعا کی نفی کی گئی ہے عام اس سے کہ کھڑے ہو کر کی جائے یا بیٹھ کر صرف بستہ ہو یا صفت توڑ کر۔ الغرض مفتی احمد یار خان صاحب کا یہ ارشاد کہ دُعا سے ممانعت ہے ہی نہیں بلکہ کھڑے ہو کر دُعا سے منع فرمایا، سراسر باطل اور مردود ہے۔

وخاصاً مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ہم نے یہ وجوہ اس لئے نکالے ہیں کہ فقہاء کرام کی عبارتیں آپس میں متعارض نہ ہوں اور یہ احادیث مذکورہ اور صحابہ کرام کے قول و عمل کے مخالف نہ ہوں ایک خیالی اور ہوائی قلعہ ہے جس میں مفتی صاحب پناہ گزیں ہیں۔ حضرات فقہاء کرام کی عبارتیں آپس میں جب متعارض ہی نہیں تو پھر بلاوجہ یہ وجوہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور جب کسی صحیح حدیث سے اور کسی صحابی کے قول و عمل سے جنارہ کے بعد دُعا کا ثبوت ہی نہیں تو ان کی مخالفت کا کیا مطلب؟ یہاں تو مخالفت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وسادساً مفتی صاحب یہاں تو لکھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر دُعا کرنے سے ہم بھی منع کرتے ہیں مگر ۲۶۳ میں حضرت ابنِ اوفیٰؓ کی روایت یوں نقل کرتے ہیں کہ :

"کھڑے ہو کر دُعا کی اور فرمایا کہ میں نے حضور علیہ السلام کو ایسے ہی کرتے ہوئے دیکھا۔"

جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کھڑے ہو کر دُعا کی ہے تو مفتی صاحب کو اس سے منع کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ یہ یاد رہے کہ مفتی صاحب اصل بات ہی نہیں سمجھے حضرت عبداللہ بن

ابی اوفیٰ کی روایت سے، باوجود ضعیف ہونے کے کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم بخاری نہایت ضعیف اور کمزور راوی ہے، جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ چوتھی ہجیر کے بعد سلام سے قبل انہوں نے دُعا مانگی، جس پر حضرات شوافع کا عمل ہے۔ امام بیہقی نے باب قائم کر کے یہ ثابت کیا ہے (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۲۸) اور ان کی یہ روایت مسند احمد ج ۴ ص ۳۵۵ میں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں جو بحث ہے وہ یہ ہے، کہ نماز جنازہ سے فراغت کے بعد قبل از دفن دُعا مکروہ نہیں ہے اور مفتی صاحب اس کے اثبات سے قاصر ہیں۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی بدحواسی مفتی صاحب نے جارا الحق ص ۲۶ میں جامع الرموز کا تین مرتبہ حوالہ دیا ہے۔ ان کے قائم کردہ نمبروں کے لحاظ سے ع ۱ و ع ۲ و ع ۳، حالانکہ ع ۱ کی عبارت تو جامع الرموز ج ۱ ص ۱۲۵ کی ہے اور ع ۲ و ع ۳ کی عبارت ہی جامع الرموز کی نہیں ہے۔ خدا جانے انہوں نے کس رسالہ یا اخبار سے بدحواسی میں یہ نقل کر دیا ہے۔ کیا خوب تحقیق ہے۔ ٹائٹل پر انہوں نے لکھا ہے کہ ان کی اس کتاب میں — عام مختلف فیہ مسائل کا نہایت محققانہ مدلل فیصلہ کر دیا گیا ہے — سبحان اللہ تعالیٰ، یہ ہیں مفتی صاحب کی تحقیق انیق کے چند نمونے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کے فُعا بعد الجنازہ کے اثبات کے دلائل اور اُن کے جوابات

مفتی صاحب کہتے ہیں: مشکوٰۃ باب صلوٰۃ الجنازہ فصل ثانی میں ہے اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَلْخُصُّوا لَهُ الدُّعَاءَ (جب تم میت پر نماز پڑھو تو اس کے لئے خالص دُعا مانگو) ف سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے بعد فوراً دُعا کی جاوے بلا تاخیر جو لوگ اس کے معنی کرتے ہیں کہ نماز میں اس کے لئے دُعا مانگو وہ ف کے معنی سے غفلت کرتے ہیں۔ صلیتم شرط ہے ماضی اور فا خالصوا ہے جزار شرط اور جزا میں تغایر چاہیے نہ یہ کہ اُس میں داخل ہو۔ پھر صلیتم ہے ماضی اور فا خالصوا ہے امر جس سے معلوم ہوا کہ دُعا کا حکم نماز پڑھ چکے کے بعد ہے جیسے فَإِذَا طَعْنْتُمْ فَانْشُرُوا میں کھا کر جانے کا حکم ہے نہ کہ کھانے کے درمیان، اور إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ میں نماز کے لئے اٹھنا مراد ہے نہ کہ نماز کا قیام جیسا کہ اِلَى سے معلوم ہوا، لہذا یہاں بھی وضو ارادہ نماز کے بعد ہی ہوا، اور ف سے تاخیر ہی معلوم ہوئی جتنی معنی

کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں۔ (جاء الحق ص ۲۶۲)

جواب : مفتی صاحب نے حدیث کا جو یہ معنی کیا ہے کہ جب تم میت پڑھنا پڑھو تو اس کے لئے خالص دُعا مانگو، خیالی ہی سب اس میں ہے۔ سخن شناس نہ دلیہر اخطا میں جا است۔

اولاً اس لئے کہ یہ معنی اس حدیث کے روح کے خلاف ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ میت پر جب تم نماز جنازہ پڑھو تو اس میں نہایت اخلاص سے دعا کرو۔ یہ مطلب تو نہیں کہ نماز جنازہ تو بغیر اخلاص کے پڑھ لو اور اس کے بعد اخلاص سے دعا کرو۔ علاوہ ازیں المدونۃ الکبریٰ ص ۱۶۱ میں ہے: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: قال فی الصلوۃ علی العیت اخلصوا بالذکار اس میں صراحت ہے کہ اخلاص فی الدعاء نماز کے اندر مطلوب ہے۔ ثانیاً: آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ اخلاص نماز جنازہ کے اندر ہی ہونا چاہیے۔ آپ ایسے پُر فیض دل اور وقت آمیز الفاظ سے جنازہ کی نماز پڑھایا کرتے تھے کہ زندہ صحابی یہ یاد کیا کرتے تھے کہ کاش یہ جنازہ ہمارا ہوتا۔ دیکھئے حضرت خوف بن مالک (روقی) کی روایت ص ۳۱۱ اللہ تعالیٰ وغیرہ میں ہے اور سنن الکبریٰ ص ۳۹ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے نماز جنازہ کا طریقہ بتایا جس میں یہ بھی فرمایا کہ درود شریف پڑھنے کے بعد اخلاص کے ساتھ میت کے لئے دعا کرے۔ (ثم یسلم ستر فی نفسه) پھر آہستہ دل میں سلام کے اس صاف طور پر معلوم ہوا کہ یہ اخلاص فی الدعاء سلام پھیرنے سے پہلے ہے۔

ثالثاً اگر اس روایت کا یہی معنی ہوتا جو مفتی صاحب نے کیا ہے تو جنازہ کے بعد کی دعا کو حضرت فقہاء کرامؒ اور خصوصاً فقہاء احنافؒ خلافِ مسنون اور مکروہ کیوں کہتے ہیں؟ کیا حضرت فقہاء کرامؒ سے یہ جسارت ہو سکتی ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل اور قول کو بھی خلافِ سنت اور مکروہ کہہ دیں؟

و سراً بعداً باوجودیکہ یہ حدیث حضرت فقہاء کرامؒ کے پیشِ نظر ہے، مگر وہ پھر بھی جنازہ کے بعد دُعا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر اس حدیث کا وہی مطلب ہوتا جو مفتی صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی نے گھڑا ہے تو حضرت فقہاء کرامؒ کیوں لا یدعوا اور دُعا بخاند سے اس کو منع کرتے۔ وہی حضرت علا علیؒ (و غیرہ) جب اس حدیث کی شرح کرتے ہیں تو ان کو مفتی صاحب کا یہ فنی سمجھ نہیں آتا،

اور جب اُس کے صرف ایک صغیر بعد حضرت مالک بن ہیرو کی حدیث کی شرح کرتے ہیں تو صاف لکھتے ہیں کہ جنازہ کی نماز کے بعد میت کے لئے دُعا مانگے کیونکہ یہ نماز جنازہ کے اندر زیادت کے مشابہ ہے (قرات ۲ ص ۱۱۱) الغرض کوئی ائمہ دینی اور بیرونی قرینہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت اس حدیث کا وہ مطلب صحیح ہو جو مفتی صاحب نے کیا ہے۔

رہا مفتی صاحب کا یہ ارشاد کہ شرط اور جزا میں تغایر ہونا چاہیے تو یہ مسلم ہے مگر یہ تغایر کبھی ذات اور ذات کا ہوتا ہے جیسے **فَإِذَا أَطَعْتُمْ فَأَنْتَشِرُوا** میں کھانا الگ ایک حقیقت ہے اور انتشار الگ اور کبھی یہ تغایر جزو کل کا ہوتا ہے جیسے **وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ** مطلق قرآن کا پڑھنا کل ہے اور صرف **أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ** کا پڑھنا جزو ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ **أَعُوذُ بِاللَّهِ** انہ قرآن کریم کے بالکل مغایر ہے۔ اسی طرح کبھی یہ تغایر اطلاق و تقيید کا ہوتا ہے جیسے **إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ** میں جملہ شرطیہ کے اندر جو سوال ہے وہ مطلق ہے۔ اور جملہ جزائیہ میں جو سوال ہے وہ **مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ** کے ساتھ مقید ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جملہ شرطیہ میں جو سوال ہے وہ اُس سوال کے بالکل مغایر ہے جو جملہ جزائیہ میں ہے جیسا کہ کسی کبھی اہل علم پر یغنی نہیں ہے، اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ مطلق نماز جنازہ (جس میں شہادہ اور درود شریف وغیرہ کا پڑھنا اور با وضو ہو کر قبلہ رخ ہو کر قیام کرنا وغیرہ سب کچھ ہے) کل ہے اور میت کے لئے دعا جزو ہے اور شرط و جزا کے لئے اتنا تغایر کافی ہے۔ اور اگر مفتی صاحب **إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ (الایۃ)** اور **إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ (الایۃ)** اور **إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ (الایۃ)** وغیرہ میں ارادہ وغیرہ متدرس تسلیم کرتے ہیں تو وہ قراءیں کہ اذا صلیتم علی البیت (الحديث) میں اس ارادہ کے نکالنے سے کیا چیز مانع ہے؟ و جہ فرق بتین ہونی چاہیے۔ الغرض یہ مفتی صاحب کی صواب دید پر موقوف ہے کہ اگر وہ ان آیات میں کوئی مقدار نکالتے ہیں تو حدیث میں بھی تسلیم کر لیں یا جزو و کل وغیرہ کا تغایر مانتے ہیں تو وہ مان لیں۔ یہ ان کی مرضی ہے۔ باقی حرفِ رِآئی نماز کے قیام کے لئے بھی آیا ہے سینکڑوں حدیثیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں مگر بخوف طوالت ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ رہا مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ **فَت** سے تاخیر بھی معلوم نہ ہوتی،

حقیقی معنی کو چھوڑ کر بلا قرینہ مجازی معنیٰ مراد لینا جائز نہیں، تو ان کا یہ کہنا اصول سے بے خبری پر مبنی ہے۔
 اولاً اس لئے کہ جیسے تاخیر و تعقیب زمانی ہوتی ہے ایسے ہی مرتبہ بھی ہوتی ہے، اور جناح کے لئے
 یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ زمانہ کے لحاظ سے مشروط سے متاخر ہو، بلکہ بسا اوقات جوار شرط کیلئے علت
 ہوتی ہے اور علت کا معلول پر مقدم ہونا ایک یقین امر ہے۔ علماء اصول نے اس کی تصریح کی ہے کہ:
 اذا الجزاء قد تكون علّة للشرط كان وجداً کبھی جوار شرط کے لئے علت ہوتی ہے جیسے کہ یہ مثال (ان
 التهار فالشمس طالعة) وجد التهار فالشمس طالعة) کہ اگر دن موجود ہے تو اس

(شرح تلویح ص ۲۲۱) لئے کہ سورج نکل چکا ہے۔

ثانیاً اس لئے کہ میت کے لئے نماز جنازہ میں جو دُعا کی جاتی ہے تو وہ شمار اور دُود شریف
 کے بعد کی جاتی ہے اور اس میں جملہ جزائے کی جملہ شرطیہ سے زمانی تاخیر بھی متحقق ہے۔ اور علماء نے
 تصریح کی ہے :-

التراخی بزمان وان قلّ (ماش تلویح ص ۲۲۱) کہ تراخی بہت قلیل زمانہ سے بھی متحقق ہو جاتی ہے۔
 ثالثاً اس میں حقیقی معنیٰ کسی نے ترک ہی نہیں کیا تاکہ ان پر یہ الزام صحیح ہو کہ بلا قرینہ مجازی معنیٰ
 مراد لینا جائز نہیں۔ علاوہ بریں اگر مفتی صاحب وغیرہ کے پاس ارادہ وغیرہ نکلانے کے لئے کوئی قرینہ
 اور منطق موجود ہے تو شاید کسی اور کے پاس بھی کوئی ایسا ہی حربہ موجود ہو کیونکہ

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سُنو

رابعاً کیا مفتی صاحب لوگوں کو یہ فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن مجید پڑھ لینے کے بعد اَعُوذُ
 بالله اللہ پڑھا کریں۔ اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ (الایۃ) میں بھی ق ہے جس سے بقول مفتی صاحب تاخیر ہی
 معلوم ہوتی۔ پھر حقیقی معنیٰ کیوں چھوڑا جائے؟ اسی طرح اور بہت سی آیات میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔
 غرضیکہ کوئی صحیح عقلی اور نقلی دلیل ایسی موجود نہیں ہے جس سے اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ (الحديث)
 سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا ہونی چاہیے اور اس سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔

فریق مخالف کا استدلال اور اس کا حشر مفتی احمد یار خان صاحب منتخب کنز العمال کے

حوالہ سے اور مولوی محمد عمر صاحب بیہقی اور فتح تبتانی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے اپنی لڑکی کا جنازہ پڑھا اور چوتھی تکبیر کے بعد دُعا کی، اور فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے (جامع الترمذی ص ۳۹۳ اور مقیاس خفیت ص ۵۲۶ مصلہ)

الجواب : اس روایت سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں ابراہیم ہجرانی واقع ہے (دیکھئے جامع الترمذی وغیرہ) اور حضرات محدثین کرامؒ اس کی روایت کو نہایت ہی ضعیف سمجھتے ہیں۔ امام ابن عیینہؒ کہتے ہیں۔ اس کی حدیث محض یہی ہے۔ امام ابو نعیمؒ کہتے ہیں، وہ ضعیف ہے۔ امام ابوحاتمؒ اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں حدیث میں ضعیف ہے۔ امام ابوالاحمد الحاکمؒ کہتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک وہ حدیث میں ضعیف ہے۔ علامہ ابن عدیؒ کہتے ہیں، اس سے احتیاج صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن سعدؒ، امام سعدیؒ اور امام حربیؒ وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ص ۱۶۵) لہذا یہ روایت سرے سے قابل التفات ہی نہیں ہے۔

وثانیاً یہ دُعا نماز جنازہ کے ختم ہونے کے بعد کی دُعا نہیں ہے، جیسا کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے لکھا ہے کہ۔۔۔ پھر نماز جنازہ ختم کرنے کے بعد آپؐ وہیں کھڑے رہے، اذانہ دو تکبیروں کے مابین کا دُعا فرماتے رہے (مقیاس ص ۵۲۶) بلکہ یہ دُعا چوتھی تکبیر اور سلام پھیرنے کے درمیان کی دُعا، جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسا بھی کیا تھا اور حضرات شوافعؒ کا اس پر عمل ہے۔ اور حضرات احنافؒ چوتھی تکبیر کے بعد اور سلام سے قبل دُعا کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ :

وفی رواية كبار رجالنا فمكث ساعة حتى ظننت انه سيكون خمسا ثم سلم عن يمينه وعن شماله الخ
(ابن الصالحين ص ۳۱ و کتاب الاذکار ص ۱۲۵)
ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے چار تکبیریں کہیں اور ایک ساعت ٹھہرے رہے، حتیٰ کہ ہم نے یہ خیال کیا کہ وہ پانچویں تکبیر بھی کہیں گے، مگر پھر انہوں نے دائیں اور بائیں سلام پھیر دیا۔

حضرت امام بیہقیؒ اس روایت پر یوں باب قائم کرتے ہیں کہ:

باب ماری فی الاستغفار للعتیت والدعاء له
ما بین التکیوۃ الرابعة والسلام (سنن الکبریٰ ج ۴) اور سلام کے درمیان دعا اور استغفار کرنا چاہیے۔

اس روایت سے نماز جنازہ سے فارغ ہو چکے کے بعد کی دعا ثابت کرنا جہالت یا خیانت ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بیہقی میں ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک جنازے پر نماز کے بعد دعا مانگی (جاء الحق ص ۲۶۳)۔ مگر یہ بھی مفتی صاحب کی کوتاہ فہمی کا ایک کرشمہ ہے ورنہ بیہقی کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک جنازہ پڑھایا اور چند حضرات نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

فقالوا یا امیر المؤمنین لم نشهد الصلوة
علیه فصلی بهم فکان امامهم قرظہ بن
کعب۔ (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۵۴)
انہوں نے کہا، اے امیر المؤمنین! ہم اس کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے تو انہوں نے ان کے ساتھ نماز ادا کی۔ ان کے امام قرظہ بن کعب تھے۔

اور دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ:

فجاء قرظہ بن کعب و اصحابہ بعد الدفن
فامرهم ان یصلوا علیہ (سنن الکبریٰ ج ۴ ص ۴۵۴)
قرظہ بن کعب اور ان کے ساتھی دفن کے بعد آئے اور انہوں نے ان کو صلوٰۃ پڑھنے کا حکم دیا۔

اس روایت سے جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ دوبارہ جنازہ پڑھنا یا دفن کے بعد جنازہ پڑھنا ہے۔

اس مقام پر اس کا جھگڑا نہیں ہے۔ اس روایت سے دعا بعد الجنازہ کا اثبات بالکل بے بنیاد امر ہے اسی طرح مفتی احمد یار خان صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا (غائبانہ) جنازہ پڑھا اور پھر دعا کی (محصلا ج ۱ ص ۲۶۳) بالکل بے اصل اور بے حقیقت بات ہے۔ حضرت اصحٰم نخاشیؒ کے بغیر غائبانہ جنازہ پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو کسی صحیح اور متصل سند کے ساتھ پیش کر دے۔ دیدہ باید جب اصل نماز جنازہ ہی ثابت نہیں تو دعا بعد الجنازہ کا کیا مطلب؟ اسی طرح مبسوط کے حوالہ سے حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن سلامؓ سے یہ ثابت کرنا کہ ان حضرات نے دعا بعد نماز جنازہ

کی قلت فہم یا عدم تدبیر کا حیرت ناک مظاہرہ ہے (دیکھئے مبسوط جلد ۲ ص ۶۴ وغیرہ)۔ ہا یہ فقہ کہ حضرت عبداللہ بن سلام ایک جنازہ پر نماز کے بعد پہنچے اور فرمایا کہ:

ان سبقتونی بالفلوۃ علیہ (ترجمہ مفتی احمد یار خان صاحب کا ہے) اگر تم نے مجھ سے پہلے
فلا تسبقونی بالدعاء۔ نماز پڑھ لی تو دعائیں مجھ سے آگے نہ بڑھو۔ یعنی آدمیرے
(مبسوط جلد ۲ ص ۶۴) ساتھ مل کر دعا کر لو۔

تو اس سے استدلال بھی باطل ہے اس لئے کہ اس میں کوئی جملہ ایسا نہیں، جس کا یہ ترجمہ ہو کہ کو
میرے ساتھ مل کر دعا کر لو۔ یہ مفتی صاحب کی ذاتی اور خانہ زاد اختراع ہے جو ہرگز قابل التفات نہیں ہے۔ یہ
دعا کب ہوئی؟ دفن سے قبل یا بعد؟ قبرستان میں یا مسجد یا گھر میں؟ اس روایت میں اس کی کوئی
تعیین نہیں ہے۔ پھر اس کی بھی کوئی تعیین نہیں ہے کہ اس میں سبقت زمانی ہے یا کیفی اور کسی؟ اس
صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگرچہ میں نماز جنازہ میں شریک نہیں ہو سکا مگر میں کثرت سے ایسی پُر از اخلاص
دعا کر دینا کہ اس کی تلافی ہو جائے گی اور اس میں تم مجھ سے ہرگز سبقت نہیں لے جا سکتے۔

نوٹ : دفن کے بعد قبر کے سرانے اور اس کی پائنٹی میں سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ
پڑھنا جائز ہے، اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح تسبیح و تہلیل اور ثبوت وغیرہ کی کئی احادیث
سے ثابت ہے۔ یہ چیز محل نزاع سے بالکل خارج ہے۔ اسی طرح مطلق دعا بھی منع نہیں جب کسی کا
جی چاہے کہے۔ ہاں البتہ نماز جنازہ کے بعد اجتماعی دعا درست نہیں ہے، جیسا کہ باحوالہ عرض کیا گیا
ہے۔ اور مفتی احمد یار خان صاحب کشف الخطا کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ قائم نہ شود بعد از نماز پڑھنا
دعا (جاء الحق ص ۲۶)۔ یہ مفتی احمد یار خان صاحب کا اس پر بڑے غلط عقلی دلائل پیش کرنا، تو سیکار ہے
اولاً اس لئے کہ دین کا ہر معاملہ عقل سے ثابت نہیں ہوتا۔ ابو داؤد ج ۱ ص ۲۱۱ میں حضرت علیؓ کی
مسح والی روایت ملاحظہ کیجئے۔ وثانیاً عقل سے بھی ہر عقل مراد نہیں ہوتی۔ ہماری عقل کیا اور ہم
کیا؟ کیا پڑی اور کیا پڑی کا شور ہے۔ وثالثاً الدعاء مع العبادۃ وغیرہ ہدایات سے دعا بعد
الجنائزہ ثابت کرنا، اپنی رائے کو شریعت میں دخل دینا ہے۔ گزر چکا ہے کہ امور عامہ سے احکام خاصہ

کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ ورنہ اگر واقعی ان روایات سے یہ دُعا ثابت ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام وغیرہم سے اس کا ثبوت ہوتا، اور حضرات فقہاء احناف اس کو مکروہ نہ کہتے۔

جنازہ کے ساتھ ساتھ ذکر کرنا اور قرآن کریم وغیرہ پڑھنا | حدیث شریفہ اور فقہ حنفی کے پیش نظر اس کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی کہ جنازہ کے ساتھ اجتماعی طور پر ذکر کیا جائے اور خاص طور پر جہر کے ساتھ پچنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ طبرانی حضرت زبیر بن ارقم (المتوفی ۳۷ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان الله يحب الصمت عند ثلاث
عند تلاوة القرآن وعند الزحف،
عند الجنازة۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۹) اور جنازہ کے ساتھ۔

حضرت امام محمدؒ اور علامہ ابن نجیمؒ، حضرت قیس بن عباد (المتوفی ۳۵ھ) سے روایت نقل کرتے ہیں کہ :

قال كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم يكرهون الصوت عند ثلاث
الجنائز، والقتال والذكر۔
آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضرات صحابہ کرام تین مواقع پر آواز بلند کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔
جنازہ کے ساتھ، لڑائی میں اور ذکر کے وقت۔

(السیر الکبیر للامام محمد مع شرح السرخسی ج ۱ ص ۸۹ و بکیر الرائق ج ۲ ص ۷۶ و راجع مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۵۳ و ج ۴ ص ۲۶۲)

بلکہ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خود تین مقامات پر آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ قرآن، جنازہ اور لڑائی کے وقت۔ (السیر الکبیر ج ۱ ص ۸۹)

یہ روایتیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ ذکر کرنے کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ مکروہ سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ بھی اس وقت خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف نے یہ مسئلہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے

کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا اور اسی طرح کلّٰ حی یموت (کہ ہر زندہ مرنے والا ہے) وغیرہ پڑھنا مکروہ اور بدعت ہے، اور کراہت بھی اس میں تنزیہی نہیں بلکہ تحریمی ہے چنانچہ عالمگیری میں ہے :

وعلى متبعي الجنازة الصمت ويكره
لهم رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن -
(کذا فی شرح الطحاوی وعالمگیری مصری ج ۱ ص ۱۷۷)

کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جانے والے ہوں ان پر لازم ہے کہ وہ خاموش رہیں، اور ان کے لئے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن پڑھنا مکروہ ہے۔

امام سراج الدین ابودمیؒ لکھتے ہیں :

رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن وقولهم
كل حي يموت ونحو ذلك خلف الجنازة بدعة
(سراجیہ ص ۱۷۷ طبع نول کشور)

کہ جنازہ کے پیچھے بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا اور یہ کہنا کہ ہر زندہ مرے گا، بدعت ہے۔

اور اسی کے قریب قریب عبارت ہے در مختار کی (دیکھئے کتاب الجنائز)
اور علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں کہ :

وينبغي لمن تبع الجنازة ان يطيل الصمت
ويكره رفع الصوت بالذكر وقراءة القرآن
وغيرهما في الجنازة والكراهة فيها
كراهة تحريم - البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۹ مصری

اور مناسب ہے کہ جو لوگ جنازہ کے ساتھ جائیں وہ طویل خاموشی اختیار کریں اور بلند آواز سے ذکر کرنا اور قرآن کریم پڑھنا، اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا مکروہ ہے، اور کراہت بھی اس میں تحریمی ہے۔

یہ تمام عبارتیں ذمہ دار حضرات فقہاء احناف کی ہیں جو اپنے مفہوم میں بالکل صاف ہیں کہ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کرنا، قرآن کریم پڑھنا، کلّٰ حی یموت پڑھنا اور اسی طرح کچھ اور پڑھنا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کی سینہ زوری ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں کہ ”جن فقہار نے میت کے ساتھ ذکر بالجہر کو مکروہ فرمایا، اُن کی مراد مکروہ تنزیہی ہے۔“ (مباد الحق ص ۳۹۱)

ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں آہستہ ذکر کرتے تو اس کیلئے گنجائش ہے چنانچہ امام قاضی خاں کہتے ہیں:
 ویکره دفع الصوت بالذکر فان اراد اور مکروہ ہے کہ (جنازہ کے ساتھ) بلند آواز سے ذکر
 ان یذکر اللہ ینذکر فی نفسه۔ کیا جاتے۔ ہاں اگر کوئی شخص اپنے دل میں ذکر کرنے کا اللہ
 (قاضی خان رحمہ اللہ طبع نوکشتہ) کہتا ہو تو وہ آہستہ دل میں ذکر کر سکتا ہے۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر
 کرنے کو مکروہ (تحریمی) اور بدعت کہتے ہوئے اس سے منع کرتے ہیں۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب رحمہ اللہ خوش
 کئی آیات سے یہ ثابت کرتے ہیں اور پھر لوگوں کو ہر افشانی فرماتے ہیں:

”جنازہ کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا“ اور پھر جامع الصغیر سیوطیؒ، کنز الخلق منادیؒ، اور
 کنز العمال سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قول لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ جنازہ
 میں زیادہ پڑھا کرو۔ اور دوسری روایت یوں نقل کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے موتی
 کے لئے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا سامان تیار کرو۔ تو ان مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوا کہ جنازہ کے
 ساتھ کلمے کا ذکر ثواب ہے اور میت کو مفید ہے۔ اور اس زمانہ میں ذکر جہری بالمیت کن اہل سنت کیلئے
 ضروری ہے کیونکہ مسلمانوں کو وہابی اور حنفی کے جنازے کا علم ہو جائے۔ (مقیاس الحنفیت ص ۵۸۴)

سبحان اللہ تعالیٰ! یہ ہیں مولوی محمد عمر صاحب کے جنازہ کے ساتھ ذکر کرنے کے اثبات
 کے دلائل، کہ قرآن کریم میں جہاں بھی ذکر کا تذکرہ اور اس کی فضیلت آئی ہے اس سے جنازہ کے ساتھ
 ذکر کرنا بھی ثابت ہو گیا۔

پہلے یہ باحوالہ درج کر دیا گیا ہے کہ احکام عامہ سے امور خاصہ کا اثبات درست نہیں ہوتا۔
 یہی قرآن کریم کی آیات جن سے مولوی محمد عمر صاحب کے نزدیک جنازہ کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھنا
 ثابت ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرامؓ اور حضرات فقہاء احنافؒ کے سامنے بھی تھیں مگر ان کو یہ مبارک
 اجتہاد نہ سوجھا یہ مولوی محمد عمر صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ ان کو قرآن کی ایک آیت ہی سے نہیں
 بلکہ کئی آیات سے یہ مسئلہ معلوم ہو گیا۔ باقی جو حدیث پیش کی ہے اس سے استدلال بھی ناکافی ہے اسلئے

کہ جھگڑا اس میں ہے کہ جو آدمی خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ (کہ جنازہ کے پیچھے جاتا ہے) ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ چل رہے ہوں) کی فہرست میں شامل ہو اس کے لئے جہر سے ذکر کرنا یا قرآن کریم وغیرہ پڑھنا کیسا ہے؟ ہم نے حضرات فقہاء کرام کی حیاتیں بتلائی ہیں، وہ اپنے مفہوم میں نص صریح ہیں اور مولوی محمد عمر صاحب کی پیش کردہ یہ روایتیں خلف الجنازہ یا متبعی الجنازہ کے مفہوم کے بیان سے قاصر ہیں۔ ان روایات کا صحیح مطلب ہے کہ وفات کے وقت ان کو **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کی تلقین کرو عیسا کہ سنت سے ثابت ہے۔ اور طوائف میں تلقین شہادتین کا معمول رہا ہے اور اس کا بھی قوی احتمال ہے کہ جنازہ پڑھتے وقت **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کی تلقین پڑھا کر دینا بھی افضل الذکر ہے۔ اور فی الجنائزہ کے لفظ جس کا ترجمہ مولوی محمد عمر صاحب نے کیا ہے "جنازہ میں نیاؤ پڑھا کر دینا" اس کے نزدیک مولوی شاہ محمد دین الدوری بڑی لکھتے ہیں: سوال: جو لوگ جنازہ کے ہمراہ ہوں ان کو کھڑے راستہ میں پڑھنا کیسا ہے؟ جواب: بیکار کر پڑھنا تو عمدہ ہے دل میں اگر پڑھیں تو مضائقہ نہیں۔ بہتر خاموشی ہے۔ (دماغی دکن پری پرنٹ)۔

مولوی محمد عمر صاحب کی انوکھی دلیل | مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی — فقہاء نے ذکر بالجہر فی الجنازہ مکروہ لکھا ہے (محمد عمر)۔ بحر الرائق ج ۲ ص ۲۱۸ میں مذکور ہے کہ ولا یأمن بمشریۃ المیت شعراً۔ میت کا شعروں میں مرثیہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ تم اپنے جنازہ کے ساتھ فقہاء کی اتباع میں مرثیہ خوانی کر لیا کرو، ہم ذکر کلمہ کر لیا کریں گے۔ (مقیاس خفیت ۵۸۵)

جواب: مولوی محمد عمر صاحب کا تقریر و تحریر میں یہی وہی ہے کہ وہ خاموش نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک کچھ نہ کچھ کہہ دینا یا لکھ دینا ہی جواب تصور ہوتا ہے عام اس سے کہ وہ حقیقت اور نفس اللہ میں جواب ہو یا نہ ہو۔ صاحب بحر الرائق تو یہ فرماتے ہیں کہ شعروں کے اندر میت کا مرثیہ پڑھنا جائز ہے یعنی مُردہ کے دنیا سے چلے جانے پر افسوس اور صدمہ کا ذکر اور مُردہ کے کمالات اور خوبیوں کا تذکرہ درست ہے۔ یہ انہوں نے کب اور کہاں کہا ہے کہ جنازہ کے ساتھ ساتھ مرثیہ پڑھا کر دینا جنازہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا ہے اور یہ حوالہ اس کا ہرگز جواب نہیں ہے۔ یہ ہے مولوی محمد عمر صاحب کا طرز استدلال اور اس کا پس منظر۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں۔ ابن عدیؒ نے کامل میں اور امام زلیحیؒ نے نصب الدرایہ تخریج

احادیث الہدایہ جلد دوم ص ۲۹۲ مطبوعہ مجلس علمی ڈابھیل میں لکھا ہے عن ابن عمر قال لم یکن یسمع من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو دیشی خلعت الجنانۃ الا قول لا الہ الا اللہ مبدیاً ورجعاً اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہو پھر بھی فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ انتہی (جلد الحقی ص ۳۸)

جواب : مفتی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ ضعیف حدیث فضائل اعمال میں معتبر ہے۔ اس کی تحقیق اپنے مقام پر آئے گی (انشاء اللہ تعالیٰ) کہ فضائل اعمال میں کیسی ضعیف حدیث معتبر ہوتی ہے ؛ لیکن یہ تو ضعیف بھی نہیں۔ اس میں خیر سے ایک راوی ہے جس کا نام ابراہیم بن ابی حمید ہے۔ امام ابو نعیم اس کے متعلق فرماتے ہیں۔ کان یضع الحدیث (سان المیزان ج ۲ ص ۲۸) کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ موضوع اور جعلی حدیثوں سے بھی مفتی احمد یار خان صاحب فضائل اعمال ثابت کرتے ہیں۔ رہا مفتی احمد یار خان صاحب کا امام شعرانیؒ، شیخ عبد الغنی نابلسی اور شیخ عثمان بحیریؒ وغیرہ سے جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ذکر کے جواز کے حوالجات نقل کرنا، تو اس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ صوفیوں کا گڑہ ہے اور حل و حرمت میں ان کی بات ہرگز حجت نہیں ہوتی (میدان فتویٰ میں حضرات فقہاء کرام کی بات معتبر ہوتی ہے نہ کہ حضرات صوفیاء کی) اس کا مختصر جواب مفتی صاحب کی زبانی سن لیجئے، وہ کہتے ہیں : ابن حجر شافعی ہیں تو احناف کے مقابل شوافع کے فتوے پر عمل ہوگا ؛ ہرگز نہیں۔ (بلفظہ جابر الحق ص ۳۲ و مشد فی ص ۳)۔ ہم بھی کہہ دیں گے کہ حضرات احناف کے مقابل حضرت امام شعرانیؒ وغیرہ شوافع کی بات پر ہرگز عمل نہ ہوگا، کیونکہ حضرات فقہاء احناف کی صریح عبارات سے اس کی ممانعت ثابت ہے، جیسا کہ باحوالہ بات بیان کر دی گئی ہے۔

قبر پر اذان

جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز جنازہ سے فارغ ہو چکنے کے بعد میت کو قبر میں دفن کیا جائے اور بسم اللہ علی سنتہ رسول اللہ وغیرہ پڑھا جائے، اور دفن کے بعد

سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا بھی احادیث سے ثابت ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں سورۃ فاتحہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ کی قبر پر سبحان اللہ اور الحمد للہ وغیرہ خود بھی پڑھا اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس کی تلقین بھی کی۔ اسی طرح استنصار اور تثبیت کا سوال بھی کیا۔ یہ سب اُمور صحیح اور ثابت ہیں۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر آپؐ نے دعا بھی کی ہے اور اس کا حکم بھی فرمایا ہے۔ لیکن قبر پر اذان کا ثبوت نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ سے۔ اس وقت قبریں بھی ہوتی تھیں، مُردے دفن بھی کئے جاتے تھے اور اذان بھی مٹی اور اذان دینے والے بھی ہوتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس وقت تو اذان علی القبر سنت اور جائز نہ ہوتی، اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد یہ جائز ہو گئی، اور اس کے جواز پر رسالے بھی لکھے جانے لگے۔

اذان ایک خاص عبادت ہے اور اس کے لئے شریعت مقدسہ میں مخصوص مواقع مقرر کئے گئے ہیں۔ ان سے تجاوز کرنا حدود اللہ سے تعدی اور محصیت ہے۔ اگر ایسی ترمیمیں جائز ہوتیں تو عیدین کی نماز کے لئے بھی اذان و اقامت درست ہوتی اور اس کے لئے اذان علی القبر سے بہت زیادہ اور بہت اچھے وجوہ بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بارہ میں تمام حضرات فقہاء کرام متفق ہیں۔ چنانچہ امام غزالیؒ کہتے ہیں :

ومن ذلك الاذان والاقامة في العیدین قد نقل ابن عیبد المبر اتفاق العلماء علی ان لا اذان ولا اقامة فیہا۔ (الاعتصام ص ۴۸)

اور اسی قبیل سے اذان و اقامت عیدین میں امام ابن عبد البرؒ نے تمام حضرات فقہاء کا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ عیدین میں نہ اذان ہے نہ اقامت۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء احناف قبر پر خلاف سنت اُمور کا سختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں چنانچہ امام ابن ہمام الحنفیؒ اپنی بے نظیر تالیف میں لکھتے ہیں کہ :

ویکول عند القبر کل مالہم یعہد من السنۃ والمعہود منها لیس الا زیارتها والدعاء نہ ہو، اور ثابت من السنۃ صرف قبروں کی زیارت ہے اور

عندھا قاضا کما کان یفعل صلی اللہ علیہ وسلم فی الخروج الی بقیع ویقول السلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا انشاء اللہ بکم لاحقون اسأل اللہ لی ولکم العافیة۔

انکے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنا جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جنت البقیع میں جا کر کیا کرتے تھے اور مان فرمایا کرتے تھے سلامتی ہو تم پر اے مومنوں کی بستی میں رہنے والوں اور ہم بھی انشاء اللہ تعالیٰ تم سے ملنے والے ہیں میں اپنے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرتا ہوں۔

(فتح القدیر ج ۲ ص ۱۷۷ طبع مصر)

اور اسی طرح کی عبارت بحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۷ اور در المختار ج ۱ ص ۱۶۱ اور فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۷ وغیرہ میں بھی ہے۔ اس سے بھی صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اذان قبر بلکہ اس قسم کے وہ جملہ رسم جو سنت سے ثابت نہیں، قبر کے پاس مکروہ ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں :

وفی الاقتصار علی ما ذکر من الوارد اشارۃ الی انہ لا یسنّ الاذان عند ادخال المیت فی قبرہ کما ہو معتاد الان وقد صرح ابن حجر فی فتاواہ بانہ بدعة۔ (شامی ج ۱ ص ۱۵۹)

اور (زیادت اور دعا پر) اقتصار کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ میت کو دفن کرتے وقت اذان کہنا جیسا کہ ابھی کل عادت ہو گئی ہے مسنون نہیں ہے، اور امام ابن حجر نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ قبر پر اذان دینا بدعت ہے۔

اور در البحار میں ہے :

من البدع التي شاعت في العهد الاذان علی القبر بعد الدفن۔

ان بدعت میں سے جو (بعض) بلاد ہند میں شائع ہو گئی ہیں ایک دفن کے بعد قبر پر اذان دینا بھی ہے۔

اور توحید شیعہ شرح تنقیح لمحمد ابی حنیفہ میں اس اذان کے متعلق لکھا ہے :

لیس بشیئ۔

یہ اذان کوئی چیز نہیں۔

یہ تمام عبارتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ دفن کے بعد قبر پر اذان دینے کا شریعت مطہرہ میں کچھ سے کوئی ثبوت ہی نہیں۔ یہ خلاف سنت بھی ہے اور بدعت بھی حضرات فقہاء کرام کے احکام کے خلاف بھی ہے اور لیس بشیئ بھی۔ ایک منصف آدمی کے لئے یہ حوالجات بالکل کافی ہیں۔ البتہ مستند کیلئے

کوئی چیز بھی سود مند نہیں ہوتی۔ فریق مخالف کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ بھی سُن لیجئے اور ساتھ ساتھ جوابات بھی دیکھ لیجئے تاکہ حق و باطل میں بخوبی فرق معلوم ہو سکے۔

پہلا اعتراض : مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں : (ان عبارات میں جو دُعا کا ذکر کیا گیا ہے) کہ اذان خود دُعا بلکہ بہترین دُعا ہے کہ وہ ذکر الہی ہے اور ہر ذکر الہی دُعا، تو وہ بھی سنتِ ثابتہ کی ایک فرد ہوتی۔ (ایذان الاجزء ۵)

جواب : خان صاحب کا یہ ارشاد ایک مجددانہ مغالطہ ہے اور کئی وجوہ سے باطل ہے۔
 اولاً اس لئے کہ اگرچہ بعض اعتبارات سے ذکر اور دُعا ایک ہی ہے لیکن عرف میں یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دُعا میں طلب اور سوال پیدا ہوتا ہے اور ذکر اس سے خالی ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ شاطبی لکھتے ہیں :

هو في العرف غيب الدعاء (الاعتصام ج ۲ ص ۲۸۸) ذکر عرف میں دُعا کے علاوہ ہے۔

اور فتح القدیر کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنت البقیع والوں کے لئے جو دُعا کی تھی اس میں عافیت کا سوال تھا اور یہی سنت سے ثابت ہے۔

وثانیاً خود خان صاحب اذان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تو خالص ذکر بھی نہیں (فتاویٰ رضویہ، جلد دوم ص ۵۰۷) تو پھر یہ کیسے صحیح ہوا کہ اذان ذکر الہی ہے اور ہر ذکر الہی دُعا ہے ؟

وثالثاً اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اذان دُعا ہے تو سوال یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین وغیرہ کو یہ بات کیوں سمجھ نہ آئی کہ اذان دُعا ہے، اور قبر پر یہ بھی ہونی چاہئے۔ جب یہ طریقہ ان کو سمجھ نہ آ سکا اور حضرات ائمہ مجتہدین نے بھی اس کو نہ سمجھا، تو کسی دوسرے کی سمجھ کیسے جنت ہو سکتی ہے ؟

سَرِ خدا کہ عارف و زاہد کسے نگفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
 دوسرا اعتراض : مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ بحر الرائق کا یہ فرمانا کہ قبر پر جا کر بخیر زیارت و دُعا اور کچھ کرنا مکروہ ہے، بالکل درست ہے۔ وہ زیارتِ قبور کے وقت فرماتے ہیں یعنی جب

وہاں زیارت کی نیت سے جاوے تو قبر کو چومنا یا سجدہ کرنا وغیرہ ناجائز کام نہ کرے اور یہاں گفتگو ہے دفن کے وقت کی، یہ زیارت کا وقت نہیں۔ اگر وقت دفن بھی اس میں شامل ہے پھر لازم ہوگا کہ میت کو قبر میں اتارنا، تختہ دینا، مٹی ڈالنا اور بعد دفن تلقین کرنا، جس کو فتاویٰ رشیدیہ میں بھی جائز کہا ہے سب منع ہوا (جاء الحق ص ۳۲ و ص ۳۳ بلفظ)

جواب : یہ ہے مفتی احمد یار خان صاحب بدایونی ثم گجراتی کا جواب۔ مگر بات یہ ہے کہ صاحب بحر الرائق وغیرہ نے تو ویکوہ عند القبر کہا ہے ویکوہ فی القبر نہیں کہا۔ میت کو قبر میں اتارنا فی القبر ہے عند القبر نہیں ہے۔ اسی طرح تختہ دینا اور مٹی ڈالنا فی القبر اور علی القبر ہے عند القبر نہیں۔ ہاں البتہ دفن کے بعد تلقین کرنا عند القبر ہے مگر وہ تو والدعا عندھا قائمہ کی مراد میں ہے جو سنت سے ثابت ہے۔ اور زیارت و دعا دفن سے قبل خالی قبر کی کوئی نہیں کرتا۔ مگر یہ یاد رہے کہ تلقین سے سورۃ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھنا مراد ہے۔ جس کا ثبوت حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع حدیث سے ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۱۲۹) اگر یہ موقوف بھی ہو تب بھی مکالمہ فرعون سے اسیلۃ البحر الرائق وغیرہ کے الفاظ ہی اس کو متعین کر دیتے ہیں کہ دفن کے بعد دعا اور زیارت کے علاوہ قبر کے پاس اور جو کچھ بھی کیا جائیگا وہ خلاف سنت ہوگا، سجدہ ہو یا طواف، استسجاد ہو یا اذان وغیرہ، اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں۔

تیسرا اعتراض : (علامہ شامیؒ نے امام ابن حجرؒ کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ قبر کے پاس اذان بدعت ہے) اولاً تو ابن حجرؒ شافعی مذہب ہیں۔ بہت سے علماء جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ اذان قبر سنت ہے اور امام ابن حجرؒ شافعی اس کی تردید کرتے ہیں تو بتاؤ کہ حنفیوں کو مسئلہ جمہور پر عمل کرنا ہوگا کہ قول شافعی پر؟ دوم امام ابن حجرؒ نے بھی اذان قبر کو منع نہ کیا بلکہ اس کے سنت ہونے کا انکار کیا یعنی یہ سنت نہیں۔ (بلفظ جاء الحق ص ۳۲)

جواب : مفتی صاحب نے یہ جو کچھ لکھا ہے نرمی دفع الوقتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان کا ضمیر بھی ان کو ملامت کرتا ہوگا۔ اولاً اس لئے کہ یہی امام ابن حجرؒ (اور امام سیوطیؒ) جو شافعی ہیں مگر مسئلہ میلاد وغیرہ مفتی احمد یار خان صاحب اور ان کی بدعت پسند پارٹی ان ہی سے ثابت کرتی ہے۔

اور اُس وقت اُن کی شافیت پیش نظر نہیں ہوتی۔ وہاں تو ان کی تعریفیں کرتے کرتے قلم کند اور زبانیں خشک ہو جاتی ہیں اور یہاں اس طرح جوش و خروش کا اظہار کیا جاتا ہے ”تو بتاؤ کہ خفیوں کو مسئلہ جہود پر عمل کرنا ہوگا کہ قول شافعی پر؟“

وثانیاً امام ابن حجرؒ نے صرف اس کی سنیت ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ اس کو بدعت بھی کہا ہے۔ چنانچہ خود مفتی احمد یار خان صاحب بحوالہ شامی یہ حوالہ اس طرح نقل کرتے ہیں (ترجمہ بھی مفتی صاحب کا ہے)۔ وقد صرح ابن حجرؒ بانه بدعة وقال اس کو سنت جانے وہ درست نہیں کہتا (جار الحی ص ۳۱) من ظن انه سنة قلم یصب۔

اس سے قبل علامہ شامیؒ کی عبارت یوں ہے کہ :

لا یسن الاذان عند ادخال المیت فی قبره میت کو قبر میں داخل کرتے وقت جیسا کہ اب عادت کہا ہو المعتاد الان (شامی ج ۸ ص ۸۳) بنالی گئی ہے اذان کہنا سنت نہیں ہے۔

امام ابن حجرؒ کی تصریح کے بعد کہ یہ بدعت ہے، یہ کہہ دینا کہ انہوں نے منع نہیں کیا کتنی حیرتناک بات ہے مگر مفتی صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بدعت کے ذریعہ ہی سے تو ہماری گاڑی چلتی ہے ہم اس کو منع نہیں کہتے یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے نا صحیح۔ نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں

وثالثاً درر البہار والے تو خفی ہیں وہ تو شافعی نہیں۔ ان کی بات کیوں روک دی گئی ہے؟ یہی طرح امام ابن عابدین شامیؒ خفی ہیں اور امام ابن حجرؒ کے اس حوالہ کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے کیوں انماض کیا گیا ہے؟

ورابعاً وہ کون سے علماء ہیں جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں جو اذان قبر کو سنت کہتے ہیں۔ ان کا نام اور کتاب کا حوالہ تو تحریر فرمائیے۔ یہ بات آپ نے صیغہ راز میں کیوں رکھ چھوڑی ہے تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو جائے کہ ایسے علماء بھی ہیں (جن میں بعض احناف بھی شامل ہیں) جو اذان قبر کو سنت کہتے ہیں۔ باقی خان صاحب بریلی وغیرہ بدعت پسند مولویوں کی عبارتوں سے صرف اپنے ماؤف دل کی تسکین تلاش کیجئے۔ اہل سنت والجماعت کے لئے ایسے مبتدعین کی بات پر کاکہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی کیونکہ ان

کی بات صرف آپ کو ہی پسند آسکتی ہے مگر نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی
ہمارے اکابر نے تصریح کر دی ہے۔ **الجواب** : قبر پر اذان کہنا خلاف سنت اور بدعت
سینہ ہے جیسا کہ تصریحات فقہار سے ثابت ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۵ ص ۲۸)۔

چوتھا اعتراض : (علامہ محمود طنجیؒ کی توشیح کی عبارت کے جواب میں) مفتی صاحب لکھتے ہیں :
توشیح کا فرمانا لیس ہشتی ہو اس کے معنی یہ نہیں کہ حرام ہے۔ مراد یہ ہے کہ نہ فرض نہ واجب نہ سنت
محض جائز اور مستحب ہے اور اس کو سنت یا واجب سمجھنا محض غلط ہے۔ جو فقہار کہ اس کو بدعت فرماتے
ہیں وہ بدعت جائزہ یا کہ بدعت مستحبہ فرماتے ہیں نہ کہ بدعت مکروہہ۔ کیونکہ بلا دلیل کرامت ثابت نہیں
ہوتی۔ (بلفظ جابر الحق ص ۲۵)۔

جواب : مفتی صاحب کا یہ جواب پچند وجوہ باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ یہ ان کے اس نظم
باطل پر مبنی ہے کہ جواز اور استحباب کے لئے دلیل شرعی ضروری نہیں سمجھتے اور علماء کے قول سے بھی اس کو وہ
صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ جواز اور استحباب بھی شرعی
احکام ہیں اور ان کے اثبات کے لئے بھی دلیل شرعی کی ضرورت ہے۔

وثانیاً مستحب جیسے شرعی حکم کو جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے لیس ہشتی سے تعبیر کرنا اور وہ
بھی محض اپنی غرض فاسد کے تحت، دین کی سراسر بغاوت ہے اور دوسرے مختار کے حوالہ سے قیل یستحب
سے اس پر استدلال کرنا اور پھر لفظ قیل کے متعلق یہ کہنا کہ یہ ضعف کی علامت نہیں، تمام بے بنیاد باتیں
ہیں کیونکہ دین کسی اکیلے دوکیلے عالم کی رائے یا اس کی لغزش کا نام نہیں ہے۔ یہاں جمہور کی نقل و متبہرگی
یا کم از کم معتبر اور مستند عالم کی بات جو با دلیل ہو۔

وثالثاً وہ کون سے حضرات فقہار کرام ہیں جو اذان علی القبر کو بدعت جائزہ یا بدعت مستحبہ فرماتے
ہیں؟ شاید وہ مفتی صاحب کے عالم خیال، صوبہ خواہش اور ضلع غرض فاسد میں آباد ہوں۔ مفتی
صاحب نے ہمارے حاشیہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ لیس ہشتی سے وہ چیز مراد ہوگی جس پر ثواب نہ
ملتا ہو اور لیس ہشتی اباحت پر صادق آتا ہے، اور پھر یہ نتیجہ نکالا کہ : معلوم ہوا کہ لیس ہشتی

مباح کو بھی کہا جاتا ہے (ملاحظہ) تو یہ بھی مفتی صاحب اور دیگر بدعت پسند حضرات کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ وہ اباحت کو دلیل شرعی کا محتاج نہیں سمجھتے۔ واللہ باحوالہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اجابت بھی حکم شرعی ہے اور اباحت بغیر اذن شامع اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل کے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ تمام مغرور کمپانی مفتی صاحب کے لئے بالکل بے سود ہے۔

الحاصل یہ ایک واضح اہدیت حقیقت ہے کہ قبر پر اذان نہ تو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؓ اور تبع تابعینؓ سے اس کا ثبوت ملتا ہے، نہ حضرات مجتہدینؒ سے اس کا جواز منقول ہوا اور نہ فقہاء کرامؒ سے، بلکہ وہ اس کو خلاف سنت اور بدعت کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز خلاف سنت اور بدعت ہو، وہ کیسے جائز اور مستحب ہو سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خان صاحب بریلی وغیرہ اس کو فرد سنت کہتے ہیں۔ مگر اثبات سنت ان کے منہ کی بات کا نام نہیں ہے، یہاں ٹھوس اور صریح دلیل درکار ہے۔

اذان علی القبر کے جواز کے دلائل | قبر پر اذان دینے کے جواز میں متعدد اہل بدعت حضرات نے چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلی نے ایک سالہ لکھا ہے جس کا نام اذان الاجر ہے (جس کا بہترین جواب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے امعان النظر سے دیا ہے) اس میں خان صاحب نے بزم خود پندہ دلیل قائم کی ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: یہ پندہ دلیل ہیں کہ چند ساعات میں فیضِ قدیر سے قلبِ فقیر پر فائز ہو میں (اذان الاجر مکتبہ) مگر ان میں ایک بھی دلیل ایسی نہیں ہے جس سے قبر کے اوپر اذان کا مسئلہ ثابت ہو۔ ان دلائل میں کسی میں اذان کی فضیلت کا ذکر ہے اور کسی میں دُعا اور ذکر کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ کسی میں قبر کے اندر میت کیلئے تثلیث کا سوال ہے، اور کسی میں اس کے لئے تخفیفِ عذاب کا بیان ہے۔ اور کسی میں سُبْحَانَ اللہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ وغیرہ کا قبر پر اثبات ہے۔ کسی میں استعاذہ من الشیطان کی دُعا کا ذکر ہے اور کسی میں تلقین کا۔ کسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اکہم گرامی لینے سے عذاب کے ٹل جانے کا بیان ہے اور کسی میں شیطان کے بھاگ جانے کا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب مسائل اور دلائل اپنے مقام پر حق ہیں اور ان کا

کوئی بھی مسلمان مشکوک نہیں ہے۔ مگر سوال تو صرف یہ ہے کہ کیا معبود اذان آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام و تابعین و تبع تابعین نے قبر پر دی ہے؟ اگر اس کا ثبوت ہے تو لایعنی اللہ بسم اللہ۔ اس دلیل سے یہ مسئلہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ کسی حدیث سے لا الہ الا اللہ کا مجملہ لے لیا اور کسی سے دُود شریف کی فضیلت اخذ کر لی، اور کسی حدیث سے شیطان کے بھاگنے کی بات اخذ کر لی اور کسی سے اذان کی، اور سب کو جوڑ کر اذان ثابت کر دی۔ اس کا نام دلیل نہیں ہے۔ ایسے طرز استدلال سے اسلام میں کیا کچھ ثابت نہیں کیا جاسکتا؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خان صاحب کی سب سے بڑی اور ذہنی دلیل کو جس کو انہوں نے دلائل کی مد میں نمبر اول پر پیش کیا ہے نقل کر کے اس کے متعلق کچھ عرض کر دیں تاکہ آپ کو نمونہ از خروارے کے طور پر بقیہ دلائل کا معیار اور خان صاحب کا گلستانِ دلائل بھی معلوم ہو جائے، اور ان دلائل سے ان کے اختیار کردہ مسائل کا خاکہ بھی اُسٹا منے آجائے۔ اور یقین کیجئے کہ ان کی ہر دلیل انکے دعویٰ کے اثبات سے قاصر اور فی نفسہ غیر مؤثر ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

اک فنّانِ بے شرم سینے میں باقی رہ گئی سوز بھی جاتا رہا جاتی رہی تاثیر بھی

خان صاحب کہتے ہیں کہ دلیل اول وارد ہے کہ جب بندہ قبر میں رکھا جاتا ہے اور سوال نکیرین ہوتا ہے۔ شیطان رحیم وہاں بھی حلال انداز ہوتا ہے اور جواب میں بہکا تا ہے۔ امام ترمذی محمد بن علی نوادر الاصول میں امام اجل سنیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ جب مُردے سے سوال ہوتا ہے کہ تیرا رب کون ہے۔ شیطان اس پر ظاہر ہوتا اور اپنی طرف اشارہ کرتا ہے کہ میں تیرا رب ہوں۔ اس لئے حکم آیا کہ میت کے لئے جواب میں ثابت قدم رہنے کی دعا کریں اور صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ اذان شیطان کو دفع کرتی ہے، اور جب ثابت ہو گیا کہ وہ وقت عیاذاً باللہ مداخلت شیطان لعین کا ہے اور ارشاد ہوا کہ شیطان اذان سے بھاگتا ہے اور ہمیں حکم آیا کہ اس کے دفع کو اذان کہو، تو یہ اذان خاص حدیثوں سے مستنبط بلکہ عین ارشاد شارع کے مطابق اور مسلمان بھائی کی عمدہ امداد و اعانت ہوئی۔ (ایذان الاجرام ص ۳ و ص ۴ بلفظہ ملخصاً)۔

جواب : خان صاحب کا یہ ارشاد ایک خالص مجددانہ مغالطہ اور قلتِ تدبّر کا افسوسناک

مظاہرہ ہے۔ اولاً اس لئے کہ شرعی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی تکلیفی زندگی جس میں اغوائے شیطانی کا خطرہ رہتا ہے موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ قبر میں اغوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی نوادر الاصول کا حوالہ تو چنداں قابل التفات نہیں ہے اس لئے کہ یہ کوئی مرفوع حدیث نہیں بلکہ ایک تابعی کا موقوف قول ہے، اور پھر اس کی سند بھی ذکر نہیں کی گئی اور نوادر الاصول ان کتابوں میں ہے جن میں رطب ویابس سبھی کچھ ہے۔ المراح فی المراح علامہ بدر الدین غزنی (متوفی ۷۸۹ھ) کے حاشیہ میں ہے :

قال السيوطي في الجامع الكبير كل ما عزي
 الى العقيلي وابن عدي والخطيب البغدادي
 وابن عساكر والليث بن سعد وغيرهم فهو ضعيف فيستغنى بالعزو اليها
 عن بيان ضعفه۔

امام سیوطی جامع کبیر میں لکھتے ہیں کہ جو روایت عقیلی اور ابن عساکر اور خطیب بغدادی اور ابن عساکر اور ترمذی اور ان کے علاوہ ایک بڑی جماعت کا ذکر کیا، کی طرف منسوب ہو تو وہ ضعیف ہوگی۔ ان کی طرف روایت کا نسبت کر دینا ہی اس کے ضعف کے لئے کافی ہے اس کے ضعف

(حاشیہ المراح فی المراح ۱۵) کے الگ بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

اگر ان کتابوں میں کوئی روایت باسند ہو اور سند بھی متصل ہو اور راوی بھی تمام ثقہ ہوں اور شذوذ اور علت قادحہ سے بھی محفوظ ہو، تو الگ بات ہے ورنہ ان کی طرف کسی روایت کا منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کی دلیل ہے اور یہی وہ کتابیں ہیں کہ جن سے جملہ اہل بدعت اور خصوصاً خان صاحب بریلی اپنے سب مسائل ثابت کرتے ہیں کیا خوب حال مذہب معلوم اہل مذہب معلوم !

و ثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قبر میں بھی شیطان کا دخل ہوتا ہے اور بعض حضرات صحابہ کرام سے دفن کے بعد کی دعاؤں میں اللھم اجرھا من الشیطان اور اللھم اعذہا من الشیطان اور اس قسم کے جو الفاظ وارد ہوتے ہیں وہ اپنی حقیقت ہی پر محمول ہیں۔ تو عرض یہ ہے کہ بہت سے مقامات

ایسے ہیں جن میں شیطان کا دخل احادیث سے معلوم ہے مگر ان مقامات پر شاید خان صاحب بھی اذان گو گوارا نہ کریں چنانچہ مجمع بخاری ج ۲ ص ۹۴ وغیرہ کتب صحاح میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت یہ دعا پڑھے :

بسم اللہ جَنَّ بِنَا الشَّيْطَانُ وَجَنَّ الشَّيْطَانُ اللہ کے نام سے اے اللہ مجھے شیطان سے بچا اور شیطان کو مار دقتنا (الحديث - بخاری ج ۲ ص ۹۳۵) اس چیز (یعنی اولاد) میں جو توہمیں نے ہم سے الگ رکھ۔
حافظ ابن حجر حضرت مجاہد سے اس کی شرح میں نقل کرتے ہیں کہ :

ان الذی یجامع ولا یستی یلتق الشَّيْطَانُ جو شخص ہمبستری کے وقت یہ عانی نہیں پڑتا تو شیطان اس کے علی احلیلہ الخ (فتح الباری ج ۲ ص ۹۳۵) اگر تناسل پر پٹ جاتا ہے (اور ساتھ شریک ہو جاتا ہے)۔

یعنی اس سے زیادہ نازک مقام شیطان کو بھگانے کا اور کیا ہوگا؟ کیا قبر پر اذان دینے والے حضرات کے نزدیک اس موقع پر بھی شیطان کو بھگانے کا کبھی خیال پیدا ہوتا ہے؟ ان کے نزدیک تو اس موقع پر بھی اذان کم از کم مستحب اور فرد سنت ہونی چاہیے۔ یہاں صرف مسلمان بھائی ہی کی امداد نہیں بلکہ مسلمان بہن کی بھر دی اور امداد بھی ہوگی، اور وہ بے چاری دو گونہ تکلیف سے بھی محفوظ رہے گی بلکہ اور اولاد پر بھی احسان ہوگا کہ شیطان کی فعل اندازی سے وہ بھی محفوظ رہے گی۔ اس موقع پر اذان دینے میں مسلمان بھائی اور بہن اور اولاد کوئی افراد کا بھلا ہے اور نیک آدمی کی اذان کا اثر بھی منفی نہیں لہذا فرق مخالف کے نیک حضرات مریدوں و متقیوں اور شاگردوں کو مشغول بکار ہونے کا حکم دیں اور خود اذان دینے کا فریضہ ادا کریں تاکہ انکی امداد ہو جائے۔ اگر اس موقع پر وہ ایسا نہیں کرتے تو وجہ فرق بیان کریں۔
وثالثاً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

ان هذا الخشوش محتضراً (الحديث) یعنی قضائے حاجت کے مقامات پر شیاطین موجود ہوتے ہیں (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۷۷ و مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۷۷) پس جب تم میں سے کوئی پاخانے جائے تو یہ دعا کر لیا کہے۔

نیز فرمایا :

اللهم انی اعوذ بک من الخبث والنجاس (ترمذی ص ۱۷۷) کہ لے اللہ مجھ سے اور مادہ جنوں اور شیطانوں سے بچا۔
اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ پاخانوں میں شیاطین موجود رہتے ہیں۔ کیا قبر پر اذان دینے والوں نے کبھی اس موقع پر اذان کہنے کو مستحب اور فرد سنت کہا ہے؟ اور اس پر بھی کبھی عمل کیا ہے کہ پیر مولوی اور مفتی صاحب تو قضائے حاجت میں مشغول ہوں اور باوقار مرید اور شاگرد اذان دے کر شیاطین کو بھگا

کی فکر میں ہوں، اور اگر ایسا کرتے ہیں تو خوب، اور اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے؟ بینوا و توجروا۔
 و رابعاً خان صاحب بریلی کے پیش کردہ جملہ فوائد (اور ان سے اخذ کردہ مفتی احمد یار خان
 صاحب کے یہ تمام منافع کہ اذان میں پوری تلقین ہے۔ اذان کی آواز سے شیطان بھاگتا ہے۔
 — اذان سے دل کی وحشت دور ہوتی ہے۔ اذان کی برکت سے غم دور ہوتا ہے۔ اذان کی
 برکت سے لگی ہوئی آگ بجھتی ہے۔ اذان ذکر اللہ ہے اور ذکر اللہ کی برکت سے عذاب قبر دور ہوتا
 ہے اور اذان میں حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور صالحین کے ذکر کے وقت نزول رحمت ہوتا ہے،
 وغیرہ وغیرہ۔ دیکھئے ایذان الاجر اور جہا الحق مکہ ۲۹ تا ص ۳ بلفظ ملقطاً) جناب رسول اللہ صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ کو بھی معلوم تھے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ آپ نے
 مدۃ العمر ایک دفعہ بھی کسی کی قبر پر اذان نہ کہی، نہ اس کا حکم صادر فرمایا، نہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ
 میں سے کسی نے اس پر عمل نہ کیا اور نہ حضرات ائمہ دین میں سے کسی نے یہ راز سمجھا، تو آج چودھویں صدی
 میں کسی شخص کو یہ حق کہاں سے اور کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ اپنی ان بے حقیقت قیاس آرائیوں سے دین
 میں پیوند کاری کرے؟ قبر پر اذان دے کہ مسلمان بھائی کی عمدہ امداد کا یہ جاؤ اور نسخہ جناب نبی
 کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باوجود رؤف اور رحیم ہونے کے اپنی امت مرحومہ کو نہ بتایا اور حضرات
 صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کو بھی یہ نسخہ عجیبہ و مفیدہ معلوم نہ ہو سکا اور حضرات ائمہ مجتہدینؒ
 بھی اس اکسیرِ عظم سے محفوظ رہے اور سلف صالحینؒ بھی اس زود اثر گشتہ کے اثر سے فیض یاب نہ ہو
 سکے تو پھر آج اس نسخہ کو کون پوچھتا ہے؟

اور ہوں گے جو سہیں ان کی جنائیں بے محل ہم کسی کا غم نہ بے جا اٹھا سکتے نہیں
 وخامساً دلائل شرعیہ سے ثابت ہے کہ شیطان لعین اٹھان کا عدوِ مبین ہے، اور ہر وقت
 اسی فکر میں رہتا ہے کہ انسان کو اغوا کر کے اپنا رفیق اور ساتھی بنالے۔ بیداری میں وہ بھلا سچا کہے
 چھوڑتا، وہ تو خوابِ غفلت میں بھی انسان کو پریشان کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اور خواب کی ایک قسم
 تحریف من الشیطان ہے جو اس کی واضح دلیل ہے۔ البتہ بدعت کے قاعدہ کی رو سے لازم ہے کہ دن اور

رات کے مجملہ اوقات میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی عمدہ امداد اس اذان کے ذریعہ کی جاتی ہے، اور سفر و حضر میں اس عمدہ امداد کو فراموش نہ کیا جائے۔ کوئی اس کو پسند کرے یا نہ کرے، یہ کہتے ہوئے اس پر عمل کرنا چاہیے کہ مان نہ مان میں تیرا مہمان! اور یہ کس سے پوشیدہ ہے کہ اسمبلیوں، کلبوں، سنیمائوں، کالجوں، اسکولوں اور دفاتروں میں آج کل جس طرح شیطان کا دخل ہے وہ کسی اور جگہ ہرگز نہیں۔ لہذا اپنے مسلمان بھائیوں کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ ہونی چاہیے، اور پھر حکومت کے فیصلہ کا انتظار کیجئے کہ وہ اس بہمدی کا کیا صلہ تجویز کرتی ہے؟ اور آج کون مسلمان ہے جو اس ناپائیدار دنیا میں وحشت اور غم میں مبتلا نہیں، ہر طرف سے بیچارہ مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے اور وہ کون سنگدل ہے جس کے ماں باپ اور بیٹا یا کوئی عزیز فوت ہو جائے اور وہ غم دالم سے دوچار نہ ہو، اس کی عمدہ امداد اذان کے ذریعہ کیوں نہیں کی جاتی؟ اور سینکڑوں مکانات بعض افراد کی غلطی اور نادانی کی وجہ سے تدارک اُتش ہو جاتے ہیں پھر اذان کے ذریعہ آگ بجھا کر ان بیچاروں کی یہ عمدہ امداد کیوں نہیں کی جاتی؟ یہ بھی کوئی عجیب نسخہ ہے کہ میت کی عمدہ امداد تو اس سے ہوتی ہے اور زندوں کا ہول دل، وحشت اور غم اس سے دور نہیں کیا جاتا، اور نہ تو آتش حسی اس سے بجھائی جاتی ہے اور نہ معنوی (مثلاً حسد، بغض، عداوت وغیرہ) یہ کیا عجیب اور محیر العقول منطق ہے، فیصلہ آپ پر ہے۔

یہاں تک آپ کی تعظیم کر دی اب آگے آپ کے اعمال جانیں

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ | اہل بدعت حضرات کا ایک اصولی مغالطہ ہے جس میں وہ سب کے سب گرفتار ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب کے الفاظ میں وہ مغالطہ یہ ہے کہ بعد از ذکر اللہ سبح و تبخیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے اور جس کی اصل ثابت ہو وہ سنت ہے۔ اس پر زیادتی کرنا منع نہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ حج میں تلبیہ کے جو الفاظ احادیث سے منقول ہیں، ان میں کمی نہ کرے۔ اگر کچھ بڑھا دے تو جانتے ہوئے (ہدایہ وغیرہ) اذان میں تکبیر بھی ہے اور کچھ زیادہ بھی، لہذا یہ سنت سے ثابت ہے (بلفظ جا۔ الحق ص ۳۱)۔

جواب : یہ استدلال بھی سراسر مردود ہے۔ اولاً اس لئے کہ پوری تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا

چکا ہے کہ یہ سب منافع اور فوائد جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام وغیرہم کو معلوم تھے۔ مگر انہوں نے اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی قبر پر اذان نہیں دی۔ لہذا سنت ثابۃ کے مقابلہ میں ایسے خود ساختہ عقلی دلائل برگزیدہ قابل قبول نہیں ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں، کہ وہ عقلیات جو شریعت کے معیار اور میزان پر پورے نہ اترتے ہوں، قابل اعتماد و محل اعتبار نہیں تو ائمہ بود۔ (عجالتہ نافعہ ص ۱)۔

و ثانیاً مفتی احمد یار خان صاحب نے ہدایہ کے حوالہ سے اتنی بات (جو مفید طلب متقی) تو نقل کر دی ہے کہ اگر کچھ بڑھادے تو جائز ہے لیکن صاحب ہدایہ کی دلیل نقل نہیں کی کہ یہ زیادت کیوں جائز ہے؟ صاحب ہدایہ اپنی عادت کے موافق اس مسئلہ کی نقلی دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ :

ان اجلاء الصحابة کابن مسعودؓ وابن عمرؓ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرام مثلاً حضرت ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ و ابی ہریرہؓ زادوا علی الماثور (ہدایہ ص ۲۱) اور حضرت ابو ہریرہؓ ماثور تبلیہ میں کچھ الفاظ زیادہ پڑھتے تھے۔ یہ وہ صحابی ہیں جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت حاضری دینے والے تھے۔ ان کے اس زیادت والے عمل سے یہ ثابت ہوا کہ ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور موجود تھا، ورنہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عمرؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت اور ہدیت کے بدلے کو بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور تنبیہ کو بدعتِ ظلماء اور بدعتِ عظمیٰ وغیرہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جس کی پوری تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اگر ان کے پاس ایسا ثبوت نہ ہوتا تو ہرگز وہ یہ زیادتی نہ کرتے۔

ہم نے جو یہ کہا کہ ان کے پاس ثبوت ہوگا۔ یہ بات محض ہوگا۔ پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حقیقتہً ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں :

والناس یزیدون لبیک ذالمعارج ونحوہ من
الکلام والتبوی صلی اللہ علیہ وسلم یسمع فلا
یقول لهم شیئاً۔ (ابوداؤد ص ۲۵۱ و نصب الرای ص ۱۵۱)

کہ لوگوں نے لبیک ذالمعارج اور اسی طرح کا اور کلام تبلیہ میں زیادہ کیا اور جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُس کو سنا اور اُن کو کچھ نہ کہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے اندر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کی موجودگی میں یہ کلمات حضرات صحابہ کرام زیادہ کرتے تھے، اور آپ نے سُن کر بھی اُن کو منع نہیں کیا تو یہ آپ کی تقریری حدیث ہے (دیکھئے نخبۃ الفکر ص ۱۷ وغیرہ)۔ وہی حضرت ابو ہریرہؓ جن کا حوالہ صاحب ہدایہ نے دیا ہے کہ وہ تبلیغ میں بعض الفاظ زیادہ کیا کرتے تھے، ان سے (نسائی ج ۲ ص ۱۷۱، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵۵) میں علی شرط الشیخین اور اس کے مخلص موارد القامان ص ۱۲۲) یہ روایت آتی ہے کہ وہ زیادت کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو نزہتی ج ۳ ص ۲۵۵ وغیرہ) الغرض جلیل القدر حضرات صحابہ کرام تبلیغ میں زیادت کیا کرتے تھے۔ مگر یہ زیادت آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی اور تقریری حدیث سے ثابت تھی۔ اس پر مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کا قیاس کتنا سراسر باطل اور مردود ہے۔ غرضیکہ کوئی بھی ایسی صحیح اور صریح دلیل موجود نہیں جس سے قبری اذان کا جواز ثابت ہو سکے، چہ جائیکہ وہ فرد سنت ہو۔ اور عرض کیا جا چکا ہے کہ جواز اور اباحت بھی حکم شرعی ہے اور وہ بھی صرف شارح سے ثابت ہو گا اور بس۔

اذان میں انگوٹھے چومنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو پردہ خفا میں ہو اور اُمت کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہو۔ آپ کی ایک ایک ادا، ایک ایک حرکت اور نشست و برخاست غرضیکہ کوئی بھی آپ کا قول و فعل پوشیدہ نہیں۔ اذان جیسی عبادت جو دن میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی تھی اور ہجرت کے بعد تقریباً دس سال مدینہ طیبہ میں آپ کے سامنے ہوتی رہی اور اذان کے کلمات نیز اذان دینے والوں کے نام اور اذان کی جملہ کیفیات احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ مگر کسی بھی صحیح روایت میں اس کا ذکر نہیں کہ اذان سننے وقت انگوٹھے چومنے چاہئیں۔ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نا محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ہی محبت ہے (اور ہر مسلمان کو ہونی چاہیے) تو اذان دینے والے کے منہ کو چومنا چاہیے جس کے مبارک ہونٹوں اور زبان سے یہ مبارک نام نکلا ہے، اپنے انگوٹھے تو ہر وقت

ساتھ ہی رہتے ہیں، نہ تو ان سے آپ کا اہم گواہی صادر ہوتا ہے اور نہ ان پر لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جب اس فعل کا صحیح احادیث سے ثبوت ہی نہیں (اور اذان جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اور خیر القرون میں ہوتی رہی) تو پھر اس کو آج کیسے دین کہا جاسکتا ہے اور کس طرح اس کو شعا دین بنانا درست ہے اور نہ کرنے والا کو کیونکو ملامت کہنا ہوا ہے۔

انگوٹھے چوسنے کے ثبوت میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ اصولی طور پر دو ہیں ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے جب مؤذن کا یہ قول سنا کہ اَنَّ مُحَمَّدًا اَوْسُولُ اللّٰہِ تو اس وقت انہوں نے

قتل باطن الانہ لتین السباحین و مسح اپنے کلمے کی انگلیوں کے باطنی حصوں کو چمکا اور انہوں عینہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم من فعل سے لگایا پس حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا، جو مثل ما فعل خلیلی فقد حلت له شفاعتی۔ شخص میرے اس پیادے کی طرح کہے، اس کیلئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

یہ روایت مسند فروس دینی کے حوالے سے تذکرۃ الموضوعات ص ۳۱۲ اور الموضوعات کبیرہ ص ۱۱۱ میں نقل کی گئی ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصد حسنہ کے حوالے سے جارا الحق ص ۳۱۲ میں نقل کی ہے اور ترجمہ بھی مفتی صاحب ہی کا ہے اور یہ روایت مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس خفیت ص ۱۲ میں بھی نقل کی ہے۔

جواب : علامہ محمد طاہر خاںؒ کہتے ہیں ولا یصح (تذکرۃ الموضوعات ص ۳۱۲) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ علامہ علی قادریؒ، علامہ سخاویؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں لا یصح (موضوعات کبیرہ ص ۱۱۱) کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ جب سرے سے یہ روایت ہی صحیح نہیں تو اس پر عمل کرنے کی کیسے گنجائش؟ اور خود مفتی احمد یار خان صاحب نے امام سخاویؒ سے ولا یصح نقل کر کے اس کا ترجمہ لیا ہے: یہ حدیث پایہ صحیح تک نہ پہنچی (جارا الحق ص ۳۱۲)۔ مولوی محمد عمر صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے تذکرۃ الموضوعات اور الموضوعات کبیرہ کے حوالے سے نقل کئے ہیں۔ لیکن لا یصح کا جملہ بشیر باد سمجھ کر مضموم کر گئے ہیں۔ ٹھ ہے اس علمی خبیثت اور بددیانتی پر۔

منفتی احمد یار خان صاحب کی اُچھ | منفتی صاحب لکھتے ہیں کہ صحیح نہ ہونے سے ضعیف ہونا لازم نہیں کیونکہ صحیح کے بعد درجہ حسن باقی ہے۔ لہذا اگر یہ حدیث حسن ہو تب بھی کافی ہے (جاء الحق ص ۳۸۲) منفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی محدث جب مطلق لا یصح کہتا ہے تو اس کا مطلب اس کے بغیر اور کچھ نہیں ہوتا کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ اگر حدیث حسن ہوتی ہے تو اس کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا یس بھصح بل حسن وغیرہ اس کو تعبیر کرتے ہیں۔ مطلق لا یصح سے حسن سمجھنا قلت فہم کا نتیجہ ہے۔

ایک و ہم اور اس کا ازالہ | حضرت ملا علی نقاری فرماتے ہیں کہ جب اس حدیث کا رفع حضرت صدیق اکبر تک صحیح ہو گیا تو عمل کے لئے یہی کافی ہے کیونکہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے (موضوعات کبیر ص ۷۶)۔ اور یہی دلیل منفتی احمد یار خان صاحب نے جاء الحق ص ۳۸۲ میں اور مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس خفیت ص ۲۲ میں پیش کی ہے۔ لیکن یہ حضرت ملا علی نقاری کا وہم ہے۔ اس لئے کہ اگر واقعی یہ روایت حضرت ابوبکر تک موقوف بھی صحیح ہوتی تب بھی حجت تھی۔ مگر حضرت ابوبکر سے جو روایت منقول ہے وہ مرفوع ہے اور اس کی سند سرے سے صحیح ہی نہیں ہے نہ یہ کہ مرفوع صحیح نہیں۔ پھر یہ کہنا کہ مرفوع صحیح نہیں ہے موقوف صحیح ہے اور عمل کے لئے کافی ہے کیسے صحیح ہوا؟ باقی جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ لا یصح دفعہ یا لا یصح فی المرفوع تو وہ آہن صالح وغیرہ بعض شیوخ کی موقوف روایات کے پیش نظر ہے۔ وہ اگر بالفرض صحیح بھی ہوں تب بھی موقوف ہونے کی وجہ سے حجت نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ابن صالح وغیرہ صحابی بھی نہیں ہیں۔ ملا علی نقاری کا وہم کوئی نئی چیز نہیں، امام عبد اللہ ابن المبارکؒ نے خوب کہا ہے ومن ذالسلو من الوہم (سان المیزان ج ۱ ص ۱۷۱) وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ الا من عصمہ اللہ تعالیٰ۔

ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی تحقیق | منفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جاو کہ یہ حدیث ضعیف ہے، پھر بھی فضائل اعمال میں حدیث ضعیف معتبر ہوتی ہے (جاء الحق ص ۳۸۲)۔

جواب : یہ بھی منفتی صاحب کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ یہ کہہ دینا کہ فضائل اعمال میں ہر قسم کی حدیث غیر مشروط طور پر حجت ہوتی ہے، قطعاً غلط ہے۔ امام قاضی ابن العربی المالکی (المتوفی ۷۵۰ھ) وغیرہ ضعیف

حدیث کے متعلق فرماتے ہیں لا یعمل بہ مطلقاً (القول البدیع ۱۹۵) مطلقاً اس پر عمل صحیح نہیں ہے۔ اور جو عمل کرتے ہیں وہ شرطیں لگاتے ہیں چنانچہ امام ابن دقیق العید (المتوفی ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں :

العمل بالحدیث الضعیف مقید بشرط (امام ۲/۱۶۸) ضعیف حدیث پر عمل کرنا چند شرطوں سے مقید ہے۔

وہ شرطیں کیا ہیں۔ امام سخاوی (المتوفی ۸۰۵ھ) اپنے شیخ حافظ ابن حجر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

ان شرائط العمل بالضعیف ثلاثة الاول

متفق علیه ان يكون الضعیف غیر شدید

فیخرج من افراد من الکذابين والمتهمین

بالکذب ومن فحش غلطه الثاني ان يكون

مندرجات تحت اصل عام فیخرج ما یخترع

بحدیث لا یكون له اصل اصلا الثالث

ان لا یعتقد عند العمل به ثبوته لثلاث

ینسب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما

لہ یقلہ۔ (القول البدیع ۱۹۵)

منسوب نہ ہو جائے جو آپ نے نہیں فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ شرطیں منقود ہوں تو روایت ہرگز قابل عمل نہ ہوگی۔ اور آخری شرط تو

خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہے کیونکہ جو چیز وثوق کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت نہیں،

اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا اور پھر اس کو ثابت ماننا، سنگین جرم ہے اور یہ درجہ اول کی متواتر حدیث

من کذب علی (الحدیث) کے بظاہر خلاف ہے۔

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں کہ :

واما العمل بالضعیف فی فضائل الاعمال

فدعوی الاتفاق فیہ باطلہ نعم ہو مذهب

فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر بالاتفاق عمل

کا دعویٰ کنا باطل ہے۔ ہاں جمہور کا یہ مذہب ہے۔

الجهود لکنہ مشروط بان لا يكون الحديث
ضعيفا شديدا الضعف فان كان كذلك لم
مگر اس میں شرط یہ ہے کہ حدیث سخت ضعیف نہ ہو ورنہ
فضائل اعمال میں بھی قابل قبول نہیں ہے۔

يقبل في الفضائل ايضاً (الآثار المرفوعة في الاخبار الموضوعة من ۱)

افسوس ہے کہ مبتدعین حضرات ایسی حدیثوں کے اثبات کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں،
قوا اسفا! خان صاحب بریلی نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ "حدیث ماننے اور حضور اکرم سید عالم
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے کے لئے ثبوت چاہیئے، بے ثبوت نسبت جائز نہیں (ملفوظ عرفان
شریعت حصہ سوم ص ۲۷)۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ سابقہ شرطوں کے ساتھ فضائل اعمال میں
عمل کرنا جائز اور مستحب ہے لیکن شرط یہ ہے کہ موضوع نہ ہو۔ اگر روایت موضوع ہوگی تو ہرگز قابل عمل
نہ ہوگی۔ حافظ ابن دقیق العید لکھتے ہیں :

وان كان ضعيفا لا يدخل في حيز الموضوع
فان احدث شعرا في الدين منع منه وان
يعني اكرضيف حديث هو بشرطيكه وہ موضوع نہ ہو، تو
اس پر عمل جائز ہے لیکن اگر اس سے دین کے اندر کوئی شعاع
قائم اور پیدا ہوتا ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا ورنہ
اس پر غور کیا جائے گا۔

لیجئے یہاں ایک اور بات بھی محل ہو گئی۔ وہ یہ کہ ضعیف حدیث اس وقت قابل عمل ہوگی جبکہ موضوع
اور جعلی نہ ہو، اور ساتھ ہی وہ دین کا شعاع اور علامت نہ ٹھہرائی گئی ہو۔ اگر دین کی علامت یا شعاع کا خطرہ
ہو تو اس سے بھی منع کیا جائے گا۔ اور اہل بدعت حضرات خیر سے ان چیزوں کو سنت اور خفیت کا معیار
قرار دیتے ہیں اور ان بدعات کو نہ کرنے والوں کو گستاخ اور دغا بی کہتے ہیں، اور ان کے خلاف متیاس
خفیت جیسی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا یہ ضعیف روایتیں کیونکر حجت ہو سکتی ہیں؟
اور علامہ سخاوی لکھتے ہیں :

يجوز ويستحب العمل في الفضائل
والترهيب والترهيب بالحديث الضعيف
کہ جائز اور مستحب ہے کہ فضائل اعمال اور ترہیب و
ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے مگر شرط یہ

مالہریکن موضوعا۔ (القول البدیع ۱۹) ہے کہ وہ موضوع اور جعلی نہ ہو۔

نیز لکھتے ہیں :

واما الموضوع فلا يجوز العمل به بحال (۱۹) بہر حال موضوع حدیث تو اس پر کسی حالت میں عمل جائز نہیں ہے۔
خلاصہ یہ نکلا کہ فضائل اعمال میں ہر ضعیف حدیث قابل عمل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے حضرات
محدثین کے نزدیک چند شرطیں ہیں، اور جو حدیث موضوع اور جعلی ہو اس پر کسی حالت اور کسی صورت میں
عمل جائز نہیں ہے، نہ فضائل اعمال میں اور نہ ترغیب و تہییب وغیرہ میں۔ اب بقائمی ہوش و حواس
سن لیجئے کہ انگلیاں چومنے کی تمام حدیثیں صرف ضعیف ہی نہیں ہیں بلکہ موضوع اور جعلی ہیں۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں :

الاحادیث التي رويت في تقبيل الأنامل
وجعلها على العينين عند سماع اسمه صلى
الله عليه وسلم عن المؤذن في كلمة الشهادة
وه حدیث جن میں مؤذن سے کلمہ شہادت میں آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام سننے کے وقت انگلیاں
چومنے اور آنکھوں پر رکھنے کا ذکر آیا ہے وہ سب کی سب
کلمہ موضوعات استہزاء التقران سیوطیؒ ج ۱ ص ۱۰۷

موضوع اور جعلی ہیں۔

لیجئے اب توجہ ہی ختم ہو گیا۔ مفتی احمد یار خان صاحب کو یہ الفاظ دیکھ کر غور کرنا چاہیے کہ ”الحمد للہ
کہ اس اعتراض کے پیچھے اڑ گئے ہیں اور حق واضح ہو گیا۔“ (بلفظ جارا الحق ص ۳۸۸)۔ پرچھے کس کی دلیل کے اڑ
گئے اور حق کس کی طرف سے واضح ہو گیا ہے ؟ عیاں را چہ بیاں

فلت کے بمیانک ہاتھوں سے تنویر کا دامن چھوٹ چکا

امام سیوطیؒ نے کلمہ موضوعات کے حوالہ کے بعد یہ ضرورت تو نہیں کہ ہم کچھ عرض کریں مگر محض
تکمیل فائدہ کے لئے حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روایت کا ذکر بھی کر دیتے ہیں اسی مضمون کی روایت
حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی منقول ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں :

ثم يقبل ابهاميه۔ (الحديث) پھر اپنے دونوں انگوٹھے چوسے۔

پہلی روایت میں انگوٹھوں کا ذکر نہیں بلکہ شہادت کی انگلیوں (اور ایک روایت میں ابهام

اور سبابت) کا ذکر تھا اور وہ مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ کے باب یا سُرخِی کے مطابق دہتی مکر یہ روایت مطابق ہے۔ یہ روایت موضوعات کبیرہ ۱۷ اور تذکرۃ الموضوعات ص ۳۱ وغیرہ میں ہے اور مفتی احمد یار خان صاحب نے مقاصد حسنہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ (جامع الحق ص ۱۷۳) اور مولوی محمد عمر صاحب نے طحاوی ص ۱۷۳ کے حوالہ سے نقل کی ہے (مقیاس ص ۶۱) لیکن علامہ محمد طاهر اور علامہ علی زرقاری لکھتے ہیں :

بسند فیہ مجاہیل مع انقطاع الخ کہ اس کی سند میں کئی مجہول راوی ہیں، اور سند (تذکرہ ص ۳۱ و موضوعات ص ۱۷) بھی منقطع ہے۔

تو اس ضعیف روایت سے دین کیسے اخذ کیا جاسکتا ہے ؟ امام بیہقی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ
فی هذا الاسناد قوم مجهولون ولم یكلفنا الله
تعالیٰ ان نأخذ دیننا عن لادعہ (کتاب التقرۃ ص ۱۲) مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول راویوں سے اخذ کریں۔
انگوٹھے چومنے کا ایک اور وزنی ثبوت | مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں :

”صدر الافاضل مولائی مرشدی استاذی مولانا الحاج سید محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم فرماتے ہیں کہ ولایت سے انجیل کا ایک بہت پرانا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل بربناس آج کل وہ عام طور پر شائع ہے اور ہر زبان میں اس کے ترجمے کئے گئے ہیں۔ اس کے اکثر احکام اسلامی احکام سے ملتے جلتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے رُوح القدس (نورِ مصطفوی) کے دیکھنے کی تمتا کی تو وہ نور اُن کے انگوٹھوں کے ناخنوں میں چمکایا گیا۔ انہوں نے فرطِ محبت سے اُن ناخنوں کو چُوما اور انگوٹھوں سے لگایا۔ (جامع الحق ص ۱۷۳ و ص ۳۸)۔ مولوی محمد عمر صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور انجیل بربناس کا صفحہ بھی دیا ہے (انجیل بربناس ص ۱) اور عبارت بھی نقل کی ہے جو اغلب ہے کہ انجیل بربناس کی ہی عبارت ہوگی۔ اس میں یہ بھی ہے کہ ”پس آدم علیہ السلام نے مہمت یہ کہا کہ اے پروردگار یہ تحریر مجھے میرے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں پر عطا فرما۔ تب اللہ نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطا کی“ (پھر آگے ہے) تب پہلے انسان نے ان کلمات کو پوری محبت کے ساتھ بوسہ دیا اور اپنی دونوں انگلیوں سے ملا۔ (مقیاس حنفیت ص ۶۱)۔

اب بھی اگر کوئی شخص انگوٹھے نہ پچڑے تو اس کی مرضی۔ یہ تو بقول مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ، قوی حدیثوں اور حضرات صوفیاء کرام اور حضرات فقہاء سے ثابت ہے بلکہ عیسائیوں سے بھی ثابت ہے اور انجیل برنباس کی بین شہادت ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! غیر مسلموں کی بات کو اپنی تائید میں پیش کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اصل چیز کسی معتول طریقہ سے اسلام سے بھی تو ثابت ہو۔ جب انگوٹھے چوڑنے کی سب حدیثیں ہی موضوع اور جعلی ہیں تو پھر اصل کیا اور اس کی تائید کیا؟ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سابق زمانہ میں عیسائیوں کی اقتدار کرتے ہوئے کسی نے اسی انجیل برنباس کو پیش نظر رکھ کر یہ جعلی حدیثیں بنا ڈالی ہیں اور یار لوگوں نے ان کو پتلے باندھ لیا ہے، اور دوسروں سے یوں تحیاط فرماتے ہیں کہ ”انشاء اللہ کہبت کے لئے صحیح حدیث تو کیا، ضعیف بھی نہ ملے گی، صرف یاروں کا اجتہاد اور عداوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔“ (جاء الحق بلفظہ ص ۳۸۸) لا حول ولا قوۃ الا باللہ اعوذ باللہ تعالیٰ، ثم معاذ اللہ تعالیٰ۔

دیکھا آپ نے اہل بدعت حضرات کو کہ دعویٰ کرتے وقت تو گاؤ زبان مگر ثبوت پیش کرتے وقت ریشہ خلی مفتی صاحب کو اس کا علم ہونا چاہیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ترک کرنا بھی سنت ہے اور آپ کا عدم فعل بھی حضرات فقہاء کرام کے نزدیک کہبت کی دلیل ہے اور یہ صرف یاروں کا اجتہاد نہیں بلکہ ان کے پاس سو فیصدی محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے کہ جعلی اور موضوع حدیث قابل عمل نہیں ہے منتہی صاف ہی فرماتیں کہ کیا جعلی اور موضوع حدیث کو تسلیم کرنے اور اس کی ترویج سے عداوت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہوتی ہے یا جعلی حدیث کے انکار سے؟ اس کا جواب مفتی صاحب پر موقوف ہے، جیسا مناسب سمجھیں ارشاد فرمائیں۔

کفتی یا الفی لکھنے کا بیان

میت کو غسل دینے کے بعد اس کو سنت کے مطابق کفن پہنانا احادیث سے ثابت ہے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ بطور تبرک کسی کے کفن میں کوئی کپڑا رکھا جائے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی صلیبزداری حضرت زینب کے لئے اپنا تہبند عطا فرمایا تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ کسی بزرگ سے کوئی کپڑا لے کر اپنے کفن

کے لئے اس کو رکھ لیا جائے جیسا کہ بخاری باب من اعدا الکفن میں اس کے متعلق حدیث آتی ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تبرکات کو اپنی قبروں میں کھولنے کی وصیت اگر بسند صحیح ثابت ہو تو تسلیم کرنے میں کوئی حائل نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک دو نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے فوت ہوئے اور دفن کئے گئے۔ اسی طرح حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ و تبع تابعینؓ کے سامنے بھی ہوتا رہا۔ کفن بھی لوگ مردوں کو پہناتے پتے اور لکھنا بھی جانتے تھے۔ ان کو کلمہ طیبہ بھی ہم سے ہر جہاں زیادہ اچھا یاد تھا اور ان کے دلوں میں اس کی صحیح معنی میں عظمت بھی تھی۔ اسی طرح درود شریف وغیرہ اور تسبیح و تہلیل وغیرہ سبھی کچھ ان کو حفظ تھا، اور ان کو قبر اور آخرت کا صحیح حال بھی معلوم تھا اور اپنے اعزہ و اقارب کا تو ذکر ہی چھوڑ دیتے۔ اہل محلہ میں سے اگر کوئی فوت ہو جاتا تو کسی کسی دن تک وہ اس غم میں مبتلا رہتے تھے کہ خدا معلوم اس کے ساتھ قبر میں کیا ہوا ہوگا؟ الغرض ان میں کامل ہمدردی بھی تھی اور فکر آخرت بھی۔ مع ہذا انہوں نے کفنی وغیرہ نہ لکھی اور نہ اس کا حکم دیا۔ پھر آج وہ کونسا نیا انقلاب رونما ہوا ہے جس کے تحت یہ سب کچھ جائز ہو گیا ہے؟ جائز ہی نہیں بلکہ ضرری بھی ہو گیا ہے۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں :

”لہذا میت کے لئے کفن وغیرہ پر ضرور عہد نامہ لکھا جاوے۔“ (بلفظ جارا الحق ص ۳۲۵)

کفنی اور الفنی لکھنے کے جواز پر جو دلائل پیش کئے گئے ہیں، امام حکیم ترمذیؒ کی نوادر الاصول سے جو مرفوع روایت نقل کی گئی ہے کہ جو شخص اس دُعا کو لکھے اور میت کے سینے اور کفن کے درمیان کسی کاغذ میں لکھ کر رکھے تو اس کو عذاب قبر نہ ہوگا اور نہ منکر نیک کو دیکھے گا (جارا الحق ص ۳۲۲)۔ اسی طرح طاؤس تابعیؒ سے بحوالہ ترمذی مذکور جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کی وصیت کے بموجب ان کے کفن میں یہ کلمات لکھے گئے (جارا الحق ص ۳۲۴) یہ تمام بے حقیقت اور بے اصل باتیں ہیں۔ پہلے امام سیوطیؒ کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ کسی روایت کا حکیم ترمذیؒ وغیرہ کی طرف منسوب کر دینا ہی اس کے ضعیف اور کمزور ہونے کے لئے بالکل کافی ہے باقی جو یہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کے سرکاری مصطل کے گھوڑوں کی رانوں پر جس فی سبیل اللہ لکھا ہوتا تھا، باوجودیکہ گھوڑے کا نجاست میں آلودہ ہونے کا خطرہ بھی رہتا تھا، لہذا میت کے کفن پر لکھنا بھی درست ہے

(جابر الحق ص ۳۲۷) تو یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ سرکاری زندہ گھوڑوں پر نمبر لگانے سے میت کے کفن پر لکھنے کا اثبات مشکل اور دُور کی بات ہے یہی وجہ ہے کہ امام ابن حجر نے اس کو رد کیا ہے۔ باقی انکو شافی کہہ کر انہماض کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیا امام ابن حجر شافعی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غلط قیاس کو باطل کر دیں؟ اگر یہ دلیل اور قیاس صحیح ہوتا تو حضرت عمرؓ کے وقت اور بعد کو خیر القرون میں یہ قیاس لوگوں کو کیوں نہ سوجھا؟ کونسا نیا حادثہ اور مسئلہ درپیش ہوا ہے جس کے لئے یہ قیاس ایجاد کیا گیا ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق صاحب کے والد حضرت سید الدین صاحب جو صوفی مشرب آدمی تھے، ان کی وصیت سے استدلال بھی صحیح نہیں ہے خود شیخ عبدالحق صاحب لکھتے ہیں "مشرب پر حجت نیست دلیل از کتاب و سنت سے باید" (اخبار الاخیار ص ۹۳)۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو حضرات پیشانی اور کفن پر لکھنے کی اجازت دیتے ہیں ان میں بعض اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ روشنائی سے نہ لکھا جائے بلکہ محض انگلی سے لکھا جائے چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب شامی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ :

انّ ممّا یکتب علی جمیعۃ المیت بغير
مداد بالاصبع المسبحة الخ (جابر الحق ص ۳۲۷) دیا جاوے۔

سیاہی وغیرہ سے لکھنے میں چونکہ بے ادبی کا احتمال ہے اس لئے بعض علما نے منع کرنے کی یہ دلیل پیش کی ہے جیسے شاہ عبد العزیز صاحبؒ اور علامہ شامیؒ وغیرہ اور ان کا حوالہ مفتی احمد یار خان صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ جہاں بزرگوں سے قبر میں شجرہ رکھنے کا واقعہ نقل کرتے ہیں اس میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ "برسینہ مرده درون کفن یا بالاسنہ کفن گذارند ایس طریق رافقہا منع مے کنند" (بحوالہ جابر الحق ص ۳۲۷) اس سے معلوم ہوا کہ کفن کے اوپر یا کفن کے نیچے میت کے سینہ پر کسی لکھی ہوئی چیز کا رکھنا حضراتِ فقہانہ کرامؒ کے نزدیک منع ہے۔ ہاں اگر قبر کے سرمانہ میں کوئی طاقچہ ہو اور اس میں رکھا جائے تو حضرت شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ یہ درست ہے۔ لیکن اس سے محلِ نزاع حل نہیں ہوتا کیونکہ جگہ مفتی اور الفی لکھنے کا ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحبؒ کہتے ہیں۔ درختار میں اسی جگہ ایک واقعہ نقل فرمایا کہ کسی نے وصیت

کی تھی کہ اُس کے سینہ پر یا پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ دی جاتے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کیا گزری؟ اُس نے کہا کہ بعد وفات ملائکہ عذاب آئے مگر جب انہوں نے بسم اللہ لکھی ہوئی دیکھی تو کہا کہ تو عذاب الہی سے بچ گیا۔ (بلفظہ جابر الحق ص ۲۲۴)

عذاب الہی سے اور فرشتوں کے جھکڑے سے بچنے کا یہ بہت ہی عمدہ نسخہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ خیر القرون میں کسی کو کیوں نہ سوجھا؟ اور ان کو ایسا مبارک خواب کیوں نہ آیا؟ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ خواب سے دین کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

”اجماع اہل شرع است برآنکہ هیچ حکم از احکام اہل شرع کا اس بات پر اجماع ہے کہ شریعت کے حکموں شریعت بواقعات و منامات امتیان ثابت میں سے کوئی بھی حکم واقعات اور امتیوں کے خوابوں سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ (قرۃ العینین ص ۳۲۲)

غرضیکہ جو کام آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ نے نہیں کیا یا جو دیکھ اس کا سبب موجود تھا، آج بھی اس کے کرنے کی مطلقاً کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی صوفی کا کوئی قول و فعل اور خواب معتبر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی لکھتے ہیں، کہ

”نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، خلیفہ نظام الدین گفتہ است فعل مشائخ حجت نہ باشد۔ (البلاغ المبین ص ۵۵)

منسوب بشاہ ولی اللہ صاحبؒ۔ بعض حضرات نے ان کی کتاب ہونے کا انکار بھی کیا ہے۔

بدنی اور مالی طریقہ پر ایصالِ ثواب کا حکم

جمہور اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ میت کے لئے ایصالِ ثواب درست اور جائز ہے، خواہ بدنی عبادت ہو خواہ مالی ہو۔ البتہ بدنی عبادت میں (مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن کریم وغیرہ) حضرت علیہ السلام سے روایت ہے کہ مرویہ ختم بدعت ہے۔ ہاں اگر خاموشی سے بلا یا صدقہ کیا جائے خصوصاً صدقہ جلدیہ وغیرہ تو اس کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح تلاوتِ قرآن کریم کا بھی انتہی بلفظ (المجیدیت سو بروہ ۸ ستمبر ۱۹۵۹ء ص ۱۷۷)۔ اور ثواب صاحبؒ لکھتے ہیں: ”وہوون ایس تلاوت، محلول از برائے میت قاذب نیست؟“ (وسیل الطالب ص ۳۹۵)۔

امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ اختلاف کہتے ہیں (شرح فقہ اکبر ص ۱۵) و کتاب التمدح مطلقاً وغیرہ) مگر اکثر حضرات شوافعؒ اور حضرات مالکؒ اس مسئلہ میں دیگر آئمہ کا ساتھ دیتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ نے کتاب التمدح از مصنفات مالکؒ میں اس کی نقل اور عقلی طور پر مبسوط بحث کی ہے۔ حق اور اقرب الی القلوب یہی بات ہے کہ بنی اور مالی ہر قسم کی عبادت کا ثواب میت کو پہنچایا جاسکتا ہے مگر اس کیلئے چند بنیادی اور اصولی شرطیں ہیں۔ جب تک وہ نہ ہوں کوئی فائدہ نہیں ہوگا :

- ① میت مؤمن اور مسلمان و صحیح العقیدہ ہو، گو کلتی ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، اور اسی طرح ایصالِ ثواب کرنے والا بھی مؤمن اور مسلمان ہو، ورنہ سب محنت رائیگاں ہوگی۔
- ② ایسی کسی عبادت میں ریا، تلم و نمود و شہرت اور اپنی مصنوعی عزت اور ناک کی حفاظت کا ہرگز سوال نہ ہو ورنہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کا خیال ہی دل میں ہو، اور خیرات من و ادنیٰ سے بھی پاک ہو۔

- ③ جو مال صدقہ و خیرات میں دیا جائے وہ حلال اور طیب ہو، نجیث، ناپاک اور غلول وغیرہ کا غیر طیب مال ہرگز نہ ہو جیسا کہ قرآن کریم، صحیح احادیث اور اقوالِ حضرات فقہاء کرام سے یہ بالکل واضح ہے۔
- ④ جس مال کا صدقہ اور خیرات دی جائے اُس میں کوئی وارث غائب اور نابالغ بچہ نہ ہو، ورنہ اس کا صدقہ کرنا بلا خلاف حرام اور موجب عتابِ خداوندی ہے۔

- ⑤ جو قرآن کریم میت کو پڑھ کر بخش جائے وہ بلا معاوضہ اور بلا اجرت پڑھا جائے۔
 - ⑥ اپنی طرف سے نفل کی اور خاص کیفیتوں کی تعیین نہ کی جائے اور نہ کھانے کے اقسام میں یہ تعیین ہو۔
 - ⑦ یہ کھانا صرف فقراء اور مساکین کو دیا جائے، برادری کو اور اغنیاء کو نہ کھلایا جائے۔
- ان میں بعض ایسے اُمور ہیں جن میں کسی ادنیٰ کلمہ کو کو بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا، اور ان کا ثبوت قرآن کریم اور صحیح احادیث سے بخوبی واضح ہے۔ بعض دعاوی کے اختصاراً دلائل سن لیجئے۔

قرآن کریم میں آتا ہے کہ لَا تَمْنُنُوا الْخَيْثُ اور ناپاک اور ردی چیز اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا يَقْبَلُ اللَّهُ صَدَقَةً مِنْ غُلُولٍ

(ترمذی ج ۱ ص ۱) یعنی اللہ تعالیٰ حرام مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا اور حضرت ملا علی نقاریؒ لکھتے ہیں :
 ولو علم الفقير انه من الحرام ودعا له واامن المعطى كفرا -
 یعنی اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال جو مجھے دیا جا رہا ہے حرام ہے اور اُس نے دینے والے کے حق میں کُفاری اور دینے والے نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو جائیں گے۔
 (شرح فقہ اکبر ص ۲۳۱ کانپوری)

اور یہی عبارت فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۲۹۹ میں بھی موجود ہے -
 امام قاضی خاںؒ لکھتے ہیں :

وان اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اذا كانوا بالغين فان كان في الورثة صغيرا لم يتخذوا ذلك من التركة - (قاضی خاں ج ۴ ص ۴۷۰ نوکشور)
 کہ اگر میت کے ترکہ سے فقرا کیلئے کھانا تیار کر لیا جائے تو اچھا ہوگا جبکہ وارث سب بالغ ہوں اور اگر وارثوں میں کوئی ایک بھی نابالغ ہو تو ترکہ سے یہ کھانا تیار نہیں کیا جاسکتا۔
 اور علامہ شامیؒ لکھتے ہیں :

حدیث جریئہ يدل على الكراهة ولا سيما اذا كان في الورثة صغارا وغائب (شامی ج ۱ ص ۸۴)
 حضرت جریرؓ کی روایت کراہت پر دلالت کرتی ہے خصوصاً جبکہ وارثوں میں چھوٹے بچے یا کوئی وارث غائب ہو۔
 اور ملا علی نقاریؒ لکھتے ہیں کہ :

بل صح عن جرير كذا نعدا من النياحة وهو ظاهر في التحريم قال الغزالي ويكره الاكل منه قلت هذا اذا لم يكن من مال اليتيم والغائب والا فهو حرام بلا خلاف - (مرقات علی مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۸)
 بلکہ حضرت جریرؓ کی حدیث سے ثابت ہے کہ میت کے ہاتھ کھانے کو حضرات صحابہ کرامؓ نہ حرج کی طرح سمجھتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا کھانا حرام ہے سلام غزالیؒ کہتے ہیں کہ ایسا کھانا مکروہ ہے۔ یہیں کہتا ہوں یہ کراہت اس وقت ہوگی، جب کہ میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا غائب نہ ہو ورنہ

یہ بلا اختلاف حرام ہوگا۔

ان عبارات سے یہ بات بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ میت کے وارثوں میں اگر سب ہی بالغ اور حاضر ہوں تب بھی ایسا کھانا مکروہ ہے بلکہ بظاہر حرام ہے، اور اگر میت کے وارثوں میں کوئی نابالغ یا کوئی وارث

”غالباً ورثہ میں کوئی تقسیم یا اور بچہ نہ پانچ ہوتا یا بعض ورثہ موجود نہیں ہوتے، نہ ان سے اس کا اولن لیا جاتا جب تو یہ امر سخت حرام شدید پر متفقین ہوتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّهَا يُكَلِّفُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَهُمْ لَا يَصْلَوْنَ سَعِيرًا۔ بے شک جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں، بلاشبہ وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں اور قریب ہے کہ جہنم کے گہراؤ میں جائیں گے۔ مالِ غیر میں بے اولن غیر تصرف خود ناجائز ہے۔ قال اللہ تعالیٰ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ خصوصاً نابالغ کا مال ضائع کرنا جس کا اختیار نہ خود اسے نہ اس کے باپ نہ اس کے وصی کو۔

لان الولایۃ للنظر علی الخصوص اگر ان میں کوئی یتیم ہو تو آفت سخت تیرے والعیاذ باللہ رب العلمین۔ ہاں اگر محتاجوں کے دینے کو کھانا پکوانیں تو حرج نہیں بلکہ خوب ہے بشرطیکہ یہ کوئی عاقل بالغ اپنے مال خاص سے کرے یا تمکے سے کریں تو سب وارث موجود بالغ و نابالغ راضی ہوں (الحکام شریعت حصہ سوم ص ۱۹)۔ خان صاحب کی یہ عبارت قابلِ داد ہے۔ مگر ان کا یہ مجتہد مخالفہ قابلِ خود ہے کہ جب نابالغ کو اپنے مال کا باقرار خان صاحب خود بھی اختیار نہیں تو پھر بالغ و نابالغ راضی ہوں کا کیا مطلب ہے؟ نابالغ کی رضا کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ احناف نے تصریح کی ہے :

لا تجوز وصية القبي اذا لم يكن
 مرأها عندنا۔ (قاضی خان ج ۴ ص ۸۳)

یعنی نابالغ و لڑکے کی وصیت ہمارے نزدیک جائز نہیں،
 ہے جبکہ مراجع نہ ہو۔

ومیة الصبی باطلہ ۔
 ناپائے کی وصیت باطل ہے ۔

مولوی عبد السمیع صاحب لکھتے ہیں :

”جب کوئی آدمی مر جاوے اور کوئی شخص اس کا عزیز و قریب اپنے خاص مال میں سے اس کے لئے فاتحہ کرے۔ اس میں کسی فتنہ و محدث کو کلام نہیں اور خاص میت کا مال اگر اس کام میں صرف کرنے لگیں تو اس میں

یہ شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں کوئی نابالغ لڑکی یا لڑکا نہ ہو، اس لئے کہ ترکہ بعد مرنے وارث کے ملک وارثوں کا ہو جاتا ہے۔ پس اگر وارث بالغ ہیں تو وہ مال خاص ان کا ہو گیا۔ اگر کوئی وارث ان میں غائب نہیں، سب موجود ہیں یا کوئی غائب تھا اور اس نے اجازت دے دی تو اس صورت میں ان کو اختیار ہے جس قدر چاہیں میت کے لئے صرف کر دیں، اور اگر سب نابالغ ہیں تو ترکہ میت سب ان کی ملک ہو گیا۔ اُس کا صرف کر دینا میت کے ایصالِ ثواب میں جائز نہیں، نہ کپڑا، نہ کھانا، نہ روپیہ نہ پیسہ۔ فقط تجہیز و تکفین میں جو اُٹے وہی درست ہے اور پس۔ اور اگر بعضے وارث نابالغ ہیں تب بھی نابالغوں کا حصہ کل اشیاء ترکہ میں مشرک ہے اس کا صرف کرنا بھی ایصالِ ثواب کے لئے جائز نہیں الخ۔ (انوار ساطعہ ص ۱۲۵)

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ :

”نیز اگر میت کی فاتحہ میت کے ترکہ سے کی ہو تو خیال رہے کہ غائب وارث یا نابالغ کے حصے سے فاتحہ نہ کی جاوے یعنی اقل مال میت تقسیم ہو جائے، پھر کوئی بالغ وارث اپنے حصہ سے یہ امور خیر کرے۔ ورنہ یہ کھانا کسی کو بھی جائز نہ ہوگا کہ بغیر مالک کی اجازت یا بچہ کا مال کھانا جائز ہے یہ ضرور خیال رہے۔“ (جاء الحق ص ۲۵۱)

مگر مفتی صاحب بھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک فیصدی تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں وغیرہ بھی شاید شکل ایسا ہو جس میں شرعی طور پر مال ترکہ تقسیم ہو چکے کے بعد بالغ وارث صرف اپنے حصہ سے یہ صدقہ کرتے ہوں۔ اور کتنے مولوی، حافظ اور پیر ہیں جو تیجہ، ساتواں اور دسواں وغیرہ مجالس میں شریک ہونے سے قبل یہ سوال کر لیتے ہیں، کہ اس ترکہ میں کوئی نابالغ یا غائب وارث تو شامل نہیں اور کیا اس کی شرعی تقسیم ہو چکی ہے یا نہیں؟

تلاوتِ قرآنِ کریم پر اُجرت لینا

قرآنِ کریم کا پڑھنا ایک بہت عمدہ عبادت ہے، اور پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخشا جاسکتا ہے بشرطیکہ ایصالِ ثواب کے لئے جو قرآنِ کریم پڑھا گیا ہو اُس پر اُجرت نہ لی گئی ہو، خواہ اُجرت پہلے

طے کی گئی ہو یا طے نہ کی گئی ہو مگر عرف اور رواج سے یہ معلوم ہو کہ کچھ نہ کچھ اُجرت ضرور طے کی لہذا المعهود کا ملشرطہ اور فقہاء احناف نے اس کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ تاج الشریعت محمود بن احمد الحنفیؒ (المتوفی ۷۶۱ھ) شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں :

ان القرآن لا يستحق بالاجرة الثواب لا للميت ولا للقاري (بحوالہ انوار سالکون) اور علامہ عینی الحنفیؒ لکھتے ہیں کہ :

الاعتد والمعطى اثمان ، فالحاصل ان ماشاع في زماننا من قراءة الاجزاء بالاجرة لا يجوز۔ قرآن کریم کی تلاوت پر اُجرت لینے والا اور فیئہ ملا دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ حاصل یہ کہ ہمارے زمانہ میں جو قرآن کریم کے یا اہل کا اُجرت کے ساتھ پڑھنا رائج ہو چکا ہے، وہ

(بنایہ شرح ہدایہ ج ۱۵۵) جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی پوری تشریح علامہ شامیؒ نے کی ہے ، فلیراجع۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ تلاوت قرآن کریم پر اُجرت لینے کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں : صورتِ اول اگرچہ ثواب قرآن خواندہ خود را بعض مبلغ کثا بدست کسے بفروشد و ایں صورت محض باطل است باجماع اہل سنت الی ان قال صورتِ دوم اگرچہ شخصے مبارکے ختم نمودن قرآن بزورِ بی بگزید و ثواب اں ختم بمستاجر برسد و ایں صورت نزد حنفیہ جائز نیست و نزد شافعیہ طویل و تفصیل دارد (فتاویٰ عزیز ج ۱ ص ۱۷۸)

اور مولانا عبدالحی صاحب نے حضرات فقہاء کرام کے متعدد حوالوں سے یہ امر ثابت کیا ہے کہ اُجرت لے کر قرآن کریم پڑھنا اور تسبیح و تہلیل کرنا باطل ہے۔ اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو۔ (دیکھئے مجموعۃ الفتاویٰ ج ۲ ص ۱۷۸)۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ :

واما قراءة القرآن واهدائها له تطوعا قرآن کریم کا اُجرت کے بغیر پڑھ کر بطور تبرع کے اس کا ثواب

بغیر اُجرۃ فہذا یصل الیہ کما یصل
ثواب الصوم والحج۔ (کتاب الروح ص ۱۷۱)
حضرت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ :

ثم قرأ القرآن واهدائہما له تطوعا بغیر
اُجرۃ یصل الیہ۔ (شرح فقہ اکبر ص ۱۷۱ طبع لاہور)

علامہ صدر الدین علی بن محمد الادریؒ الشافعیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ :

واما استیجار قوم یقرؤون القرآن ویعبدونہ
للمیت فہذا المرید فعلہ احد من السلف ولا
امر بہ احد من ائمتہ الدین ولا سرخص فیہ
والاستیجار عن نفس التلاوة غیور جائز بلا
خلاف۔ (شرح عقیدۃ الطحاویہ ص ۱۷۱ طبع مصر)

بجا معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب بریلوی کا حوالہ نقل کر دیا جائے تاکہ اس پر رجسٹری ہو جائے۔
مسئلہ : بعض لوگ بعد دفن کر مینے میت کے حافظ کو اس کی قبر پر واسطے تلاوت
سوم تک یا کچھ کم و بیش بٹھاتے ہیں اور وہ حافظ اپنی اُجرت لیتے ہیں۔ پس اس طرح کی اُجرت دے کر
قبروں پر پڑھوانا چاہیے یا نہیں ؟ بتینوا تو جروا۔

الجواب : تلاوتِ قرآن عظیم پر اُجرت لینا دینا حرام ہے اور حرام پر استحقاق عذاب ہے ،
کہ ثواب پہنچے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ حافظ کو اتنے دنوں کے لئے معین و اموں پر کام کاج کیلئے نوکر رکھ لیں۔
پھر اُس سے کہیں ایک کام یہ کہ وہ اتنی دیر قبر پر پڑھ آ یا کرے ، یہ جائز ہے۔ (احکام شریعت حصہ اول ص ۱۷۱)

مگر خان صاحب ہی از راہِ کرم یہ فرماتیں کہ یہ طریقہ کون کرتا ہے ؟ اور کہاں ہوتا ہے ؟
مولوی عبدالسمیع صاحب لکھتے ہیں : ” اگر حافظوں کو مزدوری دے کر قرآن پڑھوا دیں یہ البتہ مکروہ
ہے۔ اس کی تصدیق کتبِ فقہ میں موجود ہے الخ۔ (انوارِ ساطعہ ص ۱۷۱)۔ جوہر و تیز و ج ۱ ص ۲ میں ہے

”لا یجوز هو المختار“ یہ جائز نہیں ہے ہی مختار ہے۔ ہمارا شریعت ۱۳۹۰ میں ہے۔ سوم وغیرہ کے موقع پر اجرت پر قرآن پڑھوانا جائز ہے دینے والا لینے والا دونوں گنہگار اور ۱۶۹ میں ہے۔ میت کے گھر و اتہام وغیرہ کے دن دعوت کریں تو ناجائز و بدعت قبیح ہے الخ۔ رسالہ مولانا صاحبؒ بابت ۱۶ اگست و تیسرے ۱۹۰۸ء میں ہے۔ میت کے گھر کا کھانا ناجائز و منوع ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی صاحبؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:-

”پس جو کچھ ملاؤں کو دیا جاتا ہے وہ اجرت ان کے پڑھنے کی ہے، اور جو پڑھائی کر اجرت پر ہوتی ہے اس کا ثواب پڑھنے والے کو ہوتا ہے اور مردہ کو۔ لہذا یہ فعل ان کا باطل اور لینا دینا دونوں حرام اور موجب ثواب کا نہیں بلکہ گناہ ہے۔ مردہ کو اس کا ثواب نہیں ہوتا ہے اور دینے والے اور لینے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ لہذا اس کام کا ترک بھی واجب ہے۔ اگر کو جو اللہ کا ثواب پہنچانا منظور ہے تو ہر شخص اپنے مکان پر پڑھ کر ثواب پہنچا دے اور تیسرے دن کا کیوں انتظار کیا جائے نفس ایصال ثواب کوئی منع نہیں کرتا۔ اگر بلا تین ہو۔ مگر ان قیود و خصوصیات کے ساتھ بدعت بھی ہے اور ثواب بھی نہیں پہنچتا“ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۴۴)

الغرض اس نکتہ پر خان صاحب بریلوی اور مولانا گنگوہی صاحبؒ دونوں متفق ہیں کہ ایصال ثواب کے لئے جو قرآن کریم پڑھا جاتا ہے اُس پر اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں اور ثواب کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اس پر استحقاق عذاب ہے۔ اب جو لوگ اس مسئلہ میں علماء دیوبند کو کھستے ہیں، تو ان کو بغور سوچ لینا چاہیے کہ طعن کس پر ہوگا؟

یوں نظر دوڑے نہ برہمی تان کہ اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

نوٹ ضروری | قرآن کریم کی تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے معاوضہ میں اجرت اور تنخواہ لینا نیز مؤذن، امام و خطیب اور قاضی کے لئے اجرت و تنخواہ لینا جائز ہے۔ حضرات خلفاء راشدینؓ نے اپنے اپنے دور میں ان حضرات کو دینے اور تنخواہیں دیں۔ اگر یہ کارروائی ناجائز ہوتی تو یقیناً حضرات خلفاء راشدینؓ اس کا کبھی بھی ارتکاب نہ کرتے۔ اور حضرات خلفاء راشدینؓ کا عمل اور سنت بقوائے حدیث علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین (الحديث) امت کے لئے مشعل راہ ہے جس سے ان کیلئے کوئی مخلص نہیں ہے۔ امام ابوالقرح عبدالرحمن ابن جوزی اکتبلی (المتوفی ۷۵۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

ان عمر بن الخطاب و عثمان بن عفان کا

يَذْقَانِ الْمَوْذِنِينَ وَالْأَثْمَةَ وَالْمَعْلَمِينَ - اماموں اور معلموں کو وظائف اور تنخواہیں دیا کرتے

(سیرت العمرین لابن جوزئی ص ۱۶۵) تھے۔

امام جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف الزلیعی الحنفی (المتوفی ۷۸۵ھ) نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ معلمین کو وظیفہ دیا کرتے تھے (نصب الراية ج ۴ ص ۱۳)۔ حضرات فقہاء کرام کے وظائف کے متعلق علامہ ابن جوزئی نے تفصیلات نقل کی ہیں اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ کس فقیہ کو کس شہر میں تعلیم فقہ پر مامور کیا گیا تھا (سیرت العمرین ص ۱۶۸)۔ اور نظام العالم والامم ج ۲ ص ۱۵۳ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے قضاۃ (یعنی شرعی طور پر جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والے قاضیوں اور مجسٹروں) کے لئے بھی وظائف اور تنخواہیں مقرر کی تھیں۔ اور کتاب الخراج نقاضی ابی یوسفؒ میں اس کی مزید تشریح موجود ہے اسی میں ملاحظہ فرمالیں۔

امام ابو عبیدہ قاسم بن سلّام (المتوفی ۷۷۲ھ) رقم طراز ہیں کہ :

ان عمر بن الخطاب كتب الى بعض عماله ان اعط الناس على تعلم القرآن (كتاب الاموال ص ۳۱) پڑھنے والوں کا وظیفہ مقرر کرو۔

اس پر بعض عمال نے یہ لکھا کہ بعض لوگوں نے قرآن کریم سیکھنے کی رغبت اور شوق کے بغیر محض وظیفہ حاصل کرنے کی خاطر طالب علم بنا اختیار کر لیا ہے، مگر حضرت عمرؓ نے اس کے باوجود ان لوگوں کا وظیفہ بند نہیں کیا۔ اور علامہ زلیعیؒ باحوالہ تحریر فرماتے ہیں کہ :

ان عمر بن الخطاب كتب الى بعض عماله ان اعط الناس على تعليم القرآن (نصب الراية ج ۴ ص ۱۳) کی تعلیم دیتے اور پڑھاتے ہیں ان کو وظیفہ دو۔

خلیفہ راشد حضرت عمرؓ بن الخطابؓ نے حضرت یزید بن ابی مالکؓ اور حضرت عمارؓ بن محمد اشعریؓ کو بھیجا کہ وہ دیہات میں لوگوں کو دین اور فقہ سکھائیں اور ان کے لئے روزانہ مقرر کیا۔ یزید بن ابی مالکؓ نے تو قبول کر لیا مگر عمارؓ نے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا (كتاب الاموال ص ۲۶) بظاہر ان کی مالی حالت اچھی اور مضبوط تھی اس لئے انہوں نے بلا معاوضہ ہی یہ خدمت انجام دی جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ شہید المال سے وظائف لیا کرتے تھے لیکن حضرت عثمانؓ چونکہ کافی مال دار اور غنی تھے اس لئے انہوں نے

نمائند خلافت میں اپنی خاطر بیت المال پر بالکل بوجھ نہیں ڈالا۔

قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی المالکی (المتوفی ۵۴۳ھ) اس مسئلہ پر بحث اور اختلاف نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ اذان، نماز، قضا اور تمام اعمال دینیہ پر اُجرت لینا جائز ہے، کیونکہ امیر المؤمنین اور خلیفہ ان تمام امور پر اُجرت لیتا ہے (بحوالہ نیل الاوطار ج ۲ ص ۱۸۷ و تحفۃ الاحوذی ج ۱ ص ۱۵۸)۔ حضرت امام نووی الشافعی فرماتے ہیں کہ حدیث واضر جوا لی بسببہ (الحديث) میں تصریح ہے کہ رُقیہ دَم اور جھڑ پھونک پر سودۃ فاتحہ اور ذکر پڑھ کر اُجرت لینا جائز ہے اور یہ بالکل حلال ہے اس میں کوئی کراہت نہیں۔ اور اسی طرح تعلیم قرآن کریم پر بھی اُجرت لینا جائز ہے۔ اور یہی حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک، حضرت امام احمد، حضرت امام اسحاق، حضرت امام ابو ثور اور دیگر حضرات سلف صالحین اور ان کے بعد آنے والے حضرات کا مسلک ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ نے تعلیم قرآن کریم پر اُجرت لینا منع کیا ہے البتہ رُقیہ پر اُجرت لینے کے جواز کے وہ بھی قائل ہیں (شرح مسلم ج ۲ ص ۲۲)۔

ان تمام ثلوس حوالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امام مسجد، مَدُون، قرآن کریم کی تعلیم دینے والا مُعَلِّم اور قاری، فقہ اور دین کی تعلیم دینے والا مَدَس اور اسی طرح فصلِ خصومات کرنے والا قاضی اور جُذُجِ خلیفہ اُجرت اور نخواستہ لے سکتے ہیں اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے حضرات خلفاء راشدین کی طرف سے یہ وظائف اور نخواستہ ان کے لئے مستقر کی گئی تھیں اور اسلامی مملکت میں بیت المال اس بوجھ کا متحمل تھا۔ جہاں بیت المال نہ ہو (جیسا کہ مسلمانوں کی قسمتی سے اس پُرفتن دَرد میں نہیں ہے) تو وہاں اہل اسلام پر لازم ہے کہ وہ یہ بوجھ اُٹھائیں تاکہ تبلیغِ دین کا سلسلہ جاری رہے اور اس طریقہ سے دین کا احیاء ہوتا رہے ورنہ ناموافق ہواؤں میں دین کا یہ چران بکھ جائے گا۔ خدا تعالیٰ اس کو روشن رکھے اور بکھنے نہ دے بلکہ دینی کی آندھیاں تو ہر طرف سے اُٹھ رہی ہیں۔

ہواؤں کا سُرخ بتا رہا ہے ضررِ طوفان آرہا ہے نگاہِ مکنا سفینہ والو اُٹھی ہیں مچیں کہ دھر سے پہلے
مسئلہ اُجرت اور حضرت امام ابو حنیفہؒ حضرت امام نوویؒ کا حوالہ اوپر گزیر چکا ہے اور دیگر بہت سے حضرات فقہاء کرام نے امام الامام حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ (المتوفی ۱۵۰ھ) سے تعلیم قرآن کریم پر اُجرت

لینا مکروہ اور ممنوع نقل کیا ہے۔ انہوں نے کمال و ربح اور تقویٰ کی بنا پر ان دینی امور پر اُجرت لینا منع کیا؟ یا مال دار اور غنی لوگوں کے لئے انہوں نے اُجرت لینا مکروہ کہا؟ یا اس لئے کہ ان دینی کاموں پر اُجرت لینے کو مقصود بالذات سمجھ کر دنیا بٹورنے کا ذریعہ ہی نہ بنالیا جاسے؟ اور یا اس لئے کہ خیر القرون میں نادار اور مفلس خدام دین کو بیت المال سے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے ملتے، اس لئے ان لوگوں کو الگ اُجرت اور تنخواہ لینا مکروہ سمجھا؟ الغرض حضرت امام صاحبؒ کے اس فتویٰ کی بنیاد کئی امور پر ہو سکتی ہے اور انہی کے فتویٰ پر صراحت کرتے ہوئے حضرات متقدمین فقہاء احنافؒ نے اس اُجرت کو مکروہ فرمایا۔ لیکن جب بیت المال کا نظام درہم برہم ہو گیا تو حضرات فقہاء احنافؒ میں متاخرین حضرات کو زمانہ کی اہم ضرورت کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اور پھر انہوں نے متفقہ طور پر جواز کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ امام قاضی خان انصافیؒ فرماتے ہیں کہ:

انما كره المتقدمون الاستيجار لتعليم القرآن وكرهوا اخذ الاجر على ذلك لانه كان للمعلمين عطيات في بيت المال في ذلك الزمان وكان لهم زيادة رغبة في امور الدين واقامة الحسبة وفي زماننا انقطع عطياتهم وانتقصت رغائب الناس في اموال اخررة فلو اشتغلوا بالتعليم بالحاجة الى مصالح المعاش لاحتل معاشهم قلنا بصحة العبادة ووجوب الاجرة للمعلم بحيث لو امتنع الوالد عن اعطاء الاجر حبس فيه اه

بلاشبہ حضرات متقدمین نے تعلیم قرآن کریم پر کسی کو اُجرت دیکر ملازم رکھنا مکروہ سمجھا ہے اور اس پر اُجرت لینا بھی مکروہ قرار دیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں مسکین کے لئے بیت المال میں عطیات مقرر ہوتے تھے نیز امور دین اور بشر فی اللہ کام کرنے میں ان حضرات کی رغبت زیادہ تھی، اور ہمارے زمانہ میں عطیات بھی منقطع ہو چکے ہیں اور آخرت کے معاملہ میں لوگوں کی رغبتیں بھی کم ہو چکی ہیں۔ سو اگر ایسے لوگ ناداری کی حالت میں تعلیم کا شغل جاری رکھتے ہوئے روزی کمانے میں مصروف ہوتے تو ان کی کمائی میں سخت خلل پڑے گا۔ اس لئے ہم نے یہ کہا کہ یہ اجاب صحیح ہے اور معلم کے لئے اُجرت واجب ہے۔

اب اگر تعلیم پانے والے شاگرد کا والد اور موجودہ اصطلاح (فتاویٰ قاضی خان ج ۳ ص ۲۲ طبع نوکلشورنگٹون)

میں مدرسہ، ادارہ اور مہتمم معلم کو تنخواہ دینے سے گریز کرے تو اسے گرفتار کیا جائے گا۔

حضرات فقہاء احنافؒ میں فقیہ النفس ہونے کے لحاظ سے جو مقام امام قاضی خانؒ کا ہے، وہ اہل علم

حضرت سے مخفی نہیں ہے۔

علامہ ابن النجیم الحنفی (الملقب بابی ضیفۃ الثانی) فرماتے ہیں :

لما علی الاختار للفتویٰ فی زماننا فیصوب اخذ الاجور بہر حال ہمارے زمانہ میں فتویٰ کے لئے غتر رقول یہ ہے کہ
للإمام والمؤذن والمعلم والمفتی اھ البحر الرائق ج ۱ ص ۱۵۴ امام اور مؤذن اور معلم اور مفتی کو اجرت لینا جائز ہے۔

اور صاحب ہدایہ بھی یہی تصریح فرماتے ہیں کہ اب فتویٰ جواز پر ہے (ہدایہ ج ۴ ص ۱۵۴)۔ اور اسی طرح

علامہ بدر الدین العینی الحنفی صرح فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو بنیائہ شرح ہدایہ ج ۳ ص ۱۵۵)۔

حضرت فقہار کرام کی ان واضح تصریحات کے بعد مطلقاً حاجت اور ضرورت نہیں کہ ہم اجرت لینے کی ممانعت کے دلائل کا تذکرہ کر کے پھر ان کے تفصیلی جوابات عرض کریں۔ صرف اجمالی طور پر یہ کہہ دینا بھی کافی ہے کہ جن بعض آیات اور احادیث سے عدم جواز اجرت بتعلم قرآن کریم پر استدلال کیا گیا ہے وہ ممانعت میں نص اور متعین المعنی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو محال تھا کہ حضرات غلامہ راشدین اور حضرات ائمہ ثلاثہ اور جمہور علماء کرام اور متاخرین حضرات فقہاء احناف اس کے خلاف فتویٰ صادر کرتے کیونکہ قرآن کریم کی وہ آیات اور احادیث ان کے پیش نظر بھی تھیں اور احادیث اس سلسلہ کی اکثر و بیشتر ضعیف ہیں۔ اور اگر بعض صحیح ہیں تو حضرت امام بیہقی وغیرہ نے ان کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے (ملاحظہ ہو مسلح النیر ج ۳ ص ۲۲۱ للفریادی) قائمہ : کسی بیمار اور مصیبت زدہ وغیرہ پر قرآن کریم پڑھ کر یا تعویذ لکھ کر اجرت لینا جائز ہے۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵ وغیرہ کی یہ روایت ان احق ما اخذتہ علیہ اجرا کتاب اللہ (او کما قال کر یا و ما تناسب وہ چیز جس پر تم اجرت لو، کتاب اللہ ہے) اس کی دلیل ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس سے رقیہ اور جھاڑ پھونک وغیرہ پر اجرت لینا مراد ہے، ایصالِ ثواب پر اجرت لینا مراد نہیں ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :

المراد الوقیۃ لا التلافیۃ (فتاویٰ ج ۲ ص ۱۹)۔ اس سے مراد جھاڑ پھونک ہے۔ تلاوت نہیں ہے۔

علامہ عزیزیؒ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ جھاڑ پھونک پر قرآن کریم کی تلاوت پر اجرت لینا جائز ہے۔

(السترار النیر ج ۱ ص ۱۸۵)

ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین

میت کے لئے دعا اور استغفار کرنا اور صدقہ و خیرات دینا اور بلا اجرت کے قرآن کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا، اسی طرح نفل نماز و روزہ اور حج وغیرہ سے میت کو ثواب پہنچانا جائز اور صحیح ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کیلئے شریعتِ حق نے دنوں اور تاریخوں کی کوئی تعیین و تخصیص نہیں کی ہے۔ اور پہلے باحوالہ یہ گزر چکا ہے کہ اپنی طرف سے ایسی تعیین کرنا بدعت ہے۔ دلائل اربعہ میں سے کوئی دلیل اس پر دال نہیں ہے کہ ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ضروری ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسم مسلمانوں نے اہل ہندو سے لی ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تعیین ہے۔ چنانچہ مشہور مؤرخ علامہ بیرونی (المتوفی ۴۵۸ھ) لکھتے ہیں کہ اہل ہندو کے نزدیک جو حقوق میت کے وارث پر عائد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ضیافت کرنا اور یومِ وفات سے گیارہویں اور پندرہویں روز کھانا کھلانا، اس میں ہر ماہ کی چھٹی تاریخ کو فضیلت ہے۔ اسی طرح اختتامِ سال پر بھی کھانا کھلانا ضروری ہے۔ نو دن تک اپنے گھر کے سامنے طعام بچھتے و کوزہ آب رکھیں ورنہ میت کی رُوح ناراض ہوگی اور بھوک و پیاس کی حالت میں گھر کے ارد گرد پھرتی رہے گی۔ پھر عین دسویں دن میت کے نام پر بہت سا کھانا تیار کر کے دیا جائے اور آبِ تنک دیا جائے اور اسی طرح گیارہویں تاریخ کو بھی۔ نیز لکھا ہے کہ ماہِ پوس میں وہ حلوا پکا کر دیتے ہیں اور یہ بھی ہے کہ برہمن کے کھانے پینے کے برتن بالکل علیحدہ ہوں (کتاب الہند ۲ و ۲۸۷ محصلہ)۔ اور یہی کچھ برائے نام مسلمان کرتے ہیں کہ حلوا اور پانی بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور تلا جی کے برتن بھی الگ ہوتے ہیں اور دنوں کی تعیین بھی کی جاتی ہے خصوصاً دسویں گیارہویں اور اختتامِ سال کے بعد سالانہ عرس۔ مشہور نو مسلم عالم (جو پہلے پنڈت تھے) مولانا عبید اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ — ”برہمن کے مرنے کے بعد گیارہواں دن اور کھتری کے مرنے کے بعد تیرہواں دن اور دیش یعنی بننے وغیرہ کے مرنے کے بعد پندرہواں یا سولہواں دن اور شودر یعنی بالہبی وغیرہ کے مرنے کے بعد میواں یا اکتیسواں دن مقرر ہے۔ ازاں جملہ ایک چھ ماہی کا دن ہے یعنی مرنے کے بعد چھ مہینے، ازاں جملہ برسی کا دن ہے اور ایک دن گائے کو بھی کھلاتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک دن سدھ کا ہے مرنے کے مرجانے سے چار برس

پیچھے، ازاں جملہ اسوج کے بیچنے کے نصف اول میں ہر سال اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچاتے ہیں لیکن جس تاریخ میں کوئی مرا، اُس تاریخ میں ثواب پہنچانا ضرور جانتے ہیں اور کھانے کے ثواب پہنچانے کا نام سراج ہے، اور جب سراج کا کھانا تیار ہو جائے تو اول اس پر پخت کو بڑا کر کچہ بید پڑھواتے ہیں۔ جو پخت اس کھانے پر بید پڑھتا ہے وہ ان کی زبان میں ابھشمرن کہلاتا ہے، اور اسی طرح اور بھی دلی مقرر ہیں۔ (بلفظ تحفۃ الہند ص ۹)۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (المتوفی ۱۳۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں خاص یہ رسم سیوم کی ہے۔ اور کسی ولایت میں کوئی جانتا بھی نہیں سویہ ہنود کے نتیجہ کر دیکھ کر وضع ہوئے (ابراہیم القلم ص ۱۱) اور یہی کچہ کلمہ گو مسلمان کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پخت کی جگہ ختمی ملانے سے لی جے اور کھانے پر بید کی جگہ قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ افسوس اور صد افسوس کہ ان تمام غیر اسلامی رسموں نے اسلامی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس پر تنقید کرنا گویا اسلام پر تنقید کرنا ہے اور یہ سب کچہ ہندوستان میں اگر ہوا فلاسفا! مع وہ بدلا گیا آ کے ہندوستان میں

میت کے گھر اجتماع اور کھانا پکھنے کا بیان

حدیث اور فقہ کی عبارات اس پر شاہد ہیں کہ جب کسی کی وفات ہو جائے تو اس کے گھر والے چونکہ صدمہ میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اہل محلہ اور رشتہ دار اہل میت کا کھانا تیار کریں اور جو نادر جنازہ میں شریک نہ ہو سکا ہو وہ تعزیت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن میت کے گھر اجتماع اور اہل میت کا لوگوں کیلئے کھانا تیار کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے اور بہت سے علاقے اس قبیح حرکت کا شکار ہو کر مقروض ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات سود پر قرض لیا جاتا ہے اور اس طرح وارثوں کا اور خصوصاً یتیموں کا مال برباد کیا جاتا ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ (المتوفی ۱۷ھ) فرماتے ہیں کہ،

کُنَّا نَوِيَّ الْجَمَاعَةِ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنْعَةِ
الطَّعَامِ مِنَ النِّسَاحَةِ (ابن ماجہ ۱۱۷۲۱ و مسند احمد ۱۱۷۲۱)
ہم (یعنی حضرات صحابہ کرام) میت کے گھر جمع ہونے کو اور
میت کے گھر کھانا تیار کرنے کو نہ جانتے تھے۔

اور مفتی الانخيار ص ۱۲۲ میں وصنعة الطعام بعد دفنة من النياحة کے الفاظ آئے ہیں۔

مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ میت پر آواز کے ساتھ رونا، بین اور نوحہ کرنا اہل جاہلیت کا کام ہے اور نوحہ کرنا جمہور سلف و خلف کے نزدیک حرام ہے۔ اسی طرح میت کے گھر کا کھانا بھی سمجھا جائے۔ یہ روایت دو طریق سے مروی ہے۔ علامہ بیہقیؒ ایک سند کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے اور دوسری کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ۴ ص ۱۰۰)۔ حافظ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۷۴)۔ علامہ حلبیؒ لکھتے ہیں۔ باسناد صحیح (کبیری ص ۱۷۱)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کے گھر اجتماع کرنا اور وہاں کھانا تناول کرنا حضرت صحابہ کرامؓ کے نزدیک نوحہ جیسا ایک جرم تھا اور اس پر اجماع و اتفاق رہا ہے ضرورت تو نہیں مگر حضرات فقہاء کرامؒ کی عبارات بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ یہ مسئلہ بھی بین طور پر سامنے آجائے۔

علامہ ابن امیر الحاج المالکیؒ (الملتقى ص ۳۷۸) لکھتے ہیں کہ :

اما اصلاح اهل الميت طعاماً وجمع الناس فلم ينقل فيه شيء وهو بدعة غريبة مستحبة (مغل ج ۲ ص ۲۵۵)
اہل میت کا کھانا تیار کرنا اور لوگوں کا جمع ہونا اس میں کوئی چیز منقول نہیں ہے بلکہ یہ بدعت غیر مستحبہ ہے۔
نیز لکھتے ہیں کہ :

مما حدثه بعضهم من فعل الثالث للميت وعملهم الاطعمة فيه حتى صار عندهم كانه امر معمول به (مغل ج ۳ ص ۲۵۵)
بعض لوگوں نے یہ بدعت نکالی ہے کہ میت کے نتیجہ پر طعام تیار کرتے ہیں، اور یہ ان کے نزدیک معمول کا نام بن گیا ہے۔

امام ابن حجر مکیؒ شافعیؒ سے سوال کیا گیا کہ :
عمّا يعمل يوم ثالث من موته من تهئية اكل و اطعام الفقراء وغيرهم وعمّا يعمل يوم السابع الا جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ :
میت کے تیسرے دن فقراء وغیرہ کیلئے جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اور اسی طرح ساتویں دن، اس کا کیا حکم ہے ؟

سے امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نوحہ کی حرمت پر اجماع ہے (شرح مسلم ج ۱ ص ۳۰۲)

جميع ما يفعل منها ذكر في السؤال من سوال میں جتنی چیزیں ذکر کی گئی ہیں، وہ سب کی سب البدع المذمومة (فتاویٰ کبریٰ ج ۲ ص ۱۷۱) بدعات مذمومہ ہیں۔

علامہ محمد بن محمد بنی حبلی (المتوفی ۷۷۷ھ تسلیتہ المعاصرت ۱۱۹۷ھ) اور امام شمس الدین بن قدامہ حبلی (المتوفی ۶۸۲ھ شرح مقنع الکبیر ج ۲ ص ۲۷۱ میں) اور امام موفق الدین بن قدامہ حبلی (المتوفی ۷۷۷ھ) لکھتے ہیں، واللفظ :
 فاما صنع اهل الميت طعاما للناس فمكروا لان فيه زيادة على مصيبتهم و شغلا لهم الى شغلهم وتشبيها بصنع اهل الجاهلية (مغنی ج ۲ ص ۲۷۱)

کہ اہل میت جو لوگوں کے لئے کھانا تیار کرتے ہیں وہ مکروہ ہے کیونکہ اس میں اہل میت کو مزید تکلیف اور غل میں مبتلا کرنا ہے نیز اس سے مشرکین اہل جاہلیت کے ساتھ مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں کہ :
 مذهبنا ومذهب غیونا کالشافعیۃ والحنابلۃ الخ (ج ۱ ص ۸۴) ہمارا اور حضرات شوافع اور حضرات حنابلہ کا یہی مذہب ہے۔

چونکہ ہمیں ایک ایسے طبقے سے واسطہ پڑ چکا ہے جو خود کو حنفی کہلاتا ہے اسلئے ہم فقہ حنفی کی چند عبارتیں پیش کرتے ہیں تاکہ ان کو کلمہ حضرات فقہاء احناف کے نظریہ کو سامنے رکھ کر خود فکر کا موقع مل سکے۔
 فقہاء احناف کثر اللہ تعالیٰ سواؤہم کے نزدیک میت کے جس طرح دوسرے مساک کے گھر سے طعام کھانا تیجہ، ساتواں اور چالیسواں وغیرہ کرنا۔
 حضرات فقہاء کہ ائم نے ان سے کما انکار کیا ہے، اسی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر حضرات فقہاء احناف نے ان کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ طاہر بن احمد الحنفی لکھتے ہیں کہ :

ولایباح اتخاذ الضیافة عند ثلاثة ايام لان الضیافة یتخذ عند السرور (مختار التاوی ج ۲ ص ۳۷۷) کہ اہل میت کی طرف سے تین دن تک ضیافت مباح نہیں ہے کیونکہ ضیافت خوشی کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔
 صوبہ سرحد اور اسی طرح بعض دیگر علاقوں میں یہ بدعت رائج ہے کہ میت کو دفن کر چکے کے بعد پہلی رات

عموماً سب گاول کی بلا امتیاز روٹی پکائی جاتی ہے۔ جس کو وہ لوگ اپنی زبان میں نماشاں، شومر اور ٹٹھی وغیرہ کہتے ہیں۔ اس میں امیر بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر گوگوں کو چال گئی اور کھانڈ سے تواضع کی جاتی ہے۔ اس عبارت میں اسی کھانے کو حضرات فقہار کرام نے غیر مباح بھی کہا ہے اور مکروہ و بدعت مستقر بھی۔ صد افسوس ہے کہ بڑے بڑے علماء بروار مولوی بھی اس قبیح ترین بدعت میں مبتلا ہیں۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا ومن جمیع البدعات۔

امام قاضی خان لکھتے ہیں :

ویکروا اتخاذ الضیافة فی ایام المصیبة لانہا ایاام
تاسفت فلا یلیق بہا ما کان للفر (فتاویٰ غلیہ ص ۸۸)
یعنی مصیبت کے دنوں میں ضیافت کرنا مکروہ ہے کیونکہ جو
کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے مناسب نہیں ہے۔
اسی کے قریب قریب عبارت فتاویٰ سراجیہ ص ۷۷ میں ہے۔

حافظ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ :

ویکروا اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل
الہیت لانه شرع فی السرور لا فی الشور
وہی بدعة مستقبحہ (فتح القدیر ج ۱ ص ۱۷۷)
اور علامہ قسستانی لکھتے ہیں کہ :

ویکروا اتخاذ الضیافة فی ہذا الایام وکذا
اکلہا کما فی حیدرة الفتاویٰ (جامع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۷)
ان دنوں میں میت کے گھر کھانا تیار کرنا مکروہ ہے کیونکہ طعام کھانا تو بڑی
ہیں جیسا کہ حیدرة الفتاویٰ میں مذکور ہے۔
فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ :

ولا یباح اتخاذ الطعام ثلاثة ايام کذا فی
التتارخانیہ۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۷۷)
تین دن تک میت کے گھر میں کھانا تیار کرنا مکروہ ہے
ایسا ہی فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے۔

اور امام حافظ الدین محمد بن شہاب کہ درمی الخنفی لکھتے ہیں کہ :

ویکروا اتخاذ الضیافة ثلاثة ايام واکلہا
تین دن تک ضیافت مکروہ ہے اور اسی طرح اس کا کھانا

بھی کیونکہ ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے اور پہلے دوسرے اور تیسرے دن طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے، اور اسی طرح ہفتہ کے بعد اور عیدوں کے موقع پر بھی اولیٰ طرح موسم بموسم قبول کی طرف طعام لے جانا بھی مکروہ ہے اور قرأت قرآن کے لئے اور صلح اور قرار کو جمع کر کے ختم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے و علیٰ ہذا القیاس سورۃ انعام یا سورۃ اخلاص کی قرأت کے لئے طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے۔ معاصرین یہ ہے کہ قرأت قرآن کے وقت کھانے کے لئے طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

اسی مضمون کی عبارت شامی (ج ۱ ص ۱۷۷ طبع مصر) میں بھی ہے اور علامہ علی متقی کا یہ حوالہ کہ ان هذا الاجتماع فی اليوم الثالث خصوصاً لیس فیہ فوضیۃ الا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ ملاحظہ ہو: ملا امام نووی شرح منہاج میں لکھتے ہیں کہ:

قبر پر تیسرے دن اجتماع کرنا اور گلاب اور اگ کی بتیاں تقسیم کرنا اور مخصوص دلوں کے اندر روٹی کھلاتا، مثلاً تیتجمہ، پانچواں، نواں، دسواں، بیسواں اور چالیسواں دن اور چھٹا مہینہ اور سال کے بعد، یہ سب کے سب اُمور بدعت منوعہ ہیں۔

حضرت ملا علی القاری، حضرت جہانگیر بن کلیب کی روایت کو نقل کرتے وقت یہ بھی لکھتے ہیں کہ: ہمارے مذہب (حنفی) کے حضرات فقہار کرام نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ میت کے پہلے اور تیسرے دن اور اسی طرح ہفتہ کے بعد طعام تیار کرنا مکروہ ہے۔

لہٰذا مشر و عہد السرد ویکو اتخاذ اطعام فی اليوم الاول والثالث و بعد الاسبوع والاعیاد ونقل اطعام الی القبر فی المواسم واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن و جمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة مسورة الانعام او الاخلاص فالخاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لاجل الاحمل یکرہ۔ (فتاویٰ ہزازیہ ج ۴ ص ۸۷ طبع مصر)

الاجتماع علی مقبرة فی اليوم الثالث وتقسیم الورد والعود والطعام فی الایام المنصوصة کالثالث والخامس والتاسع والعاشر والعشرين والربعین والشهر السادس والستة بدعة ممنوعة (بحوالہ انوار ساطعة ص ۱۰)

قرہ اصحاب مذہبنا من انه یکرہ اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث و بعد الاسبوع۔ (مرقات ج ۵ ص ۲۸۲)

ان عبارات میں اس امر کی پوری صراحت موجود ہے کہ میت کی وجہ سے دلول کی تخصیص کے لئے کھانا پکانا (اور خصوصاً تیسرے، دسویں اور چالیسویں وغیرہ دلول میں بدعت اور مکروہ ہے اور ایسے کھانے سے بہر حال پرہیز کرنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا مکمل نوٹی لکھتے ہیں :

”شیخ عبدالحق محدث دہلوی در جامع البرکات سے نو لیسواً و آٹھ بعد سالے یا ششماہی یا چہل روز دیں دیار پزند و در میان برادران بخشش کنند و اک را بمجاہی میگویند چیزے داخل اعتبار نیست بہتر آنست کہ نہ خوردند۔ انتہی (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۱۷۱)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ :

”و عادت نبوکہ برائے میت جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند بر سر گورد و غیر اُن و اِس مجموع بدعت است نعم برائے تعزیت اہل میت و جمع و تسلیہ و صبر فرمودن ایساں راستت و مستحب است اما اِس اجتماع مخصوص روز سوم و از کتاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامی بدعت است و حرام۔“ (ماریج النبوت ج ۱ ص ۱۷۱ طبع نولکشور)

شیخ صاحب موصوف نے شرح سفر السعادت ص ۱۷۱ اور اشعة اللمعات ج ۱ ص ۱۷۱ میں بھی اسی طرح لکھا ہے اور شیخ الاسلام کشف الظہار میں لکھتے ہیں کہ :

”آنچہ متعارف شدہ از پختن اہل مصیبت طعام را در سوم و قسمت نمودن اُن میان اہل تعزیت و اقربان غیر مباح و نامشروع است و تصریح کردہ بدل در خزائن چہر شریعت نبوت نزد سرور است و نزد شرف۔“

اور قاضی شمس اللہ صاحب پانی پتی لکھتے ہیں کہ :

”بعد مردن من رسوم و نیروی مثل دہم و ہتم و چہلم و ششماہی و بر سنی پیچ کنند۔“ (وصیت نامہ ص ۱۹۱)

اور حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب نقشبندی (المتوفی ۱۰۸۰ھ) لکھتے ہیں کہ :

(سوال ششم) آنکھ طعام بروح میت بروز سوم و دہم و گل دادن روز سوم از کجاست؟ (مخدوم)

طعام دادن للہ تعالیٰ بے رکن و ربا و ثواب اُن را بمیت گزارانیدن بسیار خوب است و عبادت بزرگ اما

تیسرے وقت اصل معتمد علیہ ظاہری شہور روز سوم گل دادن بمرداں بدعت است۔ (مکتوبات، مکتوب علامہ)
حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

”دیگر از عاداتِ شنیعہ مامردم اسراف است در ماتمبا و سیوم و چہلم و شمشاہی و فاتحہ سالیانہ
و ایں ہمہ را در عرب اقل و جود نبود مصلحت اُن است کہ غیر تعزیت و ارثان میت تا سہ روز و اطعام
شال یک شب و روز رکعے نباشد۔“ (تغیبات ج ۲ ص ۲۴۶ و وصیت نامہ مثلاً)

اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت (المتوفی ۸۸۵ھ) کے ملفوظات میں ہے کہ:
”اس زمانہ میں سیوم کے روز میت کی زیارت کے واسطے شربت و برگ و میوہ لے جاتے ہیں اور
کھاتے ہیں۔ اور فرمایا کہ صندوق لے جاتے ہیں اور سیپارہ خوانی کرتے ہیں یہ مکروہ ہے (اللہ المظلوم ص ۸۷)
اور علامہ محی الدین برکلی نقشبندی الحنفی (المتوفی ۹۸۸ھ) لکھتے ہیں کہ:

”انی بدعات میں سے ایک یہ ہے کہ موت کے دن یا اس کے بعد ضیافتِ طعام کی وصیت کرنا اور
قرآن و کلمہ پڑھنے والوں کو پیسے دینا یا قبر پر چالیس روز تک یا کم و بیش ایام تک آدمی بٹھانا یا قبر پر قبہ
بنانے کی وصیت کرنا یہ سب امور منکرہ ہیں۔“ (طریقہ محمدی صفحہ آخری)

حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ مرید خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی حقیقی (المتوفی فی حدود
۱۲۵۸ھ) قبور کی زیارت کے لئے بھی از خود دنوں کی تعیین (مثلاً تیسرے یا ساتویں روز) کو بدعت شمار
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میدان زیارت سنت است لیکن زیارت روز و شب
معبود سیوم ہفتے داں بدعتے میکن حذر (تحفہ نصائح)
اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی (المتوفی ۱۲۸۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

”مقرر کردن روز سوم و غیرہ بالتخصیص و او را ضروری انگاشتن در شریعت محمدیہ ثابت نیست
صاحب نصاب الاقتساب (مولانا ضیاء الدین محمد بن محمد بن عوض سنہامی الحنفی معاصر حضرت شیخ
نظام الدین اولیاء المتوفی ۷۵۳ھ) اُن را مکروہ نوشتہ و راہ تخصیص بگذارند و ہر روز یکہ خواہند ثواب

بروحِ میت رسانند۔ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۷۷)۔

قارئین کرام! آپ نے جماعت احناف کثر اللہ تعالیٰ سوادہم کے ذمہ دار حضرات فقہاء کرام اور حضرات صوفیاء عظام کی عبارتیں ملاحظہ کر لی ہیں کہ وہ میت کے گھر کھانا تناول کرنے، سووم، دہم، چیلیم اور برسی وغیرہ کو بدعت اور مکروہ (بلکہ بعض حرام) کہتے ہیں۔ مگر صد افسوس ہے کہ فریقِ مخالف کی گنگا ہی اُلٹی ہے۔ جو حضرات یہ بدعات نہیں کرتے، ان کو وہ دہائی وغیرہ کے خطابات سے نوازتے ہیں، اور عوام الناس کو ان کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ فوا اسفا!

لطیفہ: فریقِ مخالف کے اعلیٰ حضرت نے یہ وصیت فرمائی ہے کہ۔ حتی الامکان اتباعِ شریعت نہ چھوڑو، اور میرا دین و مذہب جو میری کتب سے ظاہر ہے، اُس پر مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اللہ توفیق دے۔ (وصایا شریف ص ۷)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا دین اور مذہب شریعتِ اسلامی سے جدا ہے اور اس دین پر جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے، مضبوطی سے قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ شریعتِ حقہ کا اتباع تو حتی الامکان بتایا مگر ان کا مذہب اور دین اپنا نامہر فرض سے اہم فرض ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! اور بات بھی صحیح ہے کیونکہ عقائد سے لے کر اعمال تک اور عبادات سے اخلاق تک خان صاحب کا دین و مذہب شریعتِ اسلامی سے بالکل جدا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، یا زندہ صحبت باقی! لیکن فاتحہ کے سلسلہ میں خان صاحب کے اتباع سے گزارش ہے کہ ان کی وصیتِ شریفہ پر عمل کر کے ثوابِ دارین حاصل کریں اور اس گرانی اور مہنگائی میں ان لذیذ چیزوں کا خوب لُطف اٹھائیں۔

خان صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اعزہ سے اگر لطیف خاطر ممکن ہو تو فاتحہ میں ہفتہ (میں) دو تین بار ان اشعار سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز اگر چہ چھینیس کے دودھ کا ہو، مَرخ کی بریانی، مَرخ پلاؤ خواہ بھری کا، شامی کیباب، پراٹھے اور بالائی، فیرینی، اُرو کی دال مع ادک و لوازم، گوشت بھری کچوریاں، سیب کا پانی، انار کا پانی، سوڈے کی بوتل، دودھ کا برف اگر روزانہ ایک چیز ہو سکے یوں کر دیا جیسے مناسب

جانو، مگر بطیب خاطر۔ میرے لکھنے پر مجبور نہ ہو۔ انتہی بلفظ (وصایا شریف ص ۱۱)

فریق مخالف کو اعلیٰ حضرت کی اس ندین وصیت پر عمل پیرا ہو کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہیے۔ مولوی محمد عمر صاحب نے اپنی کتاب مقیاس حقیقت میں اس مضمون کی مستقل سُرخیوں قائم کر کے امت محمدیہ پر کرم خوانی کی ہے: فضیلتِ دودھ، فضیلتِ حلوا و شہد، فضیلتِ گوشت اور پراٹھا وغیرہ، پھر کیوں عوام الناس اس پر عمل نہ کریں کہ ہم خردا ہم ثواب۔ مگر مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ نے فضیلتِ جہاد پر کوئی سُرخ قلم نہیں کیا لیکن یہ بیچارے جہاد تو کیا کریں گے۔ تحریکِ ختم نبوت میں ان کی اکثریت عامرہ اسطین کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ یہ صرف کھانے پینے کے مجاہد اور شیریں جہاد اور حق گوئی سے ان کی کیا نسبت؟

تجھے طعام سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو طعام خواہ ہے مگر صاحبِ جہاد نہیں (اقبال تہذیب) اگر فریق مخالف خان صاحب کی سابق وصیت پر عمل نہ کر سکے اور مختلف اشیاء تیار کرنے اور مہیا کرنے سے عاجز ہو تو ان کے دوسرے فتوے پر عمل کرے تاکہ اس کی تلافی ہو جائے، اور نہیں تو کم از کم بڑھیا دادی کے سوم پر ہی ایسا کر لیا کریں تاکہ اس گرانی کے وقت پیاری نانی بھی ساتھ ہی یاد آجائے۔

خان صاحب لکھتے ہیں: مسئلہ: میت کے سوم کا کس قدر وزن ہونا چاہیے۔ اگر چھوٹا روں پر فاتحہ ولادی جائے تو ان کا کس قدر وزن ہو؟ الجواب: کوئی وزن مقرر نہیں اتنے ہوں جس میں ستر ہزار عدد پورا ہو جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ انتہی بلفظ (عرفان شریعت حصہ اول ص ۲)

اگر شریعت نے وزن مقرر نہیں کیا تو خان صاحب کو عرفان شریعت کا یہ زرین نسخہ کہاں سے حاصل ہوا ہے؟ سچ فرمایا انہوں نے کہ ان کا مذہب و دین ان کی کتابوں ہی سے ظاہر ہوگا اور جس پر قائم رہنا ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ اگر فی چھوٹا ایک تولہ ہو تو ستر ہزار کا وزن اکیس من اور سینتیس سیر ہوگا، اور اگر چھ ماشہ فی چھوٹا ہر وزن ہو تو ستر ہزار کا وزن دس من اور ساٹھ سینتیس سیر ہوگا اور قابل استعمال چھوٹا ہر چھ ماشہ سے کیا کم ہوگا؟ اگر چھ روپے سیر بھی چھوٹا رہے ہوں تو دس من اور ۲ سیر کی قیمت تقریباً چوبیس سو روپے سے اوپر ہوگی۔ ایسے دو سوم تو کیا ایک بھی اس زمانہ میں اچھے خاصے

چودھریوں اور نوابوں کو بھی نانی یاد کرا دے گا اور دادی جی تو مفت میں یاد آجائیں گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو اعتراضات فریق مخالف کی طرف سے کئے جاتے ہیں، ہم ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

فریق مخالف کا پہلا اعتراض | فریق مخالف کا کہنا ہے کہ میت کے گھر سے کھانا ناجائز اور مکروہ نہیں ہے کیونکہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۴۷ میں ایک حدیث آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ایک میت کو دفن کیا اور اس سے فارغ ہوئے تو:

استقبلہ داعی امواتہ: میت کی بیوی کا ایک قاصد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کھانے کی دعوت دینے آیا۔ علامہ حلبی (کبریٰ ص ۶۰۱ اور صغریٰ ص ۳۱۰) اور ملا علی بن القاری (مرقات ج ۵ ص ۴۸۸) میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ میت کے گھر سے کھانا درست ہے۔ ورد آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم برگزیدہ کھاتے۔ (انوار ساطعہ ص ۱۹۰ محصلہ)۔

الجواب: اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ امواتہ کا نسخہ صاحب مشکوٰۃ کا وہم یا کسی کاتب کی غلطی ہے۔ اصل الفاظ داعی امواتہ ہیں کہ کسی عورت کے قاصد نے آپ کو دعوت دی تھی۔ باقی داعی امواتہ (کہ میت کی بیوی کے داعی نے دعوت دی) یہ غلط ہے۔ چنانچہ یہی روایت ابو داؤد ج ۲ ص ۱۱، مشکل الآثار ج ۲ ص ۱۳۷، مختصر ص ۱۶۹، شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۳۲۱، دارقطنی ج ۲ ص ۵۴۷، مسند احمد ج ۵ ص ۲۹، سنن الکبریٰ ج ۶ ص ۹، عقود النجواہر المنیفة ج ۲ ص ۲۱۱، خصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۱۰۱، مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۳۲، محلی بن حزم ج ۷ ص ۴۱۵، عون المعبود ج ۳ ص ۲۴۹ اور بنیل الجہود ج ۲ ص ۲۳۹ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے لیکن ان تمام میں امواتہ کے الفاظ ہیں اور یہی صحیح ہے امواتہ کا کی ضمیر کے ساتھ جو میت کی طرف راجع ہے، غلط ہے۔

وثانیاً جن حضرات نے امواتہ کے الفاظ کو پیش نظر رکھا ہے انہوں نے دیگر جوابات دیے ہیں

لے مولوی عبد الباقی صاحب کا اس امواتہ والی روایت کو مرفوع قرار دے کر حضرت جریرؓ کی کٹافند (الحديث) کو موقوف کہہ کر اس کو رد کرنا (دیکھئے انوار ساطعہ ص ۱۱) فن حدیث سے بالکل بے خبری ہے۔

کسی نے کہا کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ اور۔ بعض نے ریکیہ تاویلات کے تحت میت کے ہاں سے کھانا تناول کرنے کو درست کہا۔ اور فریق مخالف کے اعلیٰ حضرت خان صاحب بریلوی نے یہ جواب دیا کہ اس عورت نے آپ کو پیٹے دعوت دی تھی، وقت موعود پر تقدیراً اس کا خاتمہ فوت ہو گیا۔ بنا بریں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہاں کھانا تناول کرنا وفات کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سابق وعدہ کی بنا پر تھا۔ اور خان صاحب نے ملاحی ان تقاری اور علامہ حلبی کی تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے (دیکھئے احکام شریعت حصہ سوم از ص ۱۹ تا ص ۱۹۷) راقم الحروف کے نزدیک پہلا جواب ہی متعین ہے کہ میت کے گھر کھانا تناول ہی نہیں کیا گیا۔ اصل الفاظ ہی امرأۃ ہیں نہ کہ امواتہ۔

اور جن حضرات نے اس روایت سے استدلال کیا ہے ان کا مدار ہی لفظ امواتہ ہے۔ علاوہ بر جب حضرت ملاحی ان تقاری نے اصل حقیقت کا جائزہ لیا تو اپنی آخری تصنیف میں اس سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے شرح نقایہ ج ۱ منکلا میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ میت کے ہاں کھانا تناول کرنا مکروہ اور بدعت مستحبہ ہے۔

خان صاحب بریلوی نے حضرت ملاحی ان تقاری اور علامہ حلبی کی عبارت کے مفصل جوابات دینے کے بعد کیا خوب ارشاد فرمایا کہ: اگر فاضل حلبی اور ملاحی ان تقاری ہمارے دیار کا رسم و رواج دیکھتے تو غمی کی ان دعوتوں پر خرمیت طبعی کا حکم لگاتے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی اجازت دینے میں شیطان مردود کے لئے ایک دروازہ کھول دینا ہے اور مسلمانوں اور بالخصوص نادار مسلمانوں کو سخت مصیبت میں ڈال دینا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ہم کو صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھے والحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد و آلہ اجمعین۔ (احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۹۷۔ مترجم)۔

دوسرا اعتراض مولوی عبد السمیع صاحب اور مفتی احمد یار صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ ان عبارات میں تیجہ، دسواں اور چالیسواں وغیرہ کرنے کی جرمانہ آئی ہے وہ اپنے مہانوں اور رشتہ داروں کی ضیافت کر رہے ہیں۔ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر ہزار کیلئے کھانا تیار کیا جائے تو اچھا ہے۔ نیز شاہ ولی اللہ صاحب

گرام کا ارشاد ہے اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں۔

مولوی احمد رضا خان صاحب دوسرے تیسرے اور چالیسویں دن کے اجتماع اور عورتوں کے کھانے پینے اور چھالیا وغیرہ کے اہتمام کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

اولاً یہ دعوت خود ناجائز و بدعت شنیعہ و قبیحہ ہے۔ امام احمد اپنے مسند اور ابن ماجہ سنن میں سید مصحح حضرت جریر بن عبد اللہ مکی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کنافہ الاجتماع الی اهل الميت ومنعهم الطعام من التیاحۃ۔ ہم گروہ صحابہ اہل میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرانے کو مٹانے کی نیاحت شمار کرتے تھے، جس کی حرمت پر متواتر حدیثیں مطلق۔ الی ان قال امام بزاز: ویزید فرماتے ہیں یکرۃ اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعدها المسبوع یعنی میت کے پہلے یا تیسرے دن یا ہفتہ کے بعد جو کھانے تیار کرائے جاتے ہیں سب مکروہ و ممنوع ہیں (بلغظ احکام شریعت حصہ سوم ص ۱۹۱) نیز مولوی احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں کہ ”شریعت میں ثواب پہنچانا ہے، دوسرے دن ہونا خواہ تیسرے دن باقی یہ تعین عرفی میں جب چاہیں کریں، انہیں دنوں کی گنتی ضروری جاننا جہالت ہے و بدعت۔ (مجموع فتاویٰ قلمی مؤلف احمد رضا خان صاحب ج ۴ ص ۱۲۱، کتاب الخطر والاباحتہ)۔

نیز خان صاحب لکھتے ہیں کہ اگر یہ سمجھتا ہے کہ ثواب تیسرے دن پہنچتا ہے یا اس دن زیادہ پہنچے گا اور روز کم، تو یہ عقیدہ بھی اس کا غلط ہے (الحجتہ الفاکرہ ص ۱۱۱)۔

اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کا مسئلہ حق ہے مگر ایصالِ ثواب کے لئے دنوں کی تخصیص اور تعین ضروری جاننا گویا ہی کیوں نہ ہو، جہالت اور بدعت ہے۔

تیسرا اعتراض | فریق مخالف کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہوئی تو تیسرے دن حضرت ابوذرؓ نے مجھریں، دودھ اور جو کی روٹی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے رکھی اور آپ نے ان پر سورۃ فاتحہ اور قل ہوا اللہ پڑھ کر دعا فرمائی اور حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو اور فرمایا کہ ان اشیاء کا ثواب میرے تحت جگہ ابراہیم کو پہنچے۔ اس روایت سے ایک تو تہجہ کا ثبوت ہوا، اور دوسرا کھانا سامنے رکھ کر اس پر تم کئے کا ثبوت ہوا۔ فریق مخالف کا بیان ہے

کہ یہ روایت حضرت ملا علی قاریؒ نے کتاب اور جندی میں تحریر فرمائی ہے۔

الجواب : مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں کہ :

کہ کتاب اور جندی از تصانیف ملا علی قاریؒ است کہ نہ تو کتاب اور جندی حضرت ملا علی قاریؒ کی تصنیف و نہ روایت مذکور صحیح و معتبر است ، بلکہ موضوع و میں سے ہے اور نہ یہ روایت صحیح اور معتبر ہے بلکہ یہ ضعیف باطل برائے اعتماد نشاید در کتب حدیث نشانے اور باطل روایت ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ از چھ روایت یافتہ نکلے شود۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس قسم کی روایت کا کوئی

(مجموع فتاویٰ، ج ۲ ص ۷۷) نشان موجود نہیں ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ ”انوار ساطعہ مشرق اور حاشیہ خیرات الروایات میں ہے، کہ حضور علیہ السلام نے امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ اور سال بھر بعد صدقہ دیا۔ یہ تیجہ ہشماہی اور برسی کی اصل ہے (بلفظ جارا الحق ص ۲۵)۔

مگر مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی موضوع اور جعلی روایات سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ حدیث جب پیش ہو تو صحیح سند کے ساتھ ہو یا معتبر حضرات محدثین کرامؒ سے اس کی تصحیح ہونی چاہیے محض روایت یا حدیث کا نام لے لینا کفایت نہیں کرتا۔

فائدہ : عوام الناس میں جمعرات کے دن صدقہ و خیرات کرنے کی بھی ایک رسم جاری ہے۔ لیکن اس کی بھی شریعت میں کوئی اصل نہیں ہے۔ خان صاحب بریلوی سے کسی نے یوں سوال کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں دنخت پر شہید مرد ہیں اور فلاں طاق میں شہید مرد رہتے ہیں۔ اُس دنخت اور اُس طاق کے پاس جا کہ جمعرات کو فاتحہ شیرینی اور چاول وغیرہ پر دلاتے ہیں الخ۔ خان صاحب لکھتے ہیں :

الجواب : یہ سب واهیات و خرافات اور جاہلانہ حماقات و بطالات ہیں، ان کا ازالہ لازم

ما نزل اللہ بہا من سلطان۔ (بلفظ احکام شریعت حصہ اول ص ۷)۔

جب یہ امر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ بلکہ خیر القرون سے ثابت نہیں ہے اور حضرات فقہاء کرام اس کو بدعت کہتے ہیں اور بقول خان صاحب بریلوی یہ بے کار بات ہے اور بقول مولوی محمد صالح صاحب ہندوستان کے بغیر کسی اسلامی ملک میں یہ رسم جاری اور رائج نہیں، تو اس کو ضروری سمجھنا اور اہل السنۃ اور خفیت کی علامت قرار دینا اور نہ کرنے والوں کو وہابی کہنا اور ملامت کرنا، یہ کہاں کا انصاف اور دیانت ہے؟ بلکہ قرین قیاس و انصاف یہی بات ہے کہ ہندوستان میں یہ رسم ہندوؤں سے ماخوذ ہے۔ وہ کھانے پر بید پڑھتے تھے، اور کلمہ گو مسلمان قرآن پڑھتے ہیں۔ وہاں پٹت یہ کام کرتے تھے اور یہاں حافظ جی اور میاں جی یہ کارروائی کرتے ہیں۔

منفی احمد یار خان لکھتے ہیں کہ کھانے کو سامنے رکھ کر دعا کی تو کوئی خرابی ہے۔ اسی طرح قبر کے سامنے کھڑے ہو کر دعا پڑھتے ہیں۔ (جاء الحق ص ۲۵۵)۔

مگر اس پر مطلقاً غور نہ کیا کہ جنازہ اور قبر کو سامنے رکھ کر دعا کرنے کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ سے ثبوت ہے۔ لیکن ایصالِ ثواب کے لئے کھانا سامنے رکھ کر اس پر کچھ پڑھنے کا ہرگز ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ بدعت ہے اور بقول خان صاحب بیکار بات ہے۔ اور بدعت بے کار اور لایعنی کام میں ضرور حرج ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ بیکار امر اور فعل عبث حرام ہوتا ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا یہ حوالہ نقل ہو چکا ہے کہ ”وہر چیز کہ برآں ترغیب صاحب شرع و تعیین وقت نباشد آں فعل عبث است و مخالف سنت خیر الانام و مخالف سنت حرام، پس ہرگز روانہ باشد“۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۹۱)۔

چٹائی اور پھوڑی بچانا

جب کسی کا کوئی عزیز و قریب فوت ہو جائے تو اُس کی تعزیت کرنا اور صبر کی تلقین کرنا مسنون امر ہے مگر صرف اسی حد تک جس تک شریعت حقہ سے ثابت ہے۔ مسجد میں ہو یا گھر میں، تین دن تک تعزیت کی اجازت ہے۔ لیکن گلیوں اور کوچوں میں اور گھروں کے سامنے بیٹھنا اور چٹائیاں اور دریاں

وغیرہ بچا کر حقتہ سدا کر بیٹھ جانا یہ تمام امور بدعات ہیں۔ ان سے اجتناب اشد ضروری ہے۔ چنانچہ امام فخر الدین عثمان بن علی الزلیعی الحنفی (المتوفی ۷۴۲ھ) لکھتے ہیں کہ:

ولا بأس بالجلوس لها الى ثلاثة ايام
من غير ارتكاب محظور من فرش البسط
والاطعمة من اهل الميعة لا نهاتخذ
عند السرور۔ (تمییز التقاتیل ۲/۲۷ طبع مصر)
تغزیت کے لئے تین دن بیٹھنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن
اس کیلئے خاص اہتمام سے چٹائی اور دسی دیکھائی جائے
کیونکہ یہ امر ممنوع ہے اور نہ میت کے اہل سے کھانا تناول
کیا جائے اس لئے کہ یہ باتیں خوشی کے وقت کی ہیں مگر غمی کی
اور فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ:

ولا بأس لاهل المصيبة أن يجلسوا في
البیت او المسجد ثلاثة ايام والناس يأتونهم
ويهنونهم ويكوه الجلوس على باب الدار
وما يفعل في بلاد العجم من فرش البسط
والقيام على قوارع الطريق من اقمع القبايح۔
(عالمگیری ج ۱ ص ۱۷ طبع مصر)
اہل مصیبت کیلئے مسجد میں یا گھر میں تین دن تک لوگوں کی
تغزیت کیلئے بیٹھنا کوئی حرج کی بات نہیں لوگ آئیں اور
تغزیت کے چلے جائیں اور مکروہ ہے کہ وہ گھر کے دروازہ پر
بیٹھیں اور سلک بچم کے شہروں میں جو یہ کارروائی کی جاتی ہے کہ
لوگ چٹائیاں اور دریاں بچھاتے ہیں اور راستوں کے درمیان
بیٹھ جاتے ہیں تو یہ قبیح ترین حرکت ہے۔

اور شیخ عبدالحق محیرث دہلوی لکھتے ہیں کہ:

”وشستن برادر، یا برادر برائے عزائم مکروہ است اشد کراہت از جہت بودن آن عمل جاہلیت (الی
ان قال) کہ تغزیت کہ بایں کیفیت کہ الآن متعارف است و در ایام متعده کنند نبوء۔ (شرح سفرائ عادت ص ۱۷)
ان عبارات سے بخوبی یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ تغزیت کے لئے جو طریقہ آج کل اختیار کیا جاتا ہے کہ
گلیوں میں اور دروازوں پر چٹائیاں اور دریاں بچھا کر تغزیت کے لئے بیٹھتے ہیں۔ یہ قبیح ترین حرکت ہے
اور اشد مکروہ ہے کیونکہ اہل جاہلیت کی رسم ہے اور حضرات سلف صالحین میں یہ طریقہ ہرگز رائج نہ تھا۔
علاوہ بریں جو لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوئے ہوں، اُن کے لئے تغزیت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جنازہ
پڑھنے کی وجہ سے میت کا حق ادا ہو گیا، الایہ کہ کوئی بزرگ ہستی اور صاحب اثر شخصیت ہو جو اہل میت کے

صبر کی تلقین کرنے کی غرض سے دوبارہ حاضر ہو تو الگ بات ہے۔

مولوی محمد عمر صاحب نے مقیاس حقیقت $\frac{۵۱۶}{۵۱۵}$ میں جس روایت سے پھوڑی کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ صرف مولوی محمد عمر صاحب کا ہی کام ہے۔ اس روایت میں اشارۃً بھی پھوڑی کا ذکر نہیں ہے اور نہ اس کا پھوڑی سے دور کا واسطہ ہے۔ محض تعزیت کی روایت سے مولوی محمد عمر صاحب کا پھوڑی پر ثبوت مہیا کرنا سراسر باطل ہے۔

فائدہ : میت کے لئے ہاتھ اٹھا کر دُعا کرنا بھی جائز ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دفع یدِیہ ثمر قال اللہ عذرا لعبد ابی عامر بناری ج ۲ ص ۱۱۹ و مسلم ج ۲ ص ۲۱۱ حضرت عبید الو عامر کے لئے اُن کی وفات کی خبر سن کر ہاتھ اٹھا کر اُن کے لئے دُعا مانگی تھی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب (المتوفی ۱۲۱۲ھ) فرماتے ہیں کہ تعزیت کے وقت ہاتھ اٹھا کر دُعا کرنا ظاہراً جائز ہے (مسائل اربعین ص ۳) اور قبر پر بھی ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے (دیکھئے مسلم ج ۳ ص ۱۳۱ و اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج ۲ ص ۲۱۸)۔

حیلۂ اسقاط

یہ بات تو پہلے بوضاحت بیان کی گئی ہے کہ میت کے لئے صدقہ اور خیرات کرنا اس کے ساتھ ایک بہت ہی عمدہ حسن سلوک و نیک روی ہے اور نصوص شرعیہ سے اس کا ثبوت ہے اور اہل سنت و الجماعت کا اس پر اتفاق ہے، مگر ایصالِ ثواب کا طریقہ وہی معتبر ہو گا جو دلائل شرعیہ سے ثابت ہے۔ اگر کسی عاقل اور بالغ کے ذمہ کچھ نمازیں باقی ہوں اور اس حالت میں اس کی وفات ہو جائے تو حضرات فقہاء کرام نے روزہ پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لئے فدیہ تجویز کیا ہے۔ مگر اس میں صرف قیاس ہی نہیں بلکہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمرؓ کی روایتیں بھی موجود ہیں جو بظاہر موقوف ہیں مگر حکماً مرفوع ہیں۔

عن ابن عباس قال لا یصل احد عن احد ولا یصوم احد عن احد ولكن یطعم عنہ (مشکوٰۃ ص ۱۱۱) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے روزہ پڑھے اور نہ روزہ رکھے مگر ہاں اس

سنن الکبریٰ ۲۵۴ ج ۳، مؤخری ۲۵۴ ج ۳، مع السنن والذیلی ۲۶۲ ج ۲ کی طرف سے فدیہ دے دے۔

علامہ مارونی لکھتے ہیں کہ اس کی سند علی شرط اشعین صحیح ہے (الجہد ج ۴ ص ۲۵) اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اسناد صحیح (الدرایہ ص ۱)۔

وعن ابن عمر قال لا یصلین احد عن احد ولا یصومن احد عن احد ولا یفکون احد کنت فاعلاً تصدقت عنه او اهدیت عنه۔ (ایضاً)۔
حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے اور روزہ رکھ سکتا ہے اور لیکن اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس کی طرف سے صدقہ یا ہبہ اور فدیہ دے دو۔

ہر روزہ کا بدلہ نصف صاع گندم ہے صاع دوسو ستر تولہ کا ہوتا ہے علامہ سندھی (الموتی سہ ماہی) کہتے ہیں کہ صاع کوئی ہست اسے مرقہ ہیم دو صد و ہشتاد تولہ مستقیم صاع تقریباً ساڑھے تین سیر کا ہوا اور نصف صاع تقریباً پونے دو سیر کا۔ ہر آدمی کو اپنی نمازوں اور روزوں کا حساب کر کے حسب تصریح حضرات فقہاء کرام وصیت کرنی چاہیے (دیکھئے خانہ ج ۱ ص ۱) و جامع الرموز ج ۱ ص ۱۱۱ اور الايضاح ص ۱۱۱)۔ اور اگر بغیر وصیت کے وارث نے بطور تبرع فدیہ دیا، تب بھی جائز ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ثواب پہنچے گا۔ مگر وارثوں پر یہ فدیہ لازم نہ ہوگا۔ اور ہر نماز کا بدلہ بھی نصف صاع ہوگا اور وتر کے لئے مستقل نصف صاع ہوگا۔ پانچ نمازوں کا اندازہ جمع وتر ساڑھے دس سیر گندم ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ کے حقوق نہیں تو اس کے لئے فدیہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص مال دار ہے اور اس کے ترکہ سے وارثوں کی حق تلفی کے بغیر ثلث سے فدیہ دیا جاسکتا ہے تو دیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص فقیر اور غریب ہے اور اس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ حقوق ہیں اور اس کے ثلث ترکہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ سب نمازوں اور روزوں کا فدیہ ادا ہو سکے تو حضرات فقہاء کرام نے اس کے لئے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جتنی مقدار میں گندم یا اس کی رقم کا اس کا ترکہ متمثل ہے تو وہ گندم یا رقم میت کا وارث کسی فقیر کو دے دے۔ پھر فقیر وارث میت کو ہبہ کرے، پھر وارث فقیر کو دے دے حتیٰ کہ اتنی بار یہ معاملہ ہوتا رہے جتنی میں نمازوں اور روزوں کا اندازہ پورا ہو جائے۔

یہی صورت فقہ حنفی کی متعدد کتابوں میں لکھی ہے۔ (مثلاً دیکھئے کبیری ۵۳۵، شامی ج ۱ ص ۴۹۲، اور نورالایضاح ص ۱۸۱ وغیرہ)۔ اور حضرات فقہاء احناف نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگر یہ فدیہ نماز کا عوض بن سکا تو فہما، ورنہ صدقہ کا ثواب تو میت کو حاصل ہوگا (دیکھئے نورالانوار ص ۱۸۱ وغیرہ)۔ اس ساری بحث کو پیش نظر رکھ کر ذیل کے امور بخوبی اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔

- ① نمازوں اور روزوں کا صحیح حساب اور تخمینہ لگایا جائیگا۔ محض رسمی طور پر فدیہ کا کوئی معنی نہیں۔
- ② اور اپنے وارثوں کو اسکی وصیت کی جائے کہ میری طرف سے میرے ثلث ترکہ میں سے اتنا فدیہ دینا۔
- ③ جس کے ذمہ نماز اور روزہ وغیرہ نہیں، اس کے لئے اس معہود فدیہ کا کوئی معنی نہیں ہے۔ بایں طو کہ اُس نے اپنی زندگی میں نماز اور روزہ کی پابندی کی ہے، اور بہت سے خدا کے بندے آج بھی ایسے موجود ہیں، یا نابالغ بچے اور مجنون اور پاگل وغیرہ ہیں، ان کے لئے اس فدیہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بشرطیکہ بلوغت سے تاملرگ جنوں رہا ہو۔

④ اگر کوئی فقیر ہے اور اس کا ترکہ تمام روزوں اور نمازوں کی ادائیگی کا متحمل نہیں، تو صرف اُس کے لئے حضرات فقہاء کرام نے حیلہ تجویز کیا ہے۔ خانوں، سرداروں، وڈیروں، امیروں اور نوابوں کے لئے یہ حیلہ برگز نہیں ہو سکتا۔

⑤ یہ فدیہ صرف حقوق اللہ مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ حقوق العباد تو حقوق ادا کرنے ہی کی صورت میں ادا ہو سکتے ہیں اور بس، یا صاحب حق بطیب خاطر خود معاف کر دے جب آخری مرتبہ حیلہ کی صورت میں میت کے ذمہ جو نمازیں اور روزے تھے وہ ادا ہو گئے، تو وہ گندم اور رقم اس فقیر کی ملک ہو گئی جس نے قبول کر لی، پھر اُس سے واپس لے کر وارثوں کو اس کی تقسیم کا برگز حق حاصل نہیں ہے۔ پہلے تو بامر مجبوری بشکل حیلہ فقیر سے واپس ہوتی رہی مگر اب کیا ضرورت پیش آئی ہے کہ اُس فقیر سے واپس لے کر اُس کو میت کے وارث خود تقسیم کریں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

الذی یعوذ فی ہبتہ کالکلب یعوذ فی قیدہ
جو شخص بہرہ کے پھر اس کو واپس لیتا ہے تو اسکی مثال
اوکما قال۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۵۷ و مسلم ج ۲ ص ۳)۔
ایسی ہی ہے جیسے گناہ کے خود چاٹ لیتا ہے۔

صوبہ سرحد اور بعض دوسرے علاقوں میں یہ دستور ہے کہ حیلہ استقاط کے لئے ایک خاص باکرامت گٹھڑی ہوتی ہے جس میں قرآن کریم کے علاوہ کچھ ریز گاری اور گڑ شریف بھی شامل ہوتا ہے اور پھر اس کو ایک دائرہ کے اندر گھمایا جاتا ہے اور ایک مخصوص دعا سے شروع کر کے کہ کل حق من حقوق اللہ تعالیٰ بعضہا ادی الخ وہ گٹھڑی اصحاب دائرہ کو دی جاتی ہے جن میں اکثر بڑے بڑے خاں، نواب اور امیر مٹا بھی شامل ہوتے ہیں، اور وہ یہ کہتے ہوئے کہ قبلت بالطریقۃ المذکورۃ و وہبتک دوسرے کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حضرات فقہاء کرام کی ان عبادتوں میں نہ تو قرآن کریم کا کہیں ذکر ہے اور نہ گڑ شریف کا۔ خدا معلوم یہ حیلہ در حیلہ کا ثبوت کہاں سے نکلا ہے؟ اور اس گٹھڑی میں جو رقم ہوتی ہے وہ بھی محض اپنی عزت و دنیا کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ اس کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میت کی نمازوں اور روزوں کا حساب کیا ہے؟ اور کتنی بار پچھتے دینے سے وہ حساب بے باق ہو گا؟

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جس حیلہ استقاط کا جواز حضرات فقہاء کرام سے ملتا ہے اور جن لوگوں کے لئے ملتا ہے اور جن حالات میں ملتا ہے وہ تقریباً تقریباً آج مفقود ہیں اور محض دنیا کمانے کا ایک مذہب حیلہ بن کر رہ گیا ہے اور مشکل ایک دو فیصدی حیلے ایسے ہوتے ہوں گے جو حضرات فقہاء کرام کے بیان کردہ حیلہ کے عین مطابق ہوں گے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا کہ :

”حیلہ استقاط کا مفلس کے واسطے علمائے وضع کیا تھا۔ اب یہ حیلہ تحصیل چند فلس کا ملاؤں کے واسطے مقرر ہو گیا ہے، حق تعالیٰ نیت سے واقف ہے، وہاں حیلہ کارگر نہیں مفلس کے واسطے بشرط صحت نیت، ورش کے کیا عجب ہے کہ مفید ہو، ورنہ لغو اور حیلہ تحصیل دنیا و زینہ کلبہ فقط و انشاء علم۔ رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۲۱)۔ اور دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ ”حقوق مالیر توادلے حقوق سے ادا ہو سکتے ہیں، اور حقوق بدنیہ جیسے نماز روزہ، تو اگر ہر نماز اور ہر روزہ کے بدلے نصف صاع گہوں اور ایک صاع جو ادا کرنے سے اُمید ادا ہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ باقی رہا یہ استقاط ہر وجہ، محض لغو اور بے ہودہ حیلہ ہے، اور اس کا خیر القرون میں کچھ اثر نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔“ رشید احمد عفی عنہ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱ ص ۱۲۱)۔

بعض فقہاء نے تو اس میں غلطی سے ایسا غلو کیا کہ صاف لکھ دیا کہ :

وان لم یملک شیئاً مستقرض وارثہ۔ اگر مردہ کسی چیز کا مالک نہ ہو تو اس کا وارث
(جامع الرموز ج ۱ ص ۱۶۱) قرض لے کر فدیہ ادا کرے۔

مولوی محمد صالح صاحب بریلوی لکھتے ہیں کہ : ”اگر میت کی جائیداد کچھ بھی نہ ہو تو وارث پر لازم ہے
کہ قرض لے کر ادا کرے۔“ انتہی بلیغ (تحفۃ الاحباب ص ۸۹)۔

حالاتِ تکوین حضرات فقہاء احناف کے مسلک کے بالکل خلاف ہے۔ چنانچہ امام قاضی خانؒ
تحریر فرماتے ہیں کہ :-

وعلیہ ان یوصی بالهدیۃ و یعتبر ذلک
من ثلث مالہ عندنا وان لم یوص و
تبرع الوثۃ عنہ جاز ولا یلزمہم
من غیر ایصاء عندنا خلاف للشافعی
میت پر فدیہ کی وصیت لازم ہے لیکن ہمارے نزدیک
یہ وصیت ثلث مال سے ہی ہوگی۔ اگر میت نے وصیت
ذکی اور وارثوں نے بطور تبرع کے اس کی طرف سے فدیہ ادا
کر دیا تو جائز ہے مگر ہمارے نزدیک بغیر وصیت کے وارثوں
پر یہ لازم نہیں ہے، بخلاف حضرت امام شافعیؒ کے۔
(قاضی خان ج ۱ ص ۹۱)

جب میت کے اپنے ترکہ میں ثلث مال سے فدیہ بھی بغیر وصیت کے وارثوں پر لازم نہیں ہے تو بصورتِ
عدم ملک کے وارث کا قرض لے کر فدیہ ادا کرنے کا کیا مطلب ہوگا ؟

حقیقت یہ ہے کہ اس غلط حیلہ استقاط کے طریقہ نے بعض علاقوں میں بہت سے لوگوں کو بہت ہی
زیادہ پریشان کر رکھا ہے اور ملامتیں اپنے چند لوگوں کے لئے طرح طرح کے حیلے اور بہانے اور جھوٹیں اور
فوائد و منافع تراش تراش کر سادہ لوح مسلمانوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

منفی احمد یار خان صاحب حضرت مولانا گنگوہیؒ کی سابق عبارت پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

”مغفل کی قید مولوی رشید احمد صاحب نے اپنے گمراہ لکائی ہے الخ“۔ (مار الحی ص ۳۴)۔

مگر منفی صاحب خود اپنا لکھا فراموش کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ : ”اب اگر کسی کے ذمہ دس بیس
سال کی نمازیں ہیں تو صدقاً من غلہ خیرات کرنا ہوگا۔ شاید کوئی بڑا دین دار مال دار تو یہ کر سکے مگر غریب سے

ناممکن۔ ان کے لئے یہ طریقہ ہے کہ وہی میت بقدر طاقت گندم اٹھ (جبار الحق ص ۳۱۵) مفتی صاحب ہی فرمائیں کہ آپ نے غبار کی قید اپنے گھر سے کیوں لگائی ہے؟ کیا سچ کہا گیا ہے سہ

غیر کی آنکھوں کا تینکا تاج کو آتا ہے منظر دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ندا شہتیر بھی لطیفہ: مفتی صاحب لکھتے ہیں کہ وہابی دیوبندی جس طرح کہ زندہ مسلمانوں کے دشمن ہیں، اسی طرح مُردوں کے بھی دشمن ہیں کہ نفع پہنچانے سے لوگوں کو روکتے ہیں، اور مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بلقظہ (جبار الحق ص ۳۱۵)۔

مفتی صاحب ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ فرمائیں کہ وہابی دیوبندی تو خیر بقول شہادتیں ہوتے مگر آپ لوگوں نے اپنے پیٹ کو ایسا سر پر اٹھا لیا ہے کہ زندہ مسلمانوں کو بھی خیر خواہ بن کر ٹوٹ کر کھا گئے اور مُردہ مسلمانوں کو بھی خیر سے بچھوڑا کبھی تہیجا اور ساتواں کی صورت میں اور کبھی گیارھویں اور چالیسویں کی شکل میں اور کبھی عرس میلاد وغیرہ کے رنگ میں جو تک بن کر سادہ مسلمانوں کو بچھوس لیا ہے، اور نہ تو زندگی میں، اور نہ بعد از زندگی کسی طرح ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ یہی خواہ اور خیر خواہ آخر ایسے ہی درکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بے شک بہت سے مولوی اور پیر لوگوں کے اموال ناجائز طریقہ سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روکتے ہیں اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَخْبَارِ وَالرَّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانبیاء)۔ وہ سیدھا سادہ خدا تعالیٰ کا دین جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ و تبع تابعینؓ کے ذریعہ ہم تک پہنچا تھا۔ اُس پر مفتی صاحب اور ان کی جماعت نے زرا اندوزی کی بدعات کے سنی ٹکڑوں غلاف چڑھا دیے ہیں اور صحیح دین جس کو اس دور میں اصل شکل میں صرف اکابرین علماء دیوبند ہی پوشش کتے ہیں اُس سے مفتی صاحب وغیرہ روکتے ہیں فوا اسفا!

دورانِ قرآن

میت کے لئے ایصالِ ثواب کا مسئلہ اور نادار مفلس کے لئے حیلہ استعاط کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا ازلہ کلام اور ظاہری و باطنی، جسمانی اور روحانی بیماریوں کے لئے شفا ہے۔ قرآنِ کریم صحیح احادیث اور اجماعِ اُمت سے ایصالِ ثواب کا طریقہ ثابت ہے لیکن اس کا ثبوت کسی صحیح دلیل سے نہیں ہو سکا کہ جنازہ کے بعد میت پر قرآنِ کریم کو پھیر جائے۔ تمام احادیث کا ذخیرہ چنانچہ کہیں آپ کو اس کا نام و نشان تک نہیں مل سکے گا۔ شافعیوں اور مالکیوں و حنبلیوں کی معتبر و مستند کتابوں کی ورق گردانی کر لیجئے، کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہوگا۔ حضرت امامِ اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف و امام محمدؒ کی کتابیں دیکھ لیجئے، کہیں اس کا بیان نہ ہوگا۔ فقہ حنفی کے معتبر و مستند فتاویٰ متون اور شروح کو ملاحظہ کر لیجئے، کہیں اس کا پتہ نہ پاؤ گے۔ کتبِ ظاہر الدیہ کا مطالعہ کر لیں، کہیں اس کی جھلک نظر نہ آئے گی۔ حضراتِ صحابہ کرامؓ اور ائمہ عظامؒ کی سوانح عمریاں ملاحظہ کیجئے، اس کا وجود کہیں نہیں ملے گا، اور موت کوئی ایسی نادر چیز نہیں جس کا کہیں وقوع نہ ہوا ہو۔ پھر کیا وجہ ہے، کہ حضراتِ صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کسی نے دورانِ قرآن کا حیلہ تجویز کیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضراتِ فقہاءِ احنافؒ نے کتبِ فقہ میں اور حافظ ابنِ قیمؒ نے اغاثۃ اللہ فان ج ۱ ص ۳۸۷ میں اس کی تصریح کی ہے کہ ہر ایسا حیلہ جس کی وجہ سے انسان کسی حرام سے بچ سکے یا بغیر ابطالِ حق وغیرہ کے اور بغیر اضرارِ شبہ فی الدین کے کسی حلال چیز کا حصول اس سے ہو سکے، تو وہ درست ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ وہ مقام نہیں جس میں ہمیں اپنی طرف سے قیاس و اجتہاد کے لئے خود حیلے تراش تراش کر ایک نیا دین کھڑا کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہو کیونکہ کفن و دفن کے اور ایصالِ ثواب کے اور میت سے ہمدردی کے تمام پہلو جنابِ رؤف و رحیم اور رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک ایک کر کے ہمیں بتائے اور حضراتِ صحابہ کرامؓ اور اہل خیر القرون نے اپنے عمل سے وہ ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ اگر ایسے مقام پر انہوں نے کوئی حیلہ نہیں کیا تو یقین جانیئے کہ ہمارے لئے بھی اس کے کرنے کی ہرگز ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ سبت کے ایسے ہی ناجائز حیلوں کے سبب ان پر عذاب نازل کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ایسے ہی نفسانی حیلوں کے پیش نظر قاتل اللہ الیہود (الحديث) کے سنگین الفاظ سے ان کے حق میں بددعا فرمائی تھی،

(صحیحین) اور اُمتِ محمدیہ (علیٰ صہبہ) الف تحیۃ) کو آگاہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :
 عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا توتکبوا ما اسر تکبت ایہود
 کیاتم معمولی حیلوں سے اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی
 فستحلوا محارم اللہ بادی الحیل۔ و ہذا
 چیزوں کو حلال سمجھنے لگو۔
 اسناد جید۔ (تفسیر ابن کثیر ۲/۲۵۶ مراجع در مسو ۱۳۹)

الغرض صوبہ سرحد اور دیگر مختلف علاقوں میں چند ٹکوں کی غرض سے قرآن مجید کو جو پھیرا جاتا ہے،
 اس کا شریعت اسلامیہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ شریعتِ حق اس قلع ترین حرکت سے سخت بیزار ہے
 اور تمام حق پرست علماء کا یہ اولین فرض ہے کہ اس رسم بد کو فی الفور ختم کر دیں اور اس مصنوعی اور خود ساختہ
 طریقہ سے (جس میں لفظ دوران قرآن ہی اس کے خود ساختہ ہونے کی واضح دلیل ہے کیونکہ قرآن کریم پھرتا
 نہیں پھیرا جاتا ہے اور اس کے لئے اگر عرب سے یہ رسم نکلتی تو تدویر قرآن کا لفظ استعمال کیا جاتا نہ کہ دوران
 قرآن کا) مسلمانوں کو نجات دلا کر ان کے سامنے وہی اسلام پیش کریں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور
 حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ اور تبع تابعینؓ اور ائمہ مجتہدین سے ثابت ہے۔ اور اپنی طرف سے ان
 بدعات کو پیش کر کے اسلام کا نام دینا دین اسلام سے اشد ترین دشمنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان
 کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین !

تصویر کا دوسرا رخ

نہایت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مجوزین دوران قرآن کے دلائل بھی قارئین کرام کے سامنے
 عرض کر دیں اور پھر ان پر سند و متنا، روایت و درایت کلام کریں۔ مجوزین کا کہنا ہے کہ دوران قرآن کثرت
 خلیفہ راشد حضرت عمرؓ بن الخطابؓ سے ہے۔ چنانچہ امام ابواللیث سمرقندی (المتوفی ۳۸۳ھ) لکھتے ہیں کہ :

حدثنا العباس بن سفیان عن ابن علیۃ
 عن ابن عون عن محمد بن عبد اللہ قال قال
 عمرؓ ایہا المؤمنون اجعلوا القرآن وسیلۃ
 ہم سے عباس بن سفیان نے بیان کیا اور وہ ابن علیہ سے
 اور وہ ابن عون سے اور وہ محمد سے اور وہ حضرت ابن عمرؓ
 سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرمایا۔ اے مومنو!

لنجاۃ الموتی فتخلقوا وقولوا اللهم اغفر لهذا
 المیت بحرمۃ القرآن المجید وتناوبوا بایدیکم
 متناویۃً وفعل عمر بن الخطاب مثله فی
 زمانہ لامرأة ملقبة بحبیبة بنت عربد زوجة
 قلاب (وفی نسخة ملاح) بجزء القرآن من مالى
 الى عم یتساءلون وشاع فعله فی زمان خلافة
 عثمان بن امار مروان بعناد وقال الامام
 السمرقندی ثم اشتهر فی خلافة هارون
 الرشید من غیر انکار تکیر دوران القرآن
 لحیلة الاستقاط فاصله ثابت بن عمر وان
 لم یدکر فی الکتاب المشہور من الاحادیث و
 ولكنه مذکور فی الکتاب من التوارخ بسند
 قوی کما قال المؤرخ صاحب الفتوح اخیونا
 ابو عاصم عن ابن جریر عن ابن شہاب
 عن ابی سلمة عن ابی موسی قال فعل عمر
 تعا وجزء القرآن فی حلقة عشرین رجلا
 بعد صلاة الجنازة لامرأة ملقبة بحبیبة
 ولرجل من قبيلة الانصار ما حفظنا اسمه
 وثبت، بهذا السند ایضاً اخیونا سعد عن
 ایوب عن جریج عن عبد الرحمن بن ابی بکر
 انه اوجد دوران القرآن عمر بن الخطاب

قرآن کو مردوں کی نجات کا ذریعہ بناؤ۔ پس حلقہ بنا دو
 اور کہو ملے اللہ اس میت کو اس قرآن کی حرمت سے بخش
 دے اور باری باری ایک دوسرے کے ہاتھوں سے قرآن کو
 لیتے رہو حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری ایام میں حبیبہ
 بنت عربد قلاب کی بیوی کے لئے ایسا ہی حیلہ جوڑ کر کیا گیا تھا
 مالى سے عثمان یتساءلون میں کہ جو قرآن مجید کی جزئی تھی،
 اس کے ساتھ حیلہ کیا گیا تھا اور یہ طریقہ عمرؓ عثمانی میں مشہور
 ہو چکا تھا البتہ مروان نے عناداً اس پر اعتراض کیا تھا۔ امام
 سمرقندی فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ ہارون الرشید کی خلافت میں
 رائج ہو چکا تھا کہ انہوں نے حیلہ استطاف میں دوران قرآن
 بھی کیا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا تو اس کی اصل حضرت
 عمرؓ سے ثابت ہے اگرچہ حدیث کی مشہور کتابوں میں اس کا
 ذکر نہیں ہے۔ لیکن تاریخ کی بعض کتابوں میں قوی سند کے
 ساتھ اس کا ذکر ہے چنانچہ مؤرخ صاحب فتوح نے
 کہا ہے کہ ہم سے ابو عاصم نے بیان کیا۔ وہ ابن جریر سے اور
 وہ ابن شہاب زہری سے اور وہ ابوسلمہ سے اور وہ حضرت
 ابوموسیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بیس آدمیوں کے
 حلقہ میں نماز جنازہ کے بعد ایک حرمت کے لئے جس کا لقب
 حبیبہ تھا اور ایک انصاری کے لئے جس کا نام جہین یا نہیں
 رہا، قرآن کا دوران کیا تھا اور اس سند سے بھی ثابت ہے
 کہ ہم سے سند نے بیان کیا وہ ابوبکرؓ سے اور وہ جریج سے اور

شافعہ المؤمنین حیاتیات و بعد ممات انتہی وہ عبدالرحمن بن ابی بکر سے روایت کرتے ہیں کہ مولیٰ قرآن
(فتاویٰ سمرقندی) کا ایجاد حضرت عمرؓ نے کیا اور قرآن کو منزل کیلئے منگوا دیا

اور بعد از وفات بھی شفاعت کرنے والی ہے۔

الجواب : فی حدیث کے پیش نظر اس سے استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ امام ابواللیث اگرچہ
ایک بہت بڑے فقیر ہیں مگر فی روایت اور حدیث میں تو حضرات محدثین کے امام کی طرف رجوع کیا جاتے گا۔
لہذا ان کی پیش کردہ روایت اسماۃ الرجال کی کتابوں سے پرکھ کر دیکھیں گے کیونکہ یہی وہ فن ہے جو حدیث کا محافظ
ہے۔ پہلی سند ہرگز قابل استدلال نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ اس میں عباس بن سفیان مجہول ہے۔ کتب رجال
میں اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل سکا۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہرگز اس کا تکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین
مجہول شخصیتوں سے لیتے پھریں۔ وثانیاً امام سمرقندی کی وفات ۳۸۳ھ میں ہوئی ہے (مقدمہ فتاویٰ ص ۱۸۹) اور
ابن علیہ کی وفات ۳۹۳ھ یا ۳۹۴ھ کو ہوئی ہے (تہذیب ج ۱ ص ۱۸۳)۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ
امام سمرقندی صرف ایک واسطہ سے ابن علیہ سے یہ روایت کرتے ہیں، درمیان میں ایک سو نو اسی سال کا طویل
زمانہ اس کا تحمل نہیں ہے جیسا کہ فن حدیث اور طبقات و روایات کو جاننے والوں پر بخوبی معلوم ہے۔

دوسری سند مؤرخ صاحب فتوح کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے۔ اولاً صاحب فتوح محمد بن عمر واقدی
قابل اعتبار ہی نہیں ہے۔ امام بخاری، ابن المبارک، ابن نمیر اور اسماعیل بن زکریا اس کو متروک الحدیث کہتے
ہیں۔ امام ابن معین اس کو ضعیف اور لیس بنی پرکھتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ وہ کتاب تھا۔
محدث بنہار کہتے ہیں کہ میں نے اس سے مجھوٹا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام اسحاق بن راہویہ اور ابو حاتم کہتے ہیں کہ
وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ امام نسائی فرماتے ہیں کہ جن چار مشہور کذابوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر
جعلی حدیثیں بنانا کر رہتے تھے ان میں ایک واقدی ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ :

کتاب الواقدی کُلُّہا کذب۔ واقدی کی تمام کتابیں خالص جھوٹ ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۶۹ ص ۳۷۰ ملاحظہ ہو)

وثانیاً اس کی سند میں ابن جریر ہیں۔ جو اگرچہ ثقہ تھے مگر بحیثیت ناظرین کے لئے حلیہ کے قابل تھے۔ چنانچہ

انہوں نے تو سے عورتوں سے نکاح منع کیا تھا اور اس کو جائز سمجھتے تھے (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۵۱) علاوہ انہیں امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریجؒ، موضوع جعلی اور من گھڑت روایات بھی نقل کر دیا کرتے تھے اور روایت لینے میں ثقہ اور غیر ثقہ کی کوئی تمیز نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً)

[illegible]

وہ اس بعد ابن جریر مشہور مدرس تھے (دیکھئے میزان ج ۲ ص ۱۵۱ و تہذیب ج ۶ ص ۶۴) اور امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ ابن جریر قسح التدریس تھے۔ ان کی تدریس سے پر عزیز کنا ضروری ہے (تہذیب ج ۶ ص ۱۵۴) اور یہ روایت مدرس ہے۔

یہ ہے امام سمرقندی کی قوی سند۔ اور اسی لئے ہم نے اس پر قدرے تفصیل سے کلام کیا ہے۔ تیسری سندیں ایوبؒ، سعدؒ، جمیعؒ یہ تمام راوی مجہول ہیں۔ یہ کون تھے اور کیسے تھے؟ کچھ معلوم نہیں۔ جو اس کی صحت کا مدعی ہے اس پر ان کی تعین اور توثیق ضروری ہے۔ یہ سب کی سب سندیں نہایت کمزور اور مخدوش ہیں اور اس قابل نہیں کہ ان پر دین کے کسی مسئلہ کی بنیاد رکھی جائے۔ اور اسی واسطے کتب حدیث میں اس روایت کا کوئی ذکر نہیں ہے اور امام سمرقندیؒ کو بھی صاف لفظوں میں اقرار ہے کہ حدیث کی مشہور (بلکہ غیر مشہور) کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں :

من جاء اليوم بحديث لا يوجد عند
الجميع لا يقبل (توجيه النظر ص ۲۱۹، فتح المغیث
ص ۱۶۱، مقدم ابن الصلاح ص ۱۶۱)۔

کہ جس شخص نے آج کوئی حدیث پیش کی جو کہ تمام محدثین
کرام کے نزدیک نہ ہو (اور جس کو انہوں نے ذکر نہ کیا ہو)
تو وہ روایت ہرگز قبول نہیں کی جاسکتی۔

قطع نظر سند کے اگر درایت بھی اس پر غور کیا جاتے تو اس روایت کا بطلان واضح ہو جاتا ہے، بچیدہ وجوہ :
 اول : یہ روایت کسی رافضی کی ایجاد ہے اس لئے کہ یہ حیلہ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور فاروقؓ اور رشید
 کی طرف تو منسوب کیا گیا ہے لیکن حضرت علیؓ کا نام مک نہیں لیا گیا اور مروان کی مخالفت کا خاص طور پر

ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے عناد کے طور پر اس مبارک حیلہ سے انکار کیا تھا۔

دوم : اس جعلی روایت میں یہ بھی بتلانا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ کے عہدِ خلافت میں نماز و روزہ وغیرہ کی لوگوں میں یوں بے پروائی ہوتی رہی کہ ان کو ایسے لوگوں کے بنشوانے کیلئے حیلہ دورانِ قرآن تجویز کرنا پڑا۔ اور اس سے سمجھنے والے خود سمجھ سکتے ہیں کہ پھر ان کی خلافت، خلافتِ راشدہ کہلائے گی یا غیر راشدہ ؟

سوم : حبیبہ اور قلاب کا کتبہ رجال اور تاریخ میں کہیں ذکر نہیں مل سکا۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک انصاریؒ کے لئے بھی یہ حیلہ ہوا۔ کیسے باور کر لیا جائے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحابی نے نماز اور روزہ میں کوتاہی کی، اور اس کی تلافی حیلہ دورانِ قرآن سے کی گئی۔ جب کہ حضرت صحابہ کرامؓ و مسلم اور کافر کے درمیان فرق ہی نماز پڑھنے نہ پڑھنے کو سمجھتے تھے پھر رجل من الانصار کا کیا مقام ہوگا ؟ چہارم : حضرت عمرؓ کے آخری ایام خلافت میں سرکاری طور پر قرآن کریم کتابی شکل میں یک جا جمع کر دیا گیا تھا، پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری سے عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ کی جُزیر تک ہی یہ ہیرا پھیری ہوئی اور سارا قرآن کریم نہ پھرایا گیا ؟

پنجم : اگر اس حیلہ کی اصل حضرت عمرؓ سے ہوئی اور عہدِ عثمانیؓ اور رشیدی میں یہ مشہور ہو گیا، تو حضراتِ محدثین کرام اور فقہاء عظام تک یہ کیوں نہ پہنچا ؟ یہ کوئی عجیب شہرت ہے کہ حضراتِ ائمہ دین کے کان تک اس سے نا آشنا ہوں اور یہ حیلہ مشہور کا مشہور بھی رہے ؟

ششم : اوجد دوران القرآن عمرؓ میں لفظ دوران اس کے جعلی ہونے کا قرینہ ہے اور اسی طرح لفظ اوجد بھی کیا یہ کوئی سائنس کی ایجاد تھی کہ اس کے لئے لفظ اوجد بلا گیا اور آخر یہ حکم عمرؓ وغیرہ کے الفاظ ترک کیے گئے یا یہ کوئی اہم ہم باہینہ روحن ہم باسم میزائل کی ایجاد تھی ؟ یہ الفاظ اور ترکیب ہی اس واقعہ کے کہ ہستی ایجاد ہونے کی واضح دلیل ہے الغرض ثابتی اور درایتی قرآن اس روایت کے جعلی اور بے اہل ہونے پر دال ہیں۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب لکھتے ہیں کہ امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے سوا اور حضراتِ ذیات بے سرو پا اس عہد میں منکدر نہیں سب باطل و افتراء ہیں نہ یہ عبادت فساد کی سرقرینہ میں ہے۔ اس پر افتراء ہے اور بے چارہ افتراء کرنے والا عربی عبارت بھی باقاعدہ نہ بنا سکا اپنی ٹوٹی پھوٹی جاہلانہ غرافات کو صیقل و انحراف کی طرف منسوب کیا۔ الخ۔ (الطیبا النبویہ فی الفتاویٰ العرفیہ)

درة البرد میں امام محمدؒ کی کتاب الحیل کے حوالہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ :

قال الامام محمد اسهل طريقته ان يبيع الوارث على الفقير مصفا صحاؤه ابله للقارة بغبن فاحش ثم يرب الفقير له ثم فتم حتى يستعمل الله يجعله فديته في مقابلة القوم والزكاة والمندورات الخ

حضرت امام محمدؒ نے فرمایا کہ سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ میت کا وارث ایک صحیح اور قابل قرأت قرآن کریم کا نسخہ فقیر پر بھاری رقم کے عوض (حیلہ کرتے ہوئے) فروخت کر دے۔ پھر فقیر وارث کو ہبہ کرے پھر وہ فقیر کر دے حتیٰ کہ نماز، زکوٰۃ اور مندورات وغیرہ کا حساب بھرتا ہے۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کا فدیہ بنا دے۔

مگر اس عبارت سے بھی مدعی ثابت نہیں ہو گا۔ اقول لا اس لئے کہ کتاب الحیل امام محمدؒ کی تالیف ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ملا ابو محمد عبد القادر العرشی الحنفی (المتوفی ۷۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ :

قال ابو سليمان الجرجاني كذبوا على محمد ليس له كتاب الحيل انما كتاب الحيل للوداق - (جواهر المفيد ج ۲ ص ۲۸۵)

امام ابوسلیمان جرجانیؒ لکھتے ہیں کہ لوگوں نے امام محمدؒ پر جھوٹ کہا ہے۔ کتاب الحیل ان کی نہیں ہے۔ کتاب الحیل للوداق۔

جب کتاب الحیل ہی امام محمدؒ کی نہیں تو اس حیلہ کی ان کی طرف نسبت کیسے صحیح ہے؟ خصوصاً جبکہ ان کی مشہور کتاب میں جو ظاہر الزواریہ کا مدار ہیں اس سے بالکل عاری ہیں۔

وثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ مخلوق توغبین فاحش کو قبول نہ کرے اور جب خدا تعالیٰ سے معاملہ ہو، توفیق کوغبین فاحش پر قرآن دیا جائے۔ یہ مکہ اور خدا کیوں؟

کارہ باخلق آرمی جملہ راست با خدا تدبیر و حیلہ کے روا است مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی لکھتے ہیں :

”عرض : استطاعت کی حالت میں چند سیرگرم اور قرآن کریم دیا جاتا ہے، اس میں کُل کفار ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اوشاد : جتنی قیمت قرآن عظیم کی بازار میں ہے، اتنے کا کفارہ ادا ہو جائے گا۔ (الحکام شریعت حقہ سوم ص ۱۲۵)۔

مفتی احمد یار خاں صاحب لکھتے ہیں کہ ”پنجاب میں جو عام طور پر یہ مروج ہے کہ مسجد قرآن پاک

کا ایک نسخہ منگایا، اُس پر ایک روپیہ لکھا اور چند لوگوں نے اُس کو ہاتھ لگایا، پھر مسجد میں واپس کر دیا اس سے نمازوں کا فدیہ ادا ہو گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کی کوئی قیمت ہی نہیں، لہذا جب قرآن شریف کا نسخہ خیرات کر دیا، سب نمازوں کا فدیہ ادا ہو گیا۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس میں اعتبار تو قرآن کے کاغذ لکھائی چھپائی کا ہے۔ اگر دو روپیہ کا یہ نسخہ ہے تو دو روپیہ کی خیرات کا ثواب ملے گا۔ ورنہ پھر وہ مال دار جن پر ہزار روپیہ سالانہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ کیوں اتنا خرچ کریں۔ صرف ایک قرآن پاک کا نسخہ خیرات کر دیا کریں۔ غرض کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ بلفظ (جار الحق ص ۲۷۱)۔

اور فتاویٰ نور الہندی میں ہے کہ مصنفے درست و تمام بیان نہ کہ در ملک اُن اسقاط کنندہ باشند باکسے بر بخشہ و قبول کنند الخ (ص ۷۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم اسقاط کنندہ کی ملک میں ہو اور جتنی قیمت اس کی بازار میں ہو اتنی ہی قیمت کے عوض میں وہ کسی فقیر کی ملک کر دیا جائے۔ اور یہ جو حیلہ دورانِ قرآن کے قائل ہیں وہ اس کی قید بھی لگاتے ہیں کہ :

ان دوران القرآن لازم عند الفلاس و دوران قرآن اُس وقت لازم ہے جب کہ کوئی غفلت ہو، عدم قدرة اداء الفدية۔ (المجموع للفتاویٰ)۔ اور فدیہ کی ادائیگی پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

مگر صوبہ سرحد اور اسی طرح دیگر بعض علاقوں میں یہ رسم اتنی عام ہے کہ امیر و غریب اور شاہ و گدا سب کے لئے دورانِ قرآن کیا جاتا ہے اور اس حیلہ ورنیلہ کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اصل حقیقت کی جھلک ہی نظر نہیں آتی۔ تمام مسلمانوں کا عموماً اور علماء کرام کا خصوصاً یہ فرض ہے کہ وہ جلد بدعات سے اور خصوصاً دورانِ قرآن کی رسم سے خود بھی اجتناب کریں اور اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی اس رسم کی قیادت سے روشناس کریں۔ ہر رسول اللہ بلاغ باشد و بس !

غرضیکہ حیلہ دورانِ قرآن کا صحیح اور معقول ثبوت نہ تو کسی عقلی دلیل سے ہے اور نہ نقلی سے۔ نہ خیر القرآن میں اس کا ثبوت اور رواج تھا اور نہ ذمہ دار حضرات فقہاء کرام اور حضرات محدثین عظام اُن سے آگاہ ہیں۔ اور جنہوں نے یہ رعایت نقل کی ہے، فن اسما را رجال کے ماتحت ان کی نقل کسی صودت میں معتبر نہیں ہے۔

اس لئے علماء کونش و کچلی و اگرور و مکسبی و دیشان و متاکوٹ و نندھاڑ و الائی و کوہستان و درہ پیکرمنگ و سچال اور ریش وغیرہ سے علی الخصوص یہ دروندانہ اپیل ہے کہ وہ اس رسم بد کو بند کرنے میں پیش قدمی کریں۔ ان میں اہل علم اور اہل فہم اور انصاف پسند حضرات کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ وہ اس پر پوری توجہ کریں، اور دیگر مختلف علاقوں کے علماء اہل حق سے بھی گزارش ہے، کہ وہ بھی اس رسم فحش سے گریز کریں اور اس کو بند کرنے میں انتہائی کوشش فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ آمین ثم آمین!

عبدالنبی اور عبدالرسول وغیرہ نام رکھنا

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر نام ہے (وہ جس میں لفظ عبد کی اللہ کی طرف اضافت ہو مثلاً) عبداللہ اور عبدالرحمن وغیرہ اور پھر وہ نام جن میں محمد کا نام ہو مثلاً محمد ابراہیم اور محمد اسماعیل وغیرہ۔ لفظ عبد ایک مشترک لفظ ہے، عبد کے معنی عابد کے بھی آتے ہیں اور خادم و غلام کے معنی بھی آتے ہیں۔ جب اس کی اضافت غیر اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد خادم اور غلام ہوتی ہے جیسے صَالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ۔ لیکن نام اور اسمیہ کے موقع اور محل پر عموماً یہ لفظ عبادت کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور ایسے موقع پر اس کے متبادر معنی یہی ہیں، اسلئے ایسا نام ایہامِ شرک سے خالی نہیں ہے جس سے احتراز کرنا نہایت ضروری ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

وَمِنْهَا أَنَّهُمْ كَانُوا يَسْتَمُونَ لِبَنَاءِ هَمْ عَبْدِ الْعَزْزِيِّ
وَعَبْدِ شَمْسٍ وَخَوِذَ الْكَ إِلَىٰ أَنْ قَالَ هَذَا
اِشْبَاحَ وَقَوْلُ لِلشَّرِكِ نَهَى الشَّارِعَ عَنْهَا لِكُونِهَا
قَوْلًا لَهُ وَاللَّهُ أَعْلَمُ۔ (حجۃ اللہ جل)

اقسامِ شرک میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام عبدالعززی اور عبدشمس وغیرہ رکھتے تھے (پھر فرمایا) کہ یہ نام شرک کے قالب اور اس کے سانچے ہیں، اس لئے شارع نے ان ناموں سے منع کیا ہے۔

فائدہ : نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ عورتی ایک عورت (پرہیز) تھی جس کی لوگ پیش کیا کرتے تھے۔ جب یہ مکہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو

حضرت خالد بن الولید نے قتل کیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۴)۔

امام ابن حجر مکیؒ لکھتے ہیں کہ:

وَيُحَرِّمُ حَلَاكُ الْأَمْلَاكِ لِأَنَّهُ لَا يَسْلُكُ لِيَسْ لِفَيْدٍ
اللَّهُ وَكَذَلِكَ عَبْدُ النَّبِيِّ وَعَبْدُ الْكُفَّةِ أَوَّلُ الدَّارِ
أَوْ عَلَى أَوْ الْحَسَنَ لَا يَهَامُ الشَّرْكَ -
کسی کا شہنشاہ نام رکھنا حرام ہے کیونکہ یہ نام صرف
اللہ تعالیٰ کا ہے اور اسی طرح عبد النبی اور عبد الکعبہ اور
عبد الدار اور عبد العلی اور عبد الحسن نام بھی صحیح نہیں ہیں

(شرح منہاج ج ۱ ص ۱۰۰) کیونکہ ان میں ایہام شرک ہے۔

لفظ علی چونکہ اللہ تعالیٰ کا نام بھی ہے اور قرآن کریم میں اَلْعَلِيُّ الْعَظِيمُ وغیرہ آیا ہے تو اگر کسی کی مراد
حضرت علیؑ نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہو تو عبد العلی نام بلا کر اہست جائز ہے۔

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ:

وَأَمَّا مَا اشْتَهَرَ مِنَ التَّسْمِيَةِ بِعَبْدِ النَّبِيِّ فَظَاهِرٌ كُفْرٌ
إِلَّا أَنْ أَرَادَ بِالْعَبْدِ الْمَمْلُوكَ (شرح فتح الباری ج ۳ ص ۳۸۰)
عبد النبی نام جو مشہور ہے بظاہر یہ کفر ہے مگر یہ کہ عبد سے
مملوک مراد ہو تو پھر کفر نہ ہوگا۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کفر نہیں تو جائز ہو گیا بلکہ یہ بہر حال ناجائز ہوگا۔ چنانچہ خود ملا علی قاریؒ
لکھتے ہیں کہ:

وَلَا يَجُوزُ لِحُجْوِ عَبْدِ الْحَارِثِ وَلَا عَبْدَ النَّبِيِّ
وَلَا عَبْدًا بِمَا شَاعَ فِي مَا بَيْنَ النَّاسِ -
کہ عبد الحارث اور عبد النبی نام رکھنا جائز نہیں ہے اور
لوگوں میں جو یہ نام رائج ہیں، تو اس کا کوئی اعتبار
نہیں ہے۔ (مرقات ج ۹ ص ۱۰۱)

اور شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شُرک چنانچہ در عبادت و قدرت می شود، میں قسم شرک در تسمیہ ہم میشود این قسم نام ہندو شرک
در تسمیہ است از این ہم احتراز لازم است۔" (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۰۱)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ:

"پرستش آنست کہ سجدہ کند یا طواف نماید یا نام اور را بطریق متعرب و رد سازد یا ذبح جانور بنام

او کھد یا خود را بنده فلاںے بگوید و هر که از مسلمانان جاہل با اہل قبور ایں چیز را بعمل آورد فی الفور کافر میگردد و از مسلمانان ے برآید (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۳۱۱)

نوٹ : جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس میں تقرب کی نیت شامل ہو، وہ بہر حال حرام ہے گو وقت ذبح اس پر ہم اللہ پڑھی جائے۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں اُھلَ بہ لغیر اللہ کی تفسیر میں اس پر مبسوط بحث کی ہے اور دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا کہ خواہ وقت ذبح نام خدا بگوید یا نہ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۸۱)۔ راقم الحروف نے اس پر الگ کتاب لکھی ہے۔ اگر طبع ہوگئی، تو غیر اللہ کے نام پر جانور نامزد کرنے کے جملہ گوشوں پر سیر حاصل بحث اس میں موجود ہے۔ التوفیق سید اللہ تعالیٰ۔ مستقل کتاب تو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی البتہ متیقہ متین میں اس مسئلہ کی بقدر ضرورت تل بحث اسکی ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنؤی لکھتے ہیں کہ :

سوال : عبد اللہی یا نامدائاں نام نہادوں درست است یا نہ ؟

جواب : اگر اعتقاد ایں معنی است کہ ایں کس عبد اللہی نام دارد و بندہ نبی است عین شرک است و اگر عبد معنی غلام مملوک است آں ہم خلاف واقع است و اگر مجازاً عبد بمعنی مطیع و متقاد گرفتہ شود مضائقہ ندارد لیکن خلاف اولیٰ است۔ روی مسلمہ عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احدکم عبدی ولا امتی کلمہ عباد اللہ وکل نساءکم اماء اللہ و لکن یقول غلامی و جاریتی و فتائی و فتائی انتہی بلفظہ (مجموعہ فتاویٰ ج ۳ ص ۱۹۷)۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

استفہار : کسی کا نام عبد الرسول یا عبد الحسین وغیرہ رکھنا درست ہے یا نہیں؟ بتینا تو جوا۔

ہو المصنوب، ایسا نام جس میں اضافت عبد کی طرف غیر خدا کی ہو، شرعاً درست نہیں ہے اور اگرچہ صرف اس قسم کے نام رکھنے سے حکم شرک کا نہ ہو، بسبب احتمال اس کے کہ عبد سے مراد خادم مطیع ہے مگر بے شرک سے ایسا نام رکھنا خالی نہیں ہے۔ قرآن و حدیث اس قسم کے نام رکھنے کی ممانعت پر دال ہیں، اور علماء اہل سنت مجتہدین نے بھی جابجا اس کی تصریح کی ہے الخ بلفظہ (مجموعہ فتاویٰ جلد دوم ص ۳۲۸)۔

مفتی احمد یار صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے کہ یہ ممانعت کراہتِ تنزیہی کے طور پر ہے کہ عبدی کہتا بہتر نہیں بلکہ غلامی کہنا اولیٰ ہے (ملاحظہ جدار الحق ص ۲۶۳) اور پہلے لکھا ہے کہ جب عبد کو اٹش کی طرف نسبت کیا جاوے گا تو اس کے معنی عابد کے ہوں گے اور جب غیر اٹش کی طرف نسبت ہوگی تو معنی ہوں گے خادم غلام۔ لہذا عبد القبی کے معنی ہونے لگی کا غلام۔ (ملاحظہ ص ۳۶۱)۔

ان دونوں عبارتوں کو بلا کہ نتیجہ یہ نکلا کہ غیر اٹش کی طرف عبد کی نسبت کراہتِ تنزیہی سے خالی نہیں ہے، اور یہی کچھ ہم کہتے ہیں کہ ایہا ہم شرک سے خالی نہیں، گو شرک کا فتویٰ نہ لگایا جائے گا بقول مولانا عبدالحی و غیرہ مگر فتویٰ نہ لگانے سے اس کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ بہر حال ایسے موہم شرک نام سے پھنسا رویہ اسلام کے عین مطابق ہے۔

مفتی احمد یار خان صاحب کا کمال | مفتی صاحب لکھتے ہیں: "عبد القبی عبد الرسول، عبد المصطفیٰ اور عبد العلی وغیرہ نام رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح اپنے کو حضور علیہ السلام کا بندہ کہنا جائز ہے۔ فتاویٰ و حدیث و اقوال فقہاء سے ثابت ہے (جدار الحق ص ۳۶۱)۔

ایک طرف تو مفتی صاحب اس قسم کے نام کو مکروہ تنزیہی کی مدین سمجھتے ہیں اور دوسری طرف قرآن و حدیث اور اقوال حضرات فقہاء سے اس کو ثابت کرتے ہیں۔ جب قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو پھر مکروہ تنزیہی کیسا؟ پھر قرآن کریم کی آیت قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا (الایۃ) سے یہ احتمال پیدا کیا کہ حضور علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ آپ فلاح و اے میرے بندو۔ یہ سراسر باطل اور قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، کسی بشر کو یہ لائق ہی نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبوت، کتاب اور حکمت دی مَوْثِقَةٌ لِّلنَّاسِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (الایۃ) کہ وہ لوگوں سے یہ کہے، کہ تم میرے بندے بن جاؤ (پارہ ۳۔ آل عمران رکوع ۸)۔ الغرض یہ معنی کہنا کہ یا عبادی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لوگوں کو اپنا بندہ فرما رہے ہیں، قرآن کریم کے سراسر خلاف ہے۔ باقی حضرت عمرؓ کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ فرمانا کہ کنت عبدہ و خادمہ بصورتِ صحت حدیث اس سے خادم اور غلام مراد ہے کیونکہ قد کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فکنت عبداً وخادمه اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آپ کی زندگی میں تھا۔ ورنہ معیت اور کنت عبداً کی حاجت ہرگز نہ تھی۔ یوں فرماتے ہیں اب بھی آپ کا عبد اور بندہ ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی میں چونکہ حضرت عمرؓ نے ہر طرح آپ کی غلامی اور خدمت اختیار کی تھی، اس لئے انہوں نے یہ فرمایا۔ اس سے بندہ کا ترجمہ کرنا باطل ہے۔ رہا مولانا رومؒ وغیرہ کا ارشاد تو وہ خود قابل تاویل ہے اس پر فتویٰ کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جاسکتی۔ گزر چکا ہے کہ مفتی احمد یار خان صاحب بھی ایسے نام کو کراہتِ تنزیہی کی مد میں رکھتے ہیں مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ: ”ہاں اگر اس زمانہ میں دیوبندیوں و بابیوں کو چڑانے کے لئے یہ نام رکھے تو بہت باعثِ ثواب ہے“ بلفظہ (جہاں الحق ملا) مفتی صاحب کو عجیب و غریب محکمہ افتاء ہاتھ آیا ہے کہ جو چیز فی نفسہ مکروہ تنزیہی بھی ہو، مگر چونکہ دیوبندیوں، و بابیوں کو چڑانا کارِ ثواب ہے لہذا یہ نام باوجود مکروہ تنزیہی ہونے کے کارِ ثواب ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ! مفتی صاحب کا اپنا کوئی مذہب نہیں۔ ان کا مذہب تو دیوبندیوں و بابیوں کی مخالفت کرنا ہے، اگرچہ دیوبندی اپنے دعویٰ پر ٹھوس دلائل بھی رکھتے ہوں، اور مفتی صاحب کے پاس بغیر کاغذ کی کشتی کے اور کچھ بھی نہ ہو، مگر مخالفت ضرور کرنی ہے۔

رہتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

اس سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کو خوفِ خدا، فکرِ آخرت اور حق کی تلاش کا سرے سے خیال ہی نہیں، بلکہ صرف دیوبندیوں کی مخالفت سے ثواب کے منشا میں ہیں۔ شوق سے کیجئے مگر ایک وقت آنے والا ہے جس میں دودھ اور پانی اور کھوٹی سب حقیقت بن کر سامنے آجائے گی۔

باش کہ سما طبلِ قیامت زند

آن تو نیک آید و یا این ما

ابھی بہت کچھ بدعات قابلِ تردید باقی ہیں مگر کتاب کی طوالت کے خوف سے سُرست انہیں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ایک عاقل اور منصف مزاج کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ان پر ایک الگ کتاب لکھی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز

ایک حدیث شریف عرض کر کے ہم اس باب کو ختم کرتے ہیں۔
 امام عبدالرزاق، معمر سے اور وہ زید سے اور وہ حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں، وہ
 فرماتے ہیں کہ:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه	آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سنت کے
وسلم عمل قليل في سنة خير من	مطابق مقولہ اس عمل بھی اُس عمل کثیر سے بہتر
عمل كثير في بدعة ومن استن بي فهو	ہے جو بہت کے طور پر کیا جائے۔ اور نیز فرمایا کہ
معتق ومن دعب عن سنتي فليس	جس نے میری سنت پر عمل کیا وہ میرا ہے اور جس نے
معتق۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۱۱ ص ۲۹۱ طبع بیروت)	میری سنت سے اعراض کیا وہ میرا نہیں ہے۔



خاتمہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ اہل بدعت حضرات کے الزامی اعتراضات کے جوابات بھی بدیعہ قارئین کرام کو دیئے جائیں تاکہ بحث مکمل ہو جائے، اور مسئلہ زیرِ نظر کا یہ پہلو بھی تشنہ نہ رہے۔

پہلا اعتراض :

قرآن کریم کا کتابی صورت میں جمع کرنا، اس پر اعراب لگانا اور موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کو چھاپنا بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا ثبوت نہیں ہے۔

الجواب :

امام جلال الدین سیوطیؒ کہتے ہیں کہ :

وقد كان القرآن كتب كله في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم لكن غير مجموع في موضع واحد ولا مرتب السور (اتقان ۱۵۵)

قرآن کریم سب کا سب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں لکھا گیا تھا لیکن ایک جگہ میں نہ تھا۔ اور سورتوں میں ترتیب بھی نہ تھی۔

صحیح روایت یہ ہے کہ سورتوں میں ترتیب تھی جیسا کہ بیان ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

امام حارث محاسبیؒ کہتے ہیں کہ :

كتابة القرآن ليست بمحدثه فانه صلى الله عليه وسلم كان يامر بكتابه (ایضاً ۱۵۵)

قرآن کریم کی کتابت محدث اور بدعت نہیں ہے اسلئے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو لکھنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ہم مختلف رقعات سے قرآن کریم کو آپ کے سامنے جمع کرتے تھے

امام حاکم اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

فيه الدليل الواضح ان القرآن انما جمع في عهد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم (المستدرک ج ۱) تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جمع ہو چکا تھا۔

اور حضرت ابن بید النصارى کی یہ روایت کہ وقد اثبت في الكتاب (المستدرک ج ۱) قال الحاکم والذہبی صحیح) بھی اس کی تین دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کرنے پر رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔ اور بخاری وغیرہ کی یہ حدیث تو آخر مشہور ہی ہے کہ حضرت عمرؓ کے مشورہ سے حضرت ابو بکرؓ نے اپنے دور خلافت میں قرآن کریم جمع کرایا تھا (دیکھئے مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۹ وغیرہ) اور قرآن کریم کی یہ موجودہ ترتیب حضرت عثمانؓ نے دی ہے اور اسی بنا پر ان کو جامع القرآن کے لقب سے خطاب کیا جاتا ہے (دیکھئے آقان ج ۱ ص ۱ وغیرہ) مگر یہ یاد رہے کہ یہ ترتیب حضرت عثمانؓ کی خانہ زاد اور ایکاد بندہ نہ تھی بلکہ توفیقی تھی اور اس پر ان کے پاس ثبوت موجود تھا۔ چنانچہ امام ابن الحصار کہتے ہیں کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب اور اسی طرح آیات کی ترتیب وحی کے مطابق قائم کی گئی ہے۔ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ سورتوں کی یہی ترتیب اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوح محفوظ میں ہے، اور اسی موجودہ ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہر سال قرآن کریم حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پیش کیا کرتے تھے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ :

كان القرآن على عهد النبي صلى الله عليه وآله وسلم مرتباً يسيراً (آقان ج ۱) قرآن کریم کی سورتوں اور آیات کی یہی ترتیب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھی جو آج ہے۔

اور امام سیوطیؒ نیز یہ فرماتے ہیں کہ :

ترتيب الآيات في سورها واقع بتوقيفه صلى الله عليه وسلم وامر من غير خلاف في هذا بين المسلمين۔ (تفسير آقان ج ۱ ص ۱) آیات کی سورتوں میں جو ترتیب ہے وہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم سے اور آپؐ کی ترویض یعنی اطلاق دینے سے اس میں مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الغرض قرآن کریم کا کتابی شکل میں وجود خود حضرت رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد میں تھا، اور

حضرات خلفاء راشدینؓ نے سرکاری طور پر اس کو جمع کر کے رعایا میں اس کی نشر و اشاعت کی تھی اور اسکی جمع و ترتیب پر تمام حضرات صحابہ کرامؓ کا اتفاق تھا۔ چنانچہ شاطبیؒ لکھتے ہیں کہ :

فہذا عمل لم ینقل فیہ خلاف عن جمع قرآن کا یہ عمل ایسا ہے جس میں کسی ایک صحابی کا احد من الصحابةؓ۔ (الاعتصام ج ۲ ص ۲۸۸) اختلاف بھی منقول نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو مفتی احمد یار خان صاحب وغیرہ بدعت کہتے ہیں تو یہ مبارک کام انہیں کو نصیب ہو۔

ربا اعراب کا معاملہ، تو اس میں کافی اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق بن ندیم (المتوفی ۳۸۰ھ) اور قاضی شمس الدین احمد بن خلکان (المتوفی ۶۸۱ھ) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب حجاج بن یوسف (المتوفی ۱۹۵ھ) نے لگوائے تھے۔ علامہ ابن خلکانؒ کے بیان میں اس کا بھی اختلاف ہے کہ حجاج بن یوسف کے حکم سے اعراب کس نے لگایا؟ ایک قول یہ ہے کہ نصر بن عامر نے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یحییٰ بن یعمر نے۔ لیکن کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے قرآن کریم کا اعراب ابوالاسود دہلیؒ نے لگایا جو حضرت علیؓ کے شاگردِ رشید تھے (ماخوذ از حاشیہ الفلاح مضمون مولانا شبلیؒ المتوفی ۱۳۳۲ھ ص ۱۹ ذوالفقہ ۱۳۳۵ھ)

اور محدث ابن جوزی کتاب تلخیص ص ۴۲ میں اور حافظ ابن کثیر البیاری والنبیاء ج ۹ ص ۹ میں اور حافظ ابن حجرؒ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۱۱ میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اعراب سب سے پہلے یحییٰ بن یعمر (المتوفی ۳۵۸ھ) نے لگایا تھا۔ بہر کیف حضرات صحابہ کرامؓ کا دور تھا جس میں قرآن کریم پر اعراب لگایا گیا تھا۔ اگر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں بھی یہ سلیم کر لیا جائے تو بھی اس کی وفات کے بعد حضرت صحابہ کرامؓ کا دور باقی رہا ہے کیونکہ حضرت محمود بن لبیدؒ کی وفات ۱۶۱ھ میں اور حضرت محمود بن ربیعؒ کی ۱۹۹ھ میں اور حضرت ابوامامہ سہل بن حنیفؒ کی ۱۸۵ھ اور حضرت ہرماہ بن زیاد ہامیؒ کی ۱۸۸ھ میں اور حضرت ابوالفضلؒ کی ۱۸۸ھ میں وفات ہوئی ہے (دیکھئے علی الترتیب، تقریب ۳۲۸، تہذیب ج ۱ ص ۱۱۱، البیاری والنبیاء ج ۹ ص ۱۹، تہذیب ج ۱ ص ۲۸، تہذیب ج ۵ ص ۵۸)۔ اور پہلے اس کی پوری بحث گورچکیؒ کے کہ خیر القرون کا تعامل شرعی حجت ہے۔

لہٰذا ناب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں، نقطہ اور اعراب، ہر دو ہمراہ حروف موضوع شدہ اندر لیا کہ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اس کو بدعت کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے اور اس سے سرِ مؤخر تجاوز کرنا درست نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض : جمعہ کے خطبہ سے قبل تقریر کرنا بدعت ہے مگر تم بھی کہتے ہو۔

الجواب : جمعہ کے خطبہ سے پہلے تقریر کا متعدد حضرات صحابہ کرام سے ثبوت ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے تقریر فرمایا کرتے تھے، اور اس میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ جب امام خطبہ دینے کے لئے آتا تو حضرت ابو ہریرہؓ اپنی تقریر موقوف کر دیتے تھے۔ (مسند رک ۱۸ ج ۳ ص ۱۵۵ قال الحاکم والذہبی صحیح)۔

ابو الزاہرؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن بسر جمعہ کے دن خطبہ سے قبل وعظ کیا کرتے تھے جب خطیب خطبہ دینے کے لئے آتا تو وہ وعظ بند کر دیتے تھے (حاکم ج ۱ ص ۲۸۸ وقال الذہبی صحیح)۔

حضرت تمیم دارمیؒ نے حضرت عمر فاروقؓ سے اجازت طلب کی کہ میں جمعہ کے دن تقریر کیا کروں گا۔ اور اس میں متعدد نصیحت آمیز واقعات بیان کروں گا۔ پہلے حضرت عمرؓ نے انکار فرمایا لیکن حضرت تمیم دارمیؒ کے اصرار پر انہوں نے اجازت دے دی کہ تم جمعہ کے دن اس سے قبل کہ میں خطبہ کے لئے آؤں، تقریر کر سکتے ہو۔ (اصابہ فی تذکرۃ الصحابہ ج ۱ ص ۱۸۵)۔

تیسرا اعتراض : آپ کے زمانہ مبارک میں مسجدوں میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ لہذا مسجدوں میں روشنی کا انتظام کرنا بھی بدعت ہے حالانکہ تہامی مساجد میں بھی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔

الجواب : امام ابو داؤد نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، باب الترویج فی المساجد اور اس کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم بیت المقدس نماز کے لئے نہیں جاسکتے تو :

فاعثوا بزیت۔ یسر ج فی قنادیلہ۔ تم زیتون کا تیل بیچ دو تاکہ بیت المقدس کی قندیلوں (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۶۱) میں روشن کیا جاسکے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بیت المقدس میں چراغ جلانے کے لئے تیل بیچنے کا حکم دیا ہے۔ ہاں

(بقیہ حاشیہ نمبر گذشتہ) عاری ہونِ حروف از نقطہ انجام باوجود تشابہ صدیکہ ریختہ تاجین نقط مصحف بیہست (اکسیر ص ۷۵)۔

البتہ مسجد نبوی وغیرہ میں آپ کے زمانہ مبارک میں روشنی کا انتظام نہ تھا۔ حضرت تمیم دارمی نے سب سے پہلے مسجد میں چراغ جلایا اور روشنی کا انتظام کیا۔ (ابن ماجہ ملہ و تہذیب ج ۱ ص ۵۸۵)۔
مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی اجازت سے حضرت تمیم دارمی نے مسجد میں چراغ جلانے۔
(الفاروق ج ۲ ص ۱۴۲)۔

فتوح البلدان ص ۱۱۱ اور الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۵۵ اور مرآۃ المحرمین ج ۱ ص ۲۳۵ لابرہیم
رفت باشا میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حرم محترم کے گرد دیوار کھنچوائی اور اس سے یہ کام لیا کہ اس پر رات
کو چراغ جلانے جاتے تھے۔

فائدہ : مسجد میں جتنی روشنی کی ضرورت ہے اُس سے زیادہ چراغ روشن کرنے حرام ہے چنانچہ
ابو حنیفہ ثانی علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں کہ :

ولا يجوز ان يزاد على سراج المسجد
لان ذلك اسراف سواء كان ذلك في
رمضان او غيره الى ان قال وفي الفتية
واسراج السراج الكثيرة في السكك و
والاسواق ليلة البأأة بدعة وكذا
في المساجد۔ البحر الرائق ج ۵ ص ۲۱۵)۔
مسجد میں ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے جائز نہیں
ہیں کیونکہ یہ اسراف ہے، رمضان میں ہو یا غیر رمضان
میں۔ پھر فرمایا کہ قفہ میں ہے کہ شب برات میں کپڑوں
اور باناروں میں بہت سے چراغ جلانا بدعت ہے اور
اسی طرح مسجدوں میں بھی ضرورت سے زیادہ چراغ
جلانا بدعت ہے۔

حضرت فقہاء احناف کا تو یہ قول ہے۔ مگر چودھویں صدی کے مفتی جو بزم خود خفیت کے ٹھیکیدار
بنے پھرتے ہیں یہ ارشاد فرماتے ہیں : پنجاب اور یوپی و کاٹھیاوار میں عام رواج ہے کہ رمضان میں ختم
قرآن تلاوت کی شب میں مساجد میں چراغاں کیا جاتا ہے بعض دیوبندی اس کو بھی شرک و حرام کہتے ہیں
یہ محض اُن کی بے دینی ہے مساجد کی زینت ایمان کی علامت ہے۔ (ملفوظ ج ۱ ص ۲۹۵)۔

مفتی صاحب ہی فرماتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ چراغ جلانے کو دیوبندی ہی منع کرتے ہیں یا علامہ
ابن نجیم حنفی وغیرہ بھی ان کے ہم نوا ہیں، اور کیا یہ بے دینی صرف دیوبندیوں کے حصہ میں آئے گی یا علامہ

ابھی تک وغیرہ احناف کو بھی اس بے دینی سے کوئی حصہ ملے گا؟ بتینوا تو جروا۔ یہ یاد رہے کہ کسی یونہی نے ضرورت سے زمانہ چراغ جلائے کو شرک تو نہیں کہا البتہ فقہار کرام کی پیروی میں بدعت ضرور کہتے ہیں۔ اور بدعت کا ارتکاب بھی ممنوع و حرام ہوتا ہے۔

لطیفہ: مفتی احمد یار خان صاحب نے اپنی معتبر و مستند تفسیر روح البیان شریف سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کے مینارہ پر ایسی روشنی کی مٹی کہ بارہ میل پہنچے میں گزریں اس کی روشنی میں چرخہ کاشی تھیں انہو (بلغتہ جارا الحق ص ۲۹)۔

چوتھا اعتراض:

مسجدوں میں فرش اور چٹائی کا انتظام بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے زمانہ مبارک میں ایسا نہیں ہوا اور تم لوگ بھی اس کا اہتمام کرتے ہو۔

الجواب:

یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مسجدوں میں چٹائی وغیرہ کا انتظام نہ تھا (دیکھئے میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱ وغیرہ) لیکن یہ انتظام حضرت عمرؓ کے عہد میں مکمل ہوا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ:

”فرش کا انتظام بھی اول حضرت عمرؓ ہی نے کیا لیکن یہ کوئی پریمکاف قالین اور شطرنجی کا فرش نہ تھا بلکہ اسلام۔ سادگی یہاں بھی قائم تھی یعنی چٹائی کا فرش تھا جس سے مقصود یہ تھا کہ نمازیوں کے کپڑے گرد و خاک میں آلودہ نہ ہوں۔“ (الفاروق ج ۲ ص ۱۳۲)

فائدہ: مسجد میں سب سے پہلے خوشبو جلائے کا باقاعدہ انتظام بھی حضرت عمرؓ نے کیا (خلاصۃ الوفا، ص ۱۸۱)۔ اور مسجد میں سب سے پہلے پڑنے حضرت عثمانؓ نے نصب کئے تھے (مرآۃ المؤمنین ج ۱ ص ۲۱۲)۔

پانچواں اعتراض:

مسجدوں میں محراب بھی بدعت ہے کیونکہ آپ کے پاک زمانہ میں محراب نہ تھی اور تمہاری مسجدوں میں بھی محراب کا وجود ہوتا ہے۔

الجواب :

امام نووی شرح مہذب ج ۳ ص ۲۸۰ میں اور علامہ سمہودی وفاء الوفا ج ۱ ص ۱۸۱ میں لکھتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وقت میں مسجد میں محراب کا وجود نہ تھا لیکن علامہ بدرالدین عینی الخنفی عمدة القاری ج ۲ ص ۲۹۹ میں لکھتے ہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگر کعبہ کی جہت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے محراب بنائی تھی۔ اور علامہ مقریزی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گو محراب کا کچھ نقشہ پہلے تھا مگر محراب مجوف (جوف دارطاق کی شکل میں جیسا کہ آج کل عموماً مسجدوں میں ہوا ج ہے) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنوائی تھی۔ یہی علامہ مقریزی لکھتے ہیں کہ :-

فاما محاریب الصحابة التي بفسطاط مصر والاسكندرية فان سميتها يقابل مشرق الشتاء - (مقریزی ج ۲ ص ۲۵۷) -
مصر اور اسکندریہ کے دیہات میں محرابوں کے کلام نے جو محراب بنائے، ان کا رخ اس طرف ہے جہاں سے موسم سرما میں سورج طلوع ہوتا ہے۔

اور امام قاضی خان الخنفی لکھتے ہیں کہ :
والمحاريب التي نصبتها الصحابة والتابعون الخ (ج ۱ ص ۳۱) -
وہ محراب جو حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعینؓ نے بنائے ہیں (ان کو اسی حالت میں رہتے دو)۔

الحاصل علامہ عینی کی تحقیق کے موافق محرابیں آپ کے عہد مبارک میں موجود تھیں اور دوسرے محققین کی تحقیق کی رُو سے حضرت صحابہ کرامؓ اور تابعین کے پاک ہاتھوں نے محراب بنائے تھے۔

چھٹا اعتراض :

آپ کے زمانہ میں مسجدوں میں مینار نہیں ہوتے تھے، اس لئے یہ بدعت ہیں حالانکہ قہاری مساجد میں بھی مینار ہوتے ہیں۔

الجواب :

مینار اصل میں اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ ان پر اذان ہو اور دُور تک لوگ اذان کی آواز سُنیں۔

بڑے بڑے شہروں میں ایک سے زیادہ میناروں پر بیک وقت اذانیں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ امام ابو داؤد نے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ باب الاذان فوق المنارة (ج ۱ ص ۱۷۱)۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ (المتوفی ۶۵ھ) وغیرہ فرماتے ہیں کہ:

من السنة الاذان في المنارة والاقامة سنت يربى به اذان مناره پر دی جائے اور اقامت فی المسجد۔ (الزیلعی ج ۱ ص ۲۹۳ و مصنف ابن ابی شیبہؒ ج ۲ ص ۱۲۳) مسجد میں ہو۔

اصولی حدیث کا مسئلہ ہے کہ مطلق سنت سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سنت مراد ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام ج ۲ ص ۱۲۱ میں بحوالہ اصابہ لکھا ہے کہ مصر کی مسجدوں میں مینار کا رواج نہ تھا حضرت مسلمہ بن خالد انصاری (المتوفی ۸۵ھ) نے تمام مسجدوں میں مینار بنوائے۔ قاضی شوکانی (المتوفی ۱۲۵۵ھ) فرماتے ہیں کہ مساجد میں مینار قائم کرنے کی اصل غرض تو یہ ہے کہ دُور کے آدمی اذان سُن سکیں، اور یہ ایک جائز مصلحت ہے الخ۔ (ارشاد المسائل الی دلیل المسائل۔ بحوالہ نقطۃ العجلان ملک نواب صدیق حسن خانؒ)۔

ساتواں اعتراض :

تمہارے مدارس میں جمعہ کے دن چھٹی ہوتی ہے، یہ بھی بدعت ہے۔

الجواب :

نماز جمعہ کے لئے خاص اہتمام کرنا قرآن سے ثابت ہے اور پھر جمعہ کے دن نئے یا دھلے ہونے پر پڑے پہننا اور غسل و مسواک کرنا، پھر سب سے پہلے مسجد میں جا کر میٹھا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس لئے اگر مالایقہ الواجب الاجبہ فهو واجب کے قاعدہ کے تحت جمعہ کی چھٹی کی جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ علاوہ ازیں عقد القرین ج ۱ ص ۱۴۱ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے فوج کو یہ حکم تھا کہ وہ ہمیشہ جمعہ کے دن مقام کرے اور پورے ایک شب و روز قیام رکھے، تاکہ لوگ دم لیں اور ہتھیاروں اور کپڑوں کو درست کر لیں۔

فائدہ : اسی طرح رمضان المبارک میں مخصوص عبادت دیگر بیشمار شغل سے فارغ ہو کر بی

صحیح طور پر ادا کی جاسکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر اسلامی مدارس میں ماہِ رمضان کی تعطیلات سہولتوں پر ہیں تاکہ طلباء کرام اپنے گھروں میں جا کر خاطر خواہ آرام کر سکیں اور روزے و تراویح اور احتکاف وغیرہ کے لئے ان کو فراغت مل سکے۔ برآمدی اس عبادت کو بھی بغیر تعطیل اور مکمل چھٹی کے ادا نہیں کر سکتا۔

کمالہ یخفی۔

اٹھواں اعتراض :

مدارس کا قیام بدعت ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدرسے نہ تھے حالانکہ سب سے زیادہ مدرسے اور مدرس اور طلبہ تہارنی ہی جماعت کے ہوتے ہیں لہذا تم بھی بدعتی ہوئے۔

الجواب :

فریقِ مخالف کا یہ استدلال بھی نہایت ہی لچر اور کمزور ہے۔ کیونکہ علم دین کی نشر و اشاعت جس طرح بھی ہو سکے اور جیسے بھی اور جہاں بھی ہو، یہ خود شریعتِ حقہ کا منشا ہے۔ اس کے لئے جو صورت بھی اختیار کی جائے، درست اور صحیح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اصحابِ حقہ کیلئے (جو دروازے مقامات سے طلب علم کیلئے حاضر ہوتے تھے) اسی لئے مسجد کے علاوہ اس کے قریب ہی صفہ بنوایا تھا تاکہ طلبہ کے لئے سہولت رہے، اور ان کو کوئی وقت پیش نہ آئے۔ امام ابو اسحاق غزناطی لکھتے ہیں کہ :

واما المدارس فلم یعلق بها امر تعبدي
یقال فی مثله بدعة الاعلى فرض ان یکون
من السنة ان لا یقرا العلم الا بالمساجد
وهذا لا یوجد بل العلم کان فی الزمان الاول
یبت بکل مکان من مسجد او منزل او سفر
او حضر او غیر ذلک حتی فی الاسواق فاذا اعلی
احد من الناس مدرسته یعنی باعدادها الطلبة
فلا ینزید ذلک علی اعداد اوله منزلا من منازلہ

بہر حال مدارس تو ان کے ساتھ امرِ تعبدی متعلق نہیں ہے۔
تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ بدعت ہیں۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے
کہ سنت صرف یہ ہے کہ علم فقط مسجدوں میں پڑھا جائے تو
انگ بات ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ علم تو زمانہِ اول میں
بھی ہر جگہ پھیلا یا جاتا تھا۔ مسجد میں بھی اور گھر میں
بھی، سفر میں بھی اور حضر وغیرہ میں بھی حتیٰ کہ بازاروں میں بھی
علم کی اشاعت ہوتی رہی۔ تو اگر کوئی شخص مدرسہ بناوے اور
مقصد یہ ہو کہ طلبہ کو آرام دے تو اس نے منزل اور دیوار

اوحائطا من حوائطہ او غیر ذلک فاین مدخل وغیرہ کے علاوہ اور کیا زیادہ کیا ہے؟ تو اس میں بدعت البدعة ہاھنا؟ (الانصاف ج ۱ ص ۱۷۱)۔
کا دخل ہی کیا ہے؟ (محصلاً)

نواں اعتراض :

مدارس میں دورہ حدیث وغیرہ کا نصاب مقرر کرنا اور امتحان لینا بھی بدعت ہے۔

الجواب :

اہل عرب اور حضرات صحابہ کرام کی مادری زبان ہی عربی تھی۔ وہ صرف دُخو اور دیگر مبادی علوم کے حاصل کرنے کے بغیر بھی قرآن کریم اور حدیث شریف کو سمجھ سکتے تھے۔ بخلاف عجمی لوگوں کے کہ ان کے لئے قرآن و حدیث وغیرہ تک اُس وقت تک ہرگز رسائی نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ مبادی حاصل نہ کر لیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر خلیفہ راشد حضرت علیؑ نے ابوالاسود دہلی کو یہ امر ارشاد فرمایا کہ وہ اس طریق کا ایک علم ضبط کرے جس سے فہم قرآن میں مدد ملے اور غلطی واقع نہ ہو (دیکھئے متن متین ص ۳۱ و اقتراح للسیوطی ص ۱۷۱ و البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۳۱۱ وغیرہ)۔ اس لئے اگر طلبہ کے لئے قرآن و حدیث کے صحیح طور پر حاصل کرنے کے لئے کوئی نصاب حضرات سلف صالحینؓ نے تجویز کیا ہے تو صحیح ہے اور مالِ یتیم الواجب الا بہ فهو واجب کے قاعدہ کے تحت مبادی کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہاں امتحان کا سوال تو یہ بھی ہرگز بدعت نہیں ہے۔ امام بخاریؒ نے صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۱ میں ایک مستقل باب یوں قائم کیا ہے :

باب طرح الامام المسئلۃ علی اصحابہ باب امام کا اپنے سنا قبول پر کوئی ایسا سوال وارد لیختبر ما عندہم من العلم۔ کہ ناجس سے اُن کے علم کا امتحان ہو سکے۔

پھر اس کے نیچے یہ روایت پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے حضرات صحابہ کرامؓ سے یہ سوال کیا کہ ایسا درخت بتاؤ جس کے پتے نہیں جھڑتے وہ مسلم کی مثال ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے علم کے مطابق جنگل کے درخت گنوا دیئے۔ مگر صحیح جواب سوائے حضرت ابن عمرؓ کے اور کسی کو نہ سوجھا۔ لیکن حضرت ابن عمرؓ بھی کم سن ہونے کی وجہ سے خاموش رہے۔ پھر آپؐ نے خود بتایا کہ

وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد نظیریں کتبِ احادیث میں امتحان کی موجود ہیں۔

دسواں اعتراض :

احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بدعت ہے۔

اجواب :

خود جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حدیثیں لکھی جاتی تھیں حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو معلوم نہیں۔ مگر ہاں عبداللہ بن عمروؓ کو، کیونکہ وہ لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا (بخاری ج ۱ ص ۲۲ وغیرہ)۔ حضرت ابوہریرہؓ کی کل احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوبتر ہے اور تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ صحیفہ ابوہریرہؓ کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ طبع ہوا ہے جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے کتابی شکل میں جمع کیا تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے صحیفہ کا نام صادقہ کتب تاریخ میں آتا ہے۔ الغرض یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حدیثیں نہیں لکھی جاتی تھیں اور کتابی شکل میں جمع نہ ہوتی تھیں، ایک سراسر بہتان ہے۔ اس پر منکرینِ حدیث کے رد میں ناچیز کی کتاب ”شوقِ حدیث“ کا مطالعہ کریں۔ اس کے مطالعہ کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کے اہم گوشے حل ہو جائیں گے اور منکرینِ حدیث اور ان کے ہم نوا ایسے پا ہو جائیں گے و ذلک بمنہ و توفیقہ تعالیٰ صدق من قائل و آمنا ببعثہ ربک فحدیث، ورنہ من انعم کہ من دانم۔

گیارہواں اعتراض :

تنخواہ لے کر پڑھانا اور ختم بخاری کرنا بدعت ہے۔

اجواب :

پہلے پورے تفصیل درج کی جا چکی ہے کہ اگرچہ بعض حضرات متقدمین کا اس میں کچھ اختلاف تھا۔ مگر متاخرین نے (جن میں صاحبِ بابۃ ۳؎ بھی ہیں اور فرماتے ہیں وعلیہ الفتویٰ اور امام

قاضی خانؒ بھی جواز کا فتویٰ نقل کرتے ہیں (ج ۴ ص ۹۷)۔ اور امام سرخسیؒ بھی ہیں اور فرماتے ہیں نفی بالجواز (بحوالہ البانی ج ۲ ص ۱۵۵) جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ اور محررات وغیرہ کا حوالہ پچھلے گزرجا ہے اور حضرات خلفاء راشدینؓ خود بھی نماز و خطبہ اور قضا وغیرہ پر بیت المال سے روزینہ دیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہ باقاعدہ سرکاری طور پر آمد اور مدرسین اور مؤذنین کیلئے تنخواہیں مقرر کی تھیں۔ تفصیل گزر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ باقی بیماری اور مصیبت وغیرہ کے وقت قرآن کریم اور بخاری شریف کا پڑھ کر اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ انخدریؓ کی روایت اور حضرت فقہاء کرامؒ کی عبارتیں پہلے عرض کی جا چکی ہیں علامہ بدرالدین عینی حنفیؒ لکھتے ہیں یعنی کہ:

والرقیۃ نوع مداواة والمأخوذ علیہا جعل و سجاڑ پھونک علاج کی ایک قسم ہے۔ اُس پر اجرت المداواة مباح اخذ الانحور علیہا (البانی ج ۳ ص ۱۵۴) لینا جائز ہے۔

حضرات! فریقِ مخالف کے اعتراضات اور بھی کافی ہیں۔ مگر ہم نے چند ایک بطور نمونہ از خود آپ کے سامنے عرض کر دیئے ہیں۔ ایک عقل مند کے لئے ان میں کافی عبرت موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مولوی محمد عمر صاحب وغیرہ اس عدد سے اپنی گیارہویں ثابت کرنا شروع کر دیں۔ رَأَيْتُ لِحَدِّ عَشْرٍ كُوكِبًا۔ یہ اعتراضات جو پیش کئے گئے ہیں محض حوام ہی کے نہیں بلکہ فریقِ مخالف کے بڑے بڑے محقق یہ اعتراضات اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ مفتی احمد یار خان صاحب لکھتے ہیں کہ: ”کیونکہ دیوبند کا مدرسہ وہاں کا نصاب، دورہ حدیث شریف، تنخواہ لے کر مدرسوں کا پڑھانا، امتحان اور تعطیلات کا ہونا، آج قرآن پاک میں اعراب لگانا، قرآن و بخاری چھاپنا، مصیبت کے وقت تم بخاری کرنا جیسا کہ دیوبند میں پندرہ روپے لے کر کیا جاتا ہے (یہ مفتی صاحب کا مفتیانہ اجتہاد ہے۔ ورنہ راقم الحروف بحمد اللہ تعالیٰ دیوبند کا خوشہ چہیں ہے، وہاں پندرہ روپے کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ حسن اتفاق کا معاملہ ہی جدا ملے نواب صاحب لکھتے ہیں کہ ”ختم ایس کتاب مبارک برائے شہ اسی بیمار و عیون از ناول و حوادث زمانہ جاریست زیرا کہ در حکم رقیہ است و جواز رُطبی با حدیث ثابت بشرطیکہ درال چیزے از شرک نباشد و در صحیح بخاری شرک از اشراک نیست اه (ہدایۃ السائل ص ۳۷)

ہے اور بغیر اُحوت سے ہی ہم نے بار بار دواں ختم کیا ہے۔) بلکہ سارا فین حدیث بلکہ خود احادیث کو کتابی شکل میں جمع کرنا بلکہ خود قرآن کا غلط پڑھنا، اس میں رکوع بنانا، اس کے تیس سیپارے کرنا وغیرہ وغیرہ سب ہی دینی کام ہیں اور بدعت ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ان میں سے کوئی کام نہ ہوا۔ بولویہ حرام میں یا حلال؟ (بلفظ جابر الحق ص ۲۱۱)۔ ان اعتراضات کے جوابات عرض کر دیئے گئے ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

آخر میں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت امام الانبیار سید الرسل خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمد مقبلی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ یہی پہلو ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو سکتی ہے اور معصیت کے راستہ سے برگز اس کو راضی نہیں کیا جاسکتا۔ (لما جاء فی الحدیث ان اللہ لا ینال فضله بمعصیۃ - مستدرک ج ۲ ص ۴)۔ اور جس پہلو کو جناب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ترک کر کے اُمت کو بتایا ہے، ہمارے لئے بھی اس کا ترک کرنا ہی سنت ہوگا اور صرف اسی پہلو کو لینا اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلیل ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے :

ان اللہ یحب ان یؤخذ بذخسته کما یکو ان تحقیق سے اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ اسکی خصلتوں توئی بمعصیۃ رواہ احمد وابن خزیمۃ فی صحیحہ پرمعمل کیا جائے جیسا کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس (بتاوی ابن تیمیہ ص ۱۵۷) کی نافرمانی کی جائے۔

یہ روایت مسند احمد ص ۱۴۱ اور موارد الظمان ص ۲۲۸ اور ۱۴۵ و درمنثور ج ۱ ص ۱۹۳ میں حضرت ابن عمرؓ سے

اور ۲۲۸ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہمیں حضرات صحابہ کرامؓ کی بے تکلف زندگی کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے حضرت ملا علی قاریؒ نے حدیث اقلیاء تکلفا کی شرح میں ان کی سادہ زندگی کا نقشہ کھینچ کر بتایا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ ذکر اور درود شریف مسجدوں یا گھروں میں حلقہ بنا کر بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے۔ وہ اپنے اجسام کے لحاظ سے فرشتی تھے لیکن اپنے ارواح کے اعتبار سے عرشی تھے۔ ظاہری طور پر تو وہ مخلوق کے ساتھ تھے مگر باطن کے رُوسے مخلوق سے جدا ہو کر حق تعالیٰ کے ساتھ تھے (مفتاح ص ۱۱۱)

اور شاہی کہتے ہیں :

واما ارتفاع الاصوات في المساجد فناشی عن یعنی مسجدوں میں آواز بلند کرنا، تو یہ دین کے اندر جھگڑا بدعتہ الجہال فی الدین (الاعتصام ج ۲ ص ۲۵۱)۔ کہنے کے لئے بہت گھڑی گئی ہے۔

اے مالک! توبہ نیاز ہے۔ تو اس حقیر کی ظاہری اور باطنی لغزشوں کو معاف کر دے۔ تیرے بغیر کون معاف کر سکتا ہے؟ اے خالق! تو جہانی اور رُوحانی بیماری سے نجات دے، تیرے بغیر کون ہے جس کے آگے ہم ہاتھ پھیلاتیں؟ تیرے دروازہ کو چھو کر اور کہاں جائیں تو ہی کار سازی فرما! اے

دینا ہے اپنے ہاتھ سے اے بے نیاز دے

کیوں مانگتا پھرے ترا سائل جیگہ جگہ

وَضَلَّى اللهُ تَعَالَى عَلَى سَيِّدِنَا صَاحِبِ لُؤَاءِ الْفَخْرِ مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَ
أَصْحَابِهِ وَأَزْوَاجِهِ وَجَمِيعٍ مَنِ تَبِعَهُ إِلَى يَوْمِ الدِّينِ، آمِينَ يَا رَبِّ الْعَالَمِينَ!
احقر الصباد

ابوالنزاہد محمد سرفران خان صفدر خطیب جامع گلٹر
و مدرس مدرسہ علوم جامع مسجد نور۔ متصل گھنٹہ گھر، گوبراوالہ
(الحنفی مذہب و الحسینی مشعل)

۲۶ ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ، ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء

یوم الخمیس بوقت عصر۔ گلٹر۔

بخاری شریف

غیر مقلدین کی نظر میں

علامہ ابن القسیم الجوزیؒ کی مشہور کتاب
— حادی الأرواح إلى بلاد الأفراح کا اردو ترجمہ —

جنت کے نظارے

مترجمہ: حافظ عبدالعزیز دوس خاں قادری مدس مدرسہ اعلیٰ العلوم گوہر انوار

- یہ کتاب ہے جس میں علامہ ابن القسیمؒ نے جنت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں قرآنی آیات اور بیہمار احادیث پر مشتمل علمی وغیرہ جمع فرمایا ہے۔
- اس کتاب کے اقتباسات علماء کرام اور تبلیغ سے وابستہ حضرات کی پیش کرتے رہتے ہیں جن سے جنت کی قدر و بے دامغ میں سما جاتی ہے۔
- اس کتاب کے مطالعہ سے جنت حاصل کرنے کا شوق اور ہمت سے بچنے کا فطری شعور بڑھا کر جاتا ہے۔
- یہ کتاب دنیا کی مادی اور فانی نعمتوں میں مہلک لوگوں کو اصل اور غیر فانی نعمتیں یاد دلانے کا بہترین ذریعہ ہے۔
- قرآنی آیات اور کثر احادیث کا اصل متن اور نمایاں ترجمہ اور وضاحت طلب عبارات کی کربجھ میں مختصر شرح۔
- اصل کتاب کی عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کی عبارت میں تسلسل۔
- اصل کتاب میں دیئے گئے حدیث کی کتابوں کے کثیر قبیدہ صفحات حوالہ جات۔

